ISSN : 2582-1229

تاریخِ ادبِ اردو (سہ ماہی)

جلد۔۲ شمارہ۔۱
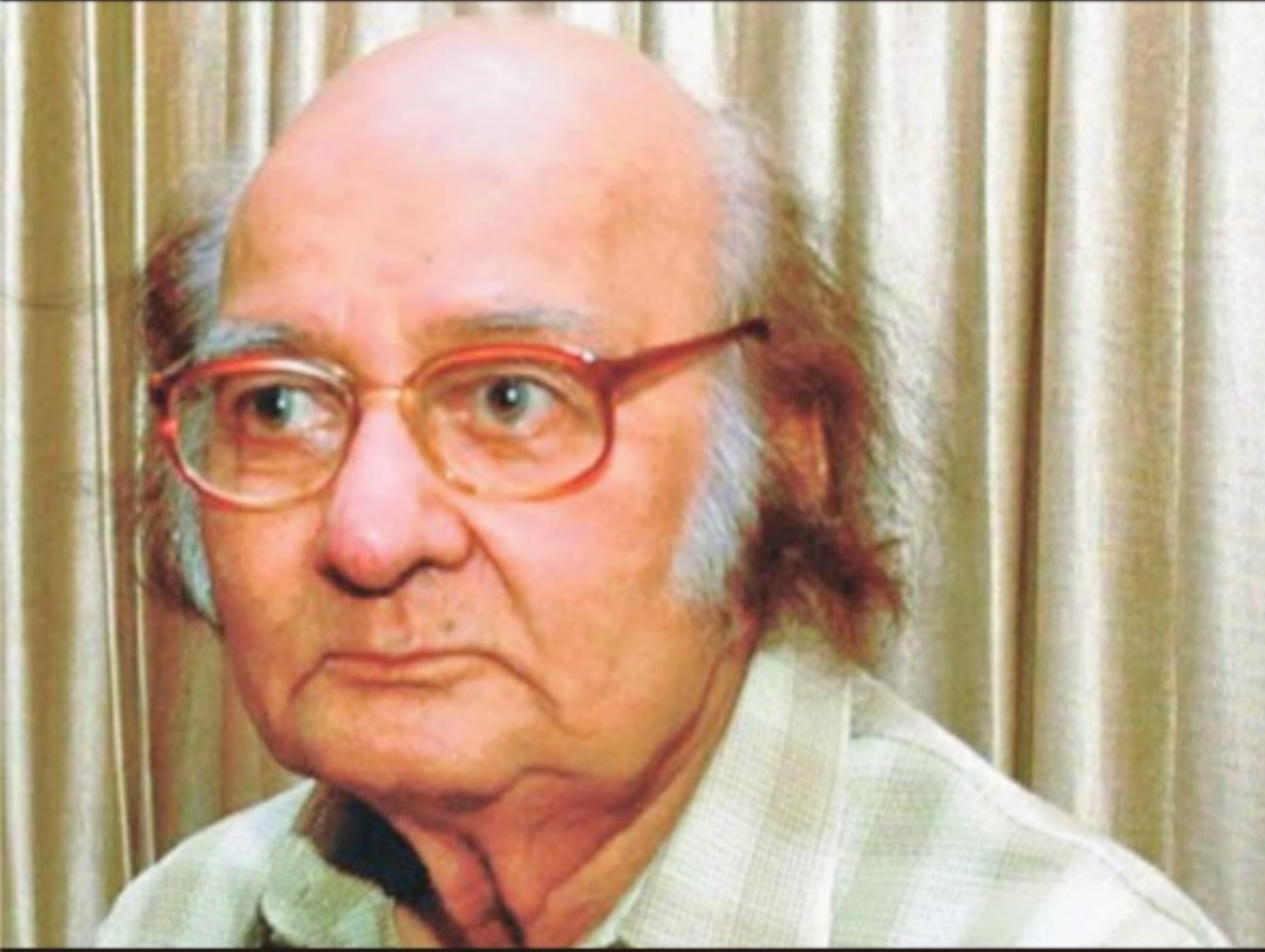
سرپرستِ اعلیٰ: ارتضیٰ کریم

مدیر: ڈاکٹر محمد یحیٰ صبا

تاریخِ ادبِ اردو

سرپرستِ اعلیٰ: ارتضیٰ کریم

مدیر: ڈاکٹر محمد یحیٰ صبا

(Quarterly) ISSN : 2582-1229

TAREEKH E ADAB E URDU

Vol. No. 2 January - March 2020 Issue No. 1

Editor : Dr. Md. Yahya

Published & Printed by Dr. Md Yahya, On The Behalf Of Dr. Md Yahya
2496/2, Punjabi Basti, Subzi Mandi, Ghanta Ghar, Delhi - 110007, Printed at
J.k. Offset Printing Press, 315 Gali Garahya, Jama Masjid, Delhi - 110006, Editor - Dr. Md Yahya

Price : 200/-

سہ ماہی　　دھلی

تاریخِ ادبِ اردو

جلد :۲　(اردو ادب کا نقیب اور ترجمان)　**شمارہ**:۱

جنوری تا مارچ ۲۰۲۰ء

بین الاقوامی پیر ریویو، ریفریڈ جرنل ISSN:2582-1229

ازتعاون

فی شمارہ	اس شمارے کی قیمت	سالانہ	خصوصی
25	200	1000	5000

رابطہ سہ ماہی ''تاریخِ ادب اردو''

2496,2nd Floor, Punjabi Basti, Subzi Mandi, Ghanta Ghar

Delhi-07

Email : taudelhi@yahoo.com,

A/c Name: PEACE INDIA FOUNDATION

A/c No: 51521131001918

IFSC: ORBC0105152

Mobile No. : +91-9968244001, +91-9718048854

مالک، طابع وناشر ڈاکٹر محمد یحیٰ صبا نے J.K Offset Printing press, سے چھپوا کر دفتر ''تاریخِ ادب اردو'' 2496nd Floor,Punjabi Basti, Subzi Mandi,Ghanta Ghar Delhi-7 سے شائع کیا۔

''تاریخِ ادب اردو'' کی مشمولات سے مدیر/وابستگان کا متفق ہونا لازمی نہیں۔ ''تاریخِ ادب اردو'' سے متعلق کسی بھی تنازعہ کا حقِ سماعت صرف دہلی کی عدالت میں ہوگا۔

مشمولات

اداریہ:

مضامین:

دیگر مضامین:

اداریہ

سہ ماہی '' تاریخ ادب اردو '' کا خصوصی شمارہ 'جمیل جالبی نمبر' قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے بڑی مسرت وشادمانی ہورہی ہے۔ یہ خصوصی شمارہ بڑی عرق ریزی اور جانفشانی کے بعد قارئین کے حضور ہے۔ کیونکہ جتنی عظیم شخصیت ہوتی ہے اتنی ہی بڑی ذمہ داری اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا ہوتا ہے۔

جمیل جالبی کی حیثیت ایک انجمن کی ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو ادب کے لیے وقف کر دیا تھا۔ انہوں نے ادب کے تمام پہلوؤں پر خامہ فرسائی کی ہے۔ جالبی صاحب کی سب سے پہلی تخلیق 'سکندر اور ڈاکو' تھی جو انہوں نے بارہ سال کی عمر میں تحریر کی اور یہ کہانی بطور ڈراما اسکول میں اسٹیج کیا گیا۔ جالبی صاحب کی تحریریں دہلی کے رسائل 'بنات' اور 'عصمت' میں شائع ہوتی رہیں۔ ان کی شائع ہونے والی سب سے پہلی کتاب 'جانورستان' تھی جو جارج آرول کے ناول کا ترجمہ تھا۔ ان کی ایک اہم کتاب 'پاکستانی کلچر: قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ' ہے جس کے آٹھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور مشہور تصنیف 'تاریخ ادب اردو' ہے جس کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی دیگر تصانیف وتالیفات میں تنقید وتجربہ، نئی تنقید، ادب کلچر اور مسائل، محمد تقی میر، معاصر ادب، قومی زبان یک جہتی نفاذ اور مسائل، قلندر بخش جرأت لکھنوی تہذیب کا نمائندہ شاعر، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، دیوان حسن شوقی، دیوان نصرتی وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ قدیم اردو کی لغت، فرہنگ اصلاحات جامعہ عثمانیہ اور پاکستانی کلچر کی تشکیل بھی ان کی اہم تصنیفات ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے متعدد انگریزی کتابوں کے تراجم بھی کیے جن میں جانورستان، ایلیٹ کے مضامین، ارسطو سے ایلیٹ تک شامل ہیں۔ بچوں کے لیے ان کی قابل ذکر کتابیں حیرت ناک کہانیاں اور خوجی ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد 1947ء میں ڈاکٹر جمیل جالبی اور ان کے بھائی عقیل پاکستان چلے گئے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہاں ان کے والد صاحب ہندوستان سے دونوں بھائیوں کے تعلیمی اخراجات کے لیے رقم بھیجتے رہے۔ بعد ازاں جمیل جالبی کو بہادر یار جنگ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹری کی پیش کش ہوئی جسے انہوں نے قبول کرلیا۔ جمیل صاحب نے ملازمت کے دوران ہی ایم اے اور ایل ایل بی کے امتحانات پاس کر لیے۔ اس کے بعد 1972ء میں سندھ یونیورسٹی سے ڈاکٹر غلام مصطفی خان کی نگرانی میں قدیم اُردو ادب پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی اور 1978ء میں مثنوی کدم راؤ پدم راؤ پر ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ بعد ازاں سی ایس ایس کے امتحان

میں شریک ہوئے اور کامیاب ہو گئے۔اس کے بعد انہوں نے اپنے والدین کو بھی پاکستان بلا لیا۔ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد با قاعدہ طور پر ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہوئے۔قبل ازیں انہوں نے ماہنامہ 'ساقی' میں معاون مدیر کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔اس کے علاوہ انہوں نے اپنا ایک سہ ماہی رسالہ نیا دور بھی جاری کیا۔

محقق ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر جمیل جالبی کے فن وشخصیت کے بارے میں کہتے ہیں، ''ڈاکٹر جمیل جالبی ایک منکسر المزاج عالم ہیں جن کی زندگی نئی نسل کے لیے قابل تقلید ہے اور جن کے ادبی کارنامے اردو کا بیش بہا خزانہ ہیں۔'' ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے مطابق، ''...اور اب میری مستقل رائے ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب، حالی سے لے کر آج تک کے تمام اردو تنقید نگاروں میں سب سے زیادہ اہم ہیں۔''

الغرض، اردو ادب پر جمیل جالبی کے احسانات ناقابل فراموش ہیں۔'تاریخ ادب اردو' ان کی لازوال تصنیف ہے، جس کا مطالعہ ادب کے طلبا اور اساتذہ کے لیے ناگزیر ہے۔

زیر نظر شمارہ میں کل پندرہ مضامین شامل ہیں جو تحقیق پر مبنی ہیں۔ان میں سے بیشتر مضامین ان ادیبوں کے ہیں جنہوں نے جمیل جالبی کو قریب سے دیکھا ہے اور ان کی تصانیف کو زیر مطالعہ رکھا ہے۔پہلا مضمون ڈاکٹر محمد خاور جمیل کا ہے جو جمیل جالبی صاحب کے صاحبزادے ہیں۔مشمولات دیکھ کر ہی اس خصوصی نمبر کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔'ڈاکٹر جمیل جالبی کی ترجمہ نگاری: ایک مطالعہ' ڈاکٹر نذر عابد، 'جمیل جالبی کے تنقیدی تحقیقی اور ادبی نظریات کا جائزہ' ڈاکٹر روشن آرا، 'تاریخ ادب اردو اور سرسید احمد خان' ڈاکٹر سمیرا بشیر، 'ڈاکٹر جمیل جالبی: تعلق اور تحقیق کی خوشبو' ڈاکٹر زاہد منیر عامر، 'اکیسویں صدی، روشن آنکھیں اور جمیل جالبی' ڈاکٹر ذکیہ رانی، 'ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید کے فکری زاویے' ڈاکٹر محمد امجد عابد، 'اردو تاریخ نگاری اور جمیل جالبی....رمیشہ قمر، 'اردو ادب میں تاریخ نویسی اور ڈاکٹر جمیل جالبی' محمد امان اللہ خان، 'ڈاکٹر جمیل جالبی: اُردو زبان و ادب کا محسن' عظمیٰ نورین، 'ڈاکٹر جمیل جالبی اور بچوں کا ادب' ڈاکٹر یاسمین سلطانہ، 'اردو کی پہلی مثنوی' کدم راؤ پدم راؤ..' محمد ابرار۔یہ سب مضامین تحقیقی اور معلوماتی ہیں۔ان کے علاوہ دیگر مضامین میں 'کویت میں ادبی پیش رفت: ایک ادبی مکالمہ' ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا، 'داغ کی شاعری کا مکالماتی اسلوب' ڈاکٹر محمد نظام الدین، 'ادب اطفال کے تین اہم فکشن نگار' محمد اختر، شامل ہیں جو بے حد دلچسپ اور مفید ہیں۔

امید ہے کہ قارئین حضرات 'تاریخ ادب اردو' کے اس خصوصی نمبر کو پسند فرمائیں گے اور ہماری کمیوں کو دور کرنے کے لیے اپنے نیک مشوروں اور مفید تجویزوں سے نوازیں گے۔

مدیر

ادب کا ودیا ساگر ڈاکٹر جمیل جالبی (میرے پاپا)

ڈاکٹر محمد خاور جمیل، پاکستان

ملخص

ڈاکٹر جمیل جالبی میرے پاپا تھے۔ جسمانی طور پر وہ اب ہم میں موجود نہیں مگر میں ہمہ وقت ان کا سایہ، ان کی شفقت اور ان کی موجودگی محسوس کرتا رہتا ہوں کیونکہ میں دنیا کی ان چند خوش نصیب اولادوں میں سے ایک ہوں جن کی عزت، شہرت اور عظمت ان کے اپنے والد کی عزت، شہرت اور عظمت کا پرتو ہے۔

جب وہ انکم ٹیکس کمشنر تھے تب بھی ان کی کئی تصانیف اور تالیف منظر عام پر آئیں اور جب وہ تعلیمی اور ادبی ادارے میں ملازمت کرتے تھے اس وقت بھی اداروں کے لیے کئی کتابیں مرتب کیں اور پھر جب وہ گھر آ گئے تو بھی مسلسل تخلیقی و تحقیقی کام کرتے رہے۔ ان کی تصانیف و تالیف کی تعداد صد سے زیادہ ہیں مگر ان کا سب سے بڑا، یادگار اور رہتی دنیا تک اردو علم و ادب میں سدابہار کام ''تاریخ ادب اردو'' ہے جو چار ضخیم ترین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد 1975 میں، دوسری جلد (حصہ اول) دوسری جلد (حصہ دوم) 1982ء میں اور تیسری جلد (جلد سوم) 2007 میں اور چوتھی جلد (حصہ اول، حصہ دوم) 2013 میں منظر عام پر آئی ہیں۔

☆☆☆

دنیا میں انسانی رشتوں میں واحد ایک انسانی رشتہ باپ کا ہے جو اپنی اولاد کو اپنے سے بڑا دیکھنا چاہتا ہے اور اسی دنیا میں وہ اولاد سب سے زیادہ خوش نصیب ہے جو اپنے والد کی عظمت، شہرت اور عزت کی پاس دار ہوتی ہے۔ ایسی اولادوں کے لیے کہا گیا ہے کہ ''با ادب بانصیب''۔

ڈاکٹر جمیل جالبی میرے پاپا تھے۔ جسمانی طور پر وہ اب ہم میں موجود نہیں مگر میں ہمہ وقت

ان کا سایہ، ان کی شفقت اور ان کی موجودگی محسوس کرتا رہتا ہوں کیونکہ میں دنیا کی ان چند خوش نصیب اولادوں میں سے ایک ہوں جن کی عزت، شہرت اور عظمت ان کے اپنے والد کی عزت، شہرت اور عظمت کا پرتو ہے۔ میرے پاپا ڈاکٹر جمیل جالبی کو رب کریم نے کس قدر بلند مرتبہ، کتنی عزت اور کتنی پائیدار شہرت سے نوازا ہے کہ آج بھی ان سے محبت کرنے والے ان کی عزت کرنے والے دنیا میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا حق ادا کیا۔ رب کائنات نے یہ دنیا انسانوں کے لیے آباد کی اور انسانوں کو سب کے کام آنے کا فریضہ سونپا۔ کس انسان نے کس حد تک اپنے فرائض ادا کیے اس بات کا پتا تو اسی انسان کو ہوتا ہے یا رب کعبہ کو مگر چند انسان ایسے ہیں جن کا ایک ایک لمحہ اس دنیا میں بنی نوع انسان کی فلاح بہبود کے لیے، ان کی تعلیم و تعلم کے لیے، ان کی بہتری کے لیے اور ان میں شعور و آگاہی کے لیے گزرتا ہے۔ دنیا ان کے علم سے فیض پاتی ہے۔ اس سے پہلے میں مزید کچھ عرض کروں مناسب ہوگا کہ میں یہاں ذوق کا شعر آپ کے ملاحظہ کے لیے پیش کروں۔

ذوق فرماتے ہیں:

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق
اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

ایسا سخن یا کام جس سے انسانوں میں سوچنے، سمجھنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہو وہی افضل ہے اور کارآمد ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے جتنے ادبی کام کیے جتنی تصانیف و تالیفات لکھی جن کی تعداد نصف صد سے زائد ہی ہیں اور بڑی بڑی ضخیم جلدوں میں بھی ہیں جن میں مشرقی ادب کے ساتھ ساتھ مغربی ادب کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ان تمام اہل علم، اہل ادب، اہل شعور اور اہل ذوق کے لیے کسی مخزن سے کم نہیں۔ ان کی ہر تصنیف اور ہر تالیف ادب اور تعلیم کے لیے مشعل راہ ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ علم، یہ آگہی، یہ تصنیف اور تالیفات سخن قوی ہیں اور میں ان کی اولاد یا میری اولاد کب تک پاپا دادا کا نام روشن رکھیں گے اور ہم میں اس قدر استطاعت یا طاقت بھی کہاں ہے ان کا علم جو انہوں نے کتابوں میں منتقل کر دیا ہے نسل در نسل ان کا نام روشن رکھے گی۔ علم سے جو نام روشن ہوتا ہے وہ رہتی دنیا تک روشنی دیتا رہتا ہے۔

اب وتدریس کے شعبے سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے دانش ور اور علمائے ادب میں سے

کون ہوگا کہ جو ڈاکٹر جمیل جالبی کو نہ جانتا ہو اور ان کے تحقیقی، تخلیقی اور تنقیدی کاموں سے ناواقف ہو۔ اب ہر آنے والا نیا ادیب یا شاعر جب تک ادب کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے لازماً جالبی صاحب کی کتابوں سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔ یوں جالبی صاحب کا تخلیق کردہ ادب رہتی دنیا تک صدقہ جاریہ کا کام دیتا رہے گا۔

اگر چہ جالبی صاحب کے بارے میں ہر ایک شخص نے لکھا ہے جس کا تعلق خواہ ادب سے ہو یا تعلیم سے، سرکاری اداروں سے ہو یا ذاتی طور سے، اس لیے ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں بتانا مجھے مناسب تو نہیں لگ رہا ہے مگر چونکہ ہر مضمون کی پہنچ ہر ادب نواز اور ادب کے طالب علموں کے لیے لازمی نہیں ہوتی اس لیے میں جالبی صاحب کے بارے میں کچھ ابتدائی معلومات درج کرتا ہوں۔

یکم جولائی 1929 کو علی گڑھ میں محمد ابراہیم خان کے گھر پیدا ہونے والے محمد جمیل خان کی قسمت میں اللہ تعالیٰ نے کس قدر عزت و احترام لکھ دیا تھا اور خود جالبی صاحب نے اپنے شعور سے اپنی زندگی کی بہترین استعمال کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ اس کا اندازہ جالبی صاحب کو بہت جلد ہو گیا مگر چونکہ ایک نیک اور صائب خاندان کے فرد فرید تھے اس لیے جالبی صاحب کو ملنے والی عزت سے ان کا ظرف چھلکا نہیں بلکہ مزید خم دار ہو گیا۔

جب وہ انکم ٹیکس کمشنر تھے تب بھی ان کی کئی تصانیف اور تالیف منظر عام پر آئیں اور جب وہ تعلیمی اور ادبی ادارے میں ملازمت کرتے تھے اس وقت بھی اداروں کے لیے کئی کتابیں مرتب کیں اور پھر جب وہ گھر آ گئے تو بھی مسلسل تخلیقی و تحقیقی کام کرتے رہے۔ ان کی تصانیف و تالیف کی تعداد صد سے زیادہ ہیں مگر ان کا سب سے بڑا، یادگار اور رہتی دنیا تک اردو علم و ادب میں سدا بہار کام ''تاریخ ادب اردو'' ہے جو چار ضخیم ترین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد 1975 میں، دوسری جلد (حصہ اول) دوسری جلد (حصہ دوم) 1982ء میں اور تیسری جلد (جلد سوم) 2007 میں اور چوتھی جلد (حصہ اول، حصہ دوم) 2013 میں منظر عام پر آئی ہیں۔ تاریخ ادب اردو کی پانچویں جلد جو بیسویں صدی کے نصف عہد کے مشاہیر ادب پر مشتمل ہوتی منظر عام پر آنے سے رہ گئی کیونکہ جالبی صاحب کی جسمانی کمزوری نے انہیں نڈھال کر دیا تھا اور وہ اپنے حصے سے بڑھ کر کام کرنے کی وجہ سے تھکن کا شکار ہو گئے اوپر سے ان کی ضعیفی ان کے کام میں رکاوٹ بن گئی اور جالبی صاحب تاریخ ادب اردو کی پانچویں جلد لکھنے کی خواہش کے

باوجوداس پر عمل نہ کر سکے یوں تاریخ ادب اردو اس لحاظ سے مکمل ہونے سے رہ گئی کہ بیسوی صدی کے چند اکابر علم و ادب کا تذکرہ جسے جالبی صاحب صداقت و دیانت سے لکھتے، لکھنے سے رہ گئی کیونکہ جالبی صاحب کی سابقہ چاروں جلدوں میں جالبی صاحب نے بلا کسی تعصب کے اردو کی تاریخ مستند اور اصل حوالہ جات سے بڑی جدوجہد، کوشش، دقت اور مشقت سے لکھی ہے، اتنی مشقت آج تک اردو ادب کی تاریخ لکھنے والے کسی بھی مؤرخ نے نہیں کی۔ یہی اس کا امتیاز خاص ہے کہ تاریخ ادب اردو کی جلدیں ضخیم اور قیمتی ہونے کے باوجود کئی بار شائع ہوئی، اب تک چاروں جلدوں کے دس سے زائد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کی مقبولیت کی واحد وجہ یہ نہیں ہے کہ اسے اردو ادب کے طالب علم پڑھتے ہیں بلکہ یہ تاریخ تو اردو ادب کے استادوں کے بھی زیر مطالعہ رہتی ہے۔ اس تاریخ ادب اردو کی ضرورت ہر لائبریری کو رہتی ہے، ہر جامعہ کے لیے تحقیقی ادارے کے لیے تاریخ ادب اردو لازمی ہے۔ اس کتاب کی مانگ کسی طرح کم نہیں ہو سکتی۔

جالبی صاحب مؤرخ ہی نہیں تھے، محقق بھی تھے، مترجم بھی تھے، کلچر شناس بھی تھے، مدیر بھی تھے، بچوں کے ادیب بھی تھے اور سب سے بڑھ کر لغت نگار بھی تھے۔ جالبی صاحب کا دوسرا بڑا کام لغت سازی ہے۔ قدیم اردو لغت کی تدوین، فرہنگ اصطلاحات 'جامع عثمانیہ' اور قومی انگریزی اردو لغت' کی تدوین جالبی صاحب کے کارناموں میں بلاشبہ قابل قدر ہیں۔

جمیل جالبی صاحب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ اردو دنیا کے علاوہ انگریزی کے رسائل اور اخبارات میں جالبی صاحب پر کئی مضامین آچکے ہیں۔ بیشتر تحقیقی، تخلیقی اور ادبی رسائل میں جالبی صاحب کا نمبر بھی نکلا ہے اور گوشے تو کئی رسائل نے نکالے ہیں۔ ان پر لکھنے کا یہ عمل ان شاء اللہ جاری رہے گا کیونکہ جب تک جھرنا بہتا رہے گا اس سے اپنی پیاس بجھانے والے اپنی پیاس بجھاتے رہیں گے۔

☆☆☆

ڈاکٹر جمیل جالبی کی ترجمہ نگاری: ایک مطالعہ

ڈاکٹر نذر عابد
صدر شعبۂ اُردو، ہزارہ
یونیورسٹی مانسہرہ، پاکستان

ABSTRACT

Dr. Jamil Jalbi (1929-2019) is a renowned Urdu Researcher and Critic. He was born in Aligarh. After having got the primary and secondary education from Aligarh and Saharanpur, he did his graduation from Merith College. He came to Karachi (Pakistan) one day before the partition on 13th August 1947. He completed his education from Sindh University securing degrees of MA, LLB, PhD and D.Lit.

He was selected in civil services of Pakistan and served in Income Tax Department. He also served on key posts like Chairman, National Language Authority and Vice Chancellor, Karachi University.

He has so many books on his credit. He has written the history of Urdu language and literature comprising four

volumes. "Pakistani Culture" is another important book written by him in which he has identified the fundamental traits of Pakistani culture and civilization. He also launched a quarterly literary journal "Naya Dour" which has served a lot to promote Urdu language and literature.

He was also interested in translation studies. He has translated in Urdu, the famous English novel "Animal Farm" written by George Arvil. The special field of interest regarding his translation works was western criticism. In this regard, he has translated 14- articles of famous English Critic T.S Eliot. Besides this, he has also written a very important book namely "Arastoo se Eliot tak". In this book, he has translated 25-articles of famous and significant western critics right from Aristotle (322-384 BC) to T.S Eliot, the critic of 20th century. He has also included the introductory notes regarding life and works of each critic. This book is very much popular among the students and teachers of Urdu literature.

In this article, the author has brought forward a critical study while analyzing and evaluating the translation works of Dr. Jamil Jalbi.

☆☆☆

ترجمہ اس لحاظ سے مشکل فن ہے کہ ترجمہ نگار کا نہ صرف دونوں متعلقہ زبانوں پر کامل عبور ہونا لازم ہے بلکہ ان دونوں زبانوں سے وابستہ تہذیبی و ثقافتی مظاہر سے بھی بڑی حد تک آگہی ضروری

ہے۔مترجم اپنے ترجمے کی وساطت سے دوطرح کے سماج میں پائے جانے والے ذہنی وفکری ابعاد کے درمیان گویا ایک پل کی تعمیر کا تخلیقی فریضہ سرانجام دیتا ہے۔یوں دو ثقافتوں کے درمیان ذہنی وفکری روابط کے تازہ ترامکانات وجود میں آتے ہیں۔اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ترجمے کا فن عالمی سطح پر ایک بلند علمی وادبی اہمیت کا حامل قرار پاتا ہے۔

دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اردو میں بھی ترجمے کی اہمیت کو عملی طور پر تسلیم کیا گیا۔اردو کے متعدد مترجمین نے اس اہم علمی وادبی سرگرمی کے تحت عالمی ادب کے معروف فن پاروں اور کتب کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔اس سلسلے میں ایک اہم نام ڈاکٹر جمیل جالبی کا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے تنقید، ادبی تاریخ ،لسانیات ،لغت نگاری اور متنی ترتیب وتدوین کے شعبوں میں قابلِ قدر کام کرنے کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگاری کے میدان میں بھی اپنی وقیع اور معتبر علمی کاوشوں کے توسط سے اپنی صلاحیتوں کو منوایا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا طبعی میلان زیادہ تر چونکہ تحقیق وتنقید کی طرف رہا لہٰذا انھوں نے ترجمے کی غرض سے جن تحریروں کا انتخاب کیا ان کا تعلق خاص طور پر مغرب کے تنقیدی سرمائے سے تھا۔تاہم اس سلسلے میں ان کی ایک کاوش ان کے غالب طبعی میلان سے ذراہٹ کے ہے۔انھوں نے جارج اورول کے معروف ناول ''Animal Farm'' کا اردو ترجمہ ''جانورستان'' کے نام سے کیا۔اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ کہانی سے انھیں کسی حد تک مناسبت تھی۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے بچوں کی فرمائش پر عجیب وغریب واقعات پر مشتمل کہانیاں تحریر کیں جو ''حیرت ناک کہانیاں'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئیں۔

ترجمے کے حوالے سے ان کے دیگر منصوبے ان کے غالب طبعی رجحان تحقیق وتنقید ہی سے متعلق رہے۔اس سلسلے میں ان کی اولین کاوش بیسویں صدی کے انگریزی کے معروف شاعر اور نقاد ٹی۔ایس ایلیٹ کے تنقیدی مضامین کے اردو تراجم پر مشتمل ''ایلیٹ کے مضامین'' کے نام سے کتابی صورت میں سامنے آئی۔اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مئی ۱۹۶۰ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۶ء، تیسرا ۱۹۷۱ء جب کہ چوتھا ایڈیشن نظر ثانی اور اضافوں کے ساتھ ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔

اس کتاب میں ابتدائی طور پر ٹی۔ایس ایلیٹ کے مختصر سوانح کے ساتھ اس کے درج ذیل نو مضامین کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا۔

۱۔شاعری کا سماجی منصب ۲۔شاعری کی تین آوازیں ۳۔شاعری کی موسیقی

۴۔شاعری اور ڈراما ۵۔روایت اور انفرادی صلاحیت ۶۔کلاسیک کیا ہے؟

۷۔مذہب اور ادب ۸۔تجربہ اور تنقید ۹۔تنقید کے حدود

بعد میں نظر ثانی شدہ ایڈیشن میں ٹی۔ایس ایلیٹ کے درج ذیل پانچ مزید تنقیدی مضامین کا ترجمہ بھی شامل کر دیا گیا۔

۱۔شاعری اور پروپیگنڈا ۲۔بودلیئر ۳۔ادب اور عصرِ جدید

۴۔صحافت اور ادب ۵۔تنقید کا منصب

ان پانچ مضامین کے اضافے کے ساتھ ساتھ کتاب کے پہلے حصے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے ٹی۔ایس ایلیٹ کا بحیثیت نقاد، شاعر اور ڈراما نگار ادبی مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کے ذریعے پڑھنے والے کو نہ صرف ٹی۔ایس ایلیٹ جیسے اہم مغربی نقاد کے ادبی وتنقیدی خیالات ونظریات سے براہِ راست آگہی حاصل کرنے کا موقع میسر آتا ہے بلکہ اس کے ادبی قد کاٹھ اور مقام و مرتبے کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے صاحبِ بصیرت اور تجزیاتی ذہن رکھنے والے نقاد کی آرا سے استفادے کی صورت بھی نکلتی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی ترجمہ نگاری کا تیسرا بڑا اور سب سے اہم منصوبہ ان کی معروف ومقبول کتاب ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' کی صورت میں منظرِ عام پر آیا۔۱۹۷۵ء میں پہلی بار شائع ہونے والی اس کتاب میں ارسطو سے لے کر ٹی۔ایس ایلیٹ تک مغرب کے سترہ اہم نقادوں کے چوبیس تنقیدی مضامین کے تراجم شامل ہیں۔۲۰۱۲ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی اس کتاب کے نویں ایڈیشن میں مصنف نے ایک اور اہم مغربی نقاد ایذرا پاؤنڈ کا تعارف اور اس کے ایک مضمون کے ترجمے کا اضافہ کیا۔یوں اس کتاب میں مغرب کے اٹھارہ نمائندہ نقادوں کے پچیس اہم تنقیدی مضامین کے تراجم کی صورت میں مغرب کی ڈھائی ہزار سالہ ادبی تنقید کا ایک مکمل منظر نامہ پیش کر دیا گیا ہے۔اردو ادب کے اساتذہ، طلبہ اور عام باذوق قارئین میں یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ اب تک مختلف اداروں کی طرف سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

اس کتاب کی شانِ نزول کے حوالے سے خود مصنف نے کتاب کے پیش لفظ میں بتایا ہے کہ

جس زمانے میں وہ اپنی کتاب پاکستانی کلچر لکھ رہے تھے تو ایک دن اچانک انھیں محسوس ہوا کہ ذہن ماؤف ہوگیا ہے اوران کے پاس اب کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ کچھ دنوں تک یہی ذہنی کیفیت رہی۔ پھر ایک دن ان کے ذہن میں ایک نیا خیال ابھرا۔ وہ لکھتے ہیں:

''اپنی اس کرب ناک کیفیت سے مقابلہ کرنے کے لیے میں نے سوچا کہ چلیے میرے پاس تو ابکہنے کے لیے کچھ نہیں رہا لیکن لگے ہاتھ یہ دیکھ لیا جائے کہ دنیا کے دوسرے سوچنے اور لکھنے والوں کے پاس کیا ہے؟ ان کے پاس بھی، جو گزر چکے ہیں اوران کے پاس بھی، جو زندہ ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے پڑھنا شروع کیا۔''(۱)

اس دوران میں انھوں نے ادب کے علاوہ تاریخ، فلسفہ، نفسیات اور عمرانیات کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ انگریزی ادب کے عمیق مطالعے نے انھیں ایک اور بات سجھائی۔ ان کے مطابق:

''اس خیال نے شدت اختیار کی کہ میں نے اب تک جو کچھ پڑھا ہے اس میں سے اگر مغرب کی ادبی فکر کو تسلسل کے ساتھ اردو میں منتقل کر دیا جائے تو اچھا ہو۔''(۲)

یوں انھوں نے مغرب کے اہم نقادوں کے چیدہ چیدہ مضامین کا اردو ترجمہ کرنے کا آغاز کیا۔ ان مضامین کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں انھوں نے متعلقہ مصنفین کے مختصر سوانح اوران کے فکری رجحانات کے حوالے سے تعارفی ابتدائیے بھی شامل کیے۔ اس کتاب کی ترتیب کچھ یوں رکھی گئی ہے کہ پیش لفظ کے بعد پچھتر صفحات پر مشتمل ایک وقیع مقدمہ شامل ہے، جس میں مصنف نے مغربی تنقید کے ارتقائی مراحل پر بات کرتے ہوئے قدیم یونانی فکر سے لے کر بیسویں صدی کی جدید مغربی تنقید کے رجحانات تک کا تفصیلی تجزیاتی مطالعہ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ اس مقدمے کی وساطت سے اردو کے قاری کے سامنے مغربی تنقید کے فکری رجحانات ومیلانات بہت واضح صورت میں روشن ہو جاتے ہیں۔

مقدمے کے بعد انفرادی مطالعات کا آغاز ہوتا ہے۔ اس حصے کی ابتدا ارسطو سے ہوتی ہے۔ ارسطو کے تعارف کے بعد اس کی مشہور زمانہ تصنیف ''بوطیقا'' کا چھبیس مختصر ابواب پر مشتمل ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ ارسطو سے پہلے اس کے استاد افلاطون نے بھی فنِ شعر سے متعلق کچھ سوالات اٹھائے تھے لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی پہلا باقاعدہ نقاد ارسطو کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس نے شاعری سے متعلق افلاطون کے اٹھائے گئے سوالات پر پہلی بار ایک مربوط نظامِ فکر کے تحت روشنی ڈالی۔ شاید مصنف نے شاعروں

کے احترام میں افلاطون کو اپنی فہرست میں شامل نہ کیا ہو کہ اس نے بھی تو اپنی مثالی ریاست سے شاعروں کو دیس نکالا دے دیا تھا۔

کتاب کے اگلے حصے میں ۶۵ قبل مسیح میں پیدا ہونے والے یونانی شاعر اور نقاد ہیوریس کے مضمون ''فنِ شاعری'' کا ترجمہ شامل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک ہیوریس ادب اور زندگی کے گہرے تعلق پر یقین رکھنے والا نقاد ہے۔ اس کے مذکورہ مضمون میں بھی اس امر کا گہرا احساس ملتا ہے۔

امکانی طور پر پہلی صدی عیسوی سے تعلق رکھنے والے یونانی نقاد لونجائنس کی معروف تصنیف کا انگریزی نام ''on the sublime'' ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس تصنیف کا اردو ترجمہ ''علویت کے بارے میں'' کے نام سے کیا ہے۔ چوالیس مختصر ابواب پر مشتمل اس تصنیف کا اردو ترجمہ ستاون صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ لونجائنس کا یہ مسودہ نامکمل حالت میں سولہویں صدی عیسوی میں فرانسس ربورٹیلو کی دریافت ہے۔ اس تصنیف میں بیان کردہ علویت اور ترفع کے اصول اور مخارج آج کے دور میں تخلیق ہونے والے ادب پر بھی بجا طور پر صادق آتے ہیں۔

اٹلی کے شہر فلورنس سے تعلق رکھنے والے دانتے ''طربیۂ خداوندی'' (Divine comedy) جیسی شہرۂ آفاق تصنیف کے خالق ہیں۔ اطالوی زبان میں لکھی گئی دانتے کی اس تصنیف پر فارابی، ابنِ سینا، امام غزالی، ابنِ رشد اور ابن العربی جیسے مسلم مفکرین کے فکری اثرات نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی زیرِ نظر کتاب میں دانتے کا مضمون ''عام بول چال کی زبان کا ادبی استعمال'' کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق دانتے کے عہد میں لاطینی زبان اعلیٰ علمی و ادبی زبان سمجھی جاتی تھی لیکن دانتے نے اس کے برعکس ''طربیہء خداوندی'' اطالوی زبان میں لکھا جب کہ مذکورہ بالا مضمون اس نے لاطینی زبان میں لکھا تاکہ اطالوی زبان کو حقارت کی نظر سے دیکھنے والے اہلِ علم کو باور کرایا جا سکے کہ ''طربیہ'' کو اطالوی زبان میں لکھنے کا جواز کیا تھا۔

جس سال لونجائنس کا مخطوطہ دریافت ہوا، اسی سال یعنی ۱۵۵۴ء میں معروف انگریزی شاعر اور نقاد سر فلپ سڈنی پیدا ہوا۔ وہ عین جوانی میں بتیس سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ اس کی جواں مرگی پر لگ بھگ دو سو مرثیے لکھے گئے۔ بہت کم عمری میں اس نے ایسے تخلیقی اور تنقیدی کارنامے سرانجام دیے کہ انگریزی ادب میں اس کا نام امر ہو گیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب میں اس کے مشہور تنقیدی مضمون

''شاعری کا جواز'' کا اردو ترجمہ شامل کیا۔ یہ مضمون سر فلپ سڈنی کی وفات کے نو برس بعد دو ناشرین نے ''شاعری کا جواز'' اور ''شاعری کے لیے معذرت'' کے دو مختلف ناموں سے شائع کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق یہی مضمون ادب میں سر فلپ سڈنی کی دائمی شہرت کا باعث ہے۔

کتاب میں شامل اگلا اہم نقاد پیرس سے تعلق رکھنے والا بولو ہے۔ کلاسیکی مزاج کا حامل بولو بنیادی طور پر شاعر تھا لیکن وہ گہرے تنقیدی شعور کا مالک بھی تھا۔ شعری مزاج اور گہرے تنقیدی شعور کے امتزاج ہی کا نتیجہ تھا کہ اس کے تنقیدی خیالات و نظریات نے بھی منظوم صورت میں اظہار پایا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب میں اس کی مشہور منظوم تصنیف ''فنِ شاعری'' کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ چار کینٹوز پر مشتمل اس منظوم تصنیف میں بولو نے لکھنے والوں کو تخلیق کے حوالے سے بہت مفید مشورے دیئے ہیں۔ خاص طور پر یہ کہ لکھنے والے کو لکھنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیئے۔ گویا اپنی قلبی واردات کو خوب پختگی کے مراحل سے گزار کر قلم اٹھانا چاہیئے۔ بقول علامہ اقبال:

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

(۳)

اٹھارویں صدی کے جرمن نژاد لیسنگ کی اصل شہرت اس کی ڈراما نگاری ہے لیکن اس کی ایک تنقیدی تصنیف ''لاؤکون'' اسے مغربی نقادوں کی صف میں اہم مقام دلاتی ہے۔ اپنی اس تصنیف میں اس نے مختلف فنونِ لطیفہ اور خاص طور پر شاعری اور مصوری کے امتیازات پر بحث کی ہے۔ ''لاؤکون'' دراصل قدیم یونانی دیومالا کا ایک لافانی کردار ہے۔ لیسنگ اسی کردار کے مجسمے کو اپنے تنقیدی مباحث کی بنیاد بناتا ہے اور بحث کے دوران میں بار بار اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس تصنیف کے سولہویں باب کو ترجمے کے لیے منتخب کیا جو ان کی کتاب میں شامل ہے۔

''فاؤسٹ'' جیسی لافانی تخلیق کا خالق جرمن شاعر، ڈراما نویس اور ناول نگار گوئٹے، لیسنگ کا ہم عصر تھا۔ اس نے تخلیقی ادب کے مختلف شعبوں میں قابلِ قدر کام کیا۔ تاہم اپنے گہرے تنقیدی شعور کے باعث اسے ایک اہم نقاد بھی سمجھا جاتا ہے۔ میتھیو آرنلڈ کے مطابق اسی گہرے تنقیدی شعور نے گوئٹے کے سامنے تخلیق کے نئے آفاق روشن کر دیئے اور یوں اس کے تخلیقی عمل میں آفاقی شان پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر جمیل

جالبی نے اپنی کتاب میں گوئٹے کے جن دو تنقیدی مضامین کے تراجم پیش کیے ان میں ''ناول اور ڈراما'' اور ''ارسطو کی بوطیقا کا تتمہ'' شامل ہیں۔اس کے علاوہ ''کلاسیکیت اور رومانیت'' کے عنوان سے اس کے ایک شذرے کا ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔

انگریزی ادب میں رومانی تحریک کو ایک نیا رخ اور نئی توانائی دینے والے شاعروں اور ادیبوں میں کولرج ایک اہم نام ہے۔اس نے نہ صرف تخلیقی سطح پر رومانی شاعری کے بہترین نمونے پیش کیے بلکہ ''بایوگرافیا لٹریریا'' جیسی تصنیف لکھ کر رومانی تنقید کے بنیادی خدوخال کو واضح کیا۔خاص طور پر شاعری میں تخیل، شاعرانہ فطرت اور شعری زبان کے حوالے سے بنیادی اصول متعین کیے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کی تصنیف ''بایوگرافیا لٹریریا'' میں سے چار حصے ''قوتِ تخیل''، ''رومانی شاعری''، ''نظم اور شاعری'' اور ''شاعری کی زبان'' کے عنوانات کے تحت ترجمہ کر کے اپنی کتاب میں شامل کیے۔ان تراجم سے کولرج کی رومانی تنقید کے بنیادی عناصر بھرپور وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔

انیسویں صدی سے تعلق رکھنے والا فرانسیسی نقاد سانت بیو انتہائی صاحبِ مطالعہ شخص تھا۔شاید اسی کثرتِ مطالعہ کا نتیجہ تھا کہ اس کی فکر مسلسل ارتقا کے مراحل طے کرتی رہی۔ابتدا میں اس کی تحریروں پر رومانیت کے گہرے اثرات موجود ہیں۔بعد میں وہ کلاسیکیت کا علم بردار بن گیا۔وہ اس بات پر بھی زور دیتا تھا کہ فن کا مطالعہ فن کار کی ذات کے حوالے سے ہونا چاہیئے۔اس پر اعتراض بھی کیا گیا کہ اس کی تنقید ادبی کی بجائے تاریخی اور سوانحی نوعیت کی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کا مضمون ''کلاسیک کیا ہے'' کا ترجمہ اپنی کتاب میں پیش کیا ہے۔اس مضمون کے ذریعے کلاسیک کی ماہیئت اور حدود کو سمجھنے میں بڑی حد تک مدد ملتی ہے۔

انیسویں صدی ہی کے معروف انگریزی شاعر اور نقاد میتھیو آرنلڈ بھی سانت بیو کی طرح تنقید کو فن کا درجہ دیتا ہے۔اس کی تنقید ادب اور زندگی کے باہمی رشتوں کو سمجھنے کی ایک کاوش ہے۔تخلیقی طور پر وہ ہیئت اور مواد کی اکائی کا قائل ہے۔اپنے بعد آنے والے انگریزی نقادوں پر اس کی فکر کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کے دو اہم مضامین ''شاعری کا مطالعہ'' اور ''تنقید کا منصب'' کا ترجمہ کر کے اپنے قاری تک میتھیو آرنلڈ کے شاعری اور تنقید سے متعلق بنیادی خیالات بطریقِ احسن پہنچائے ہیں۔

''وار اینڈ پیس'' جیسے شاہکار ناول کے خالق لیو ٹالسٹائی نے روس کے کلیسائی مذہب سے بیزار ہو کر عیسائیت کے حوالے سے اپنے عقائد کی روشنی میں نیا نظریہ وضع کیا۔ اس کے ان خیالات کی چھوٹ اس کی تحریروں پر بھی پڑی۔ اس نے اپنی معروف تنقیدی تصنیف ''فن کیا ہے'' میں ادبی تحریروں کا تجزیہ انہی خیالات کی روشنی میں کرنے پر زور دیتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ٹالسٹائی کی اس تصنیف کے پندرہویں اور سولہویں باب کے تراجم پیش کیے ہیں۔ ان دونوں ابواب میں کی گئی بحث کی روشنی میں ٹالسٹائی کے مکمل نظامِ فکر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اپنے والد کا ہم نام اور مشہور امریکی فلسفی ولیم جیمز کے بھائی ہنری جیمز نے زندگی کا بڑا حصہ یورپ میں گزارا۔ اس کی بنیادی شناخت ناول نگار کی حیثیت سے ہے لیکن انیسویں صدی کے آخر میں جب ناول کے حوالے سے تنقید لکھنے کا آغاز تو ہنری جیمز اُن چند نقادوں میں شامل تھا جنہوں نے انگریزی ناول کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا۔ اس سلسلے میں اُس کا سب سے اہم مضمون ''آرٹ آف فکشن'' ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ہنری جیمز کا ''فکشن کا فن'' کے عنوان سے ترجمہ کر کے اپنی کتاب میں شامل کیا۔ اس مضمون میں ہنری جیمز نے ناول نگار کے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ زندگی کے قریب رہ کر اپنے زندہ تجربات کو مخصوص ہیئت اور زبان کے ذریعے قاری کے سامنے پیش کرے۔

اپنے نظریۂ اظہار سے شہرت پانے والا اطالوی نقاد کروچے انسانی صلاحیتوں کو چار دائروں یعنی جمالیاتی، اخلاقی، معاشی اور منطقی صلاحیتوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اُس کے مطابق ان صلاحیتوں سے جنم لینے والی سرگرمیاں انسانی روح کے دائرے کو مکمل کرتی ہیں۔ کروچے کے نزدیک تنقید دراصل تخلیق نو ہے۔ تخلیق کار تاثر پذیری اور داخلی اظہار کے مراحل سے گزر کر فن کو ظاہری صورت بخشتا ہے۔ کروچے کے مطابق نقاد اس کے برعکس فن کی ظاہری صورت سے تاثر پذیری کے مرحلے تک پہنچتا ہے یوں گویا وہ تخلیق نو کا عمل انجام دیتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے کروچے کا ایک اہم مضمون ''شاعری کا جواز'' کے عنوان سے ترجمہ کیا۔ اُس زمانے میں جب بعض فلسفیوں کی طرف سے شاعری کی موت کا اعلان کیا جا رہا تھا، کروچے کا یہ مضمون انسانی سماج میں شاعری کی اہمیت اور ضرورت کے تناظر میں ایک اہم دستاویز ہے۔

بیسویں صدی کا انگریز نقاد آئی۔ اے رچرڈز پہلا نقاد ہے جو تنقید کو سائنسی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ بیسویں صدی میں طبیعات اور نفسیات کے علوم میں حیرت انگیز ترقی نے انسانوں کے سوچنے کا انداز

اور طرزِ احساس بدل ڈالا۔ رچرڈز اس ذہنی و فکری سطح پر تبدیل ہوتے سماج میں شاعری سے بھی نئے تقاضوں کا مطالبہ کرتا ہے۔''ارسطو سے ایلیٹ تک'' میں رچرڈز کے مضمون ''سائنس اور شاعری'' کا ترجمہ شامل ہے جس میں اُس کے تنقیدی نظریات کی بھر پور ترجمانی پائی جاتی ہے۔

تمیں سال کی عمر میں اسپین کی خانہ جنگی میں مارا جانے والا انگریز ناول نگار اور نقاد کرسٹوفر کارڈویل مارکسی فکر کا پرچارک تھا۔اُس کی زیادہ تر تصانیف اُس کے مرنے کے بعد شائع ہوئیں۔اُس نے اپنی تحریروں میں شاعری اور فن پر مارکسی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی اور شاعری کے ماخذات سماج میں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے کرسٹوفر کارڈویل کا ایک مضمون ''شاعری کا مستقبل'' کے عنوان سے ترجمہ کر کے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔اس مضمون میں بھی شاعری پر مارکسی اندازِ فکر کے تحت بحث کی گئی ہے۔

بیسویں صدی کے انگریزی ادب کو قدیم عہد سے نکال کر جدید عہد میں داخل کرنے کا سہرا معروف امریکی شاعر اور نقاد ایذرا پاؤنڈ کے سر بندھتا ہے۔اس سلسلے میں اُس نے متعدد شاعروں اور ادیبوں کو نہ صرف اپنی تحریروں سے متاثر کیا بلکہ بعض کی تو باقاعدہ راہنمائی کی۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب کے لیے اُس کا ایک مضمون ''سنجیدہ فن کار'' کے عنوان سے ترجمہ کر کے اپنے قارئین کے سامنے پیش کیا۔اس مضمون میں ایذرا پاؤنڈ نے شاعری کی روایت اور تخلیقی عمل کے حوالے سے ایسے بنیادی مباحث چھیڑے ہیں جن سے لکھنے والے آج بھی راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

امریکہ میں پیدا ہونے والے ٹی۔ایس ایلیٹ نے نوجوانی ہی میں انگلستان کی شہریت حاصل کر لی تھی۔اُسے بیسویں صدی کی انگریزی شاعری اور تنقید میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔اُسے بیسویں صدی کا میتھیو آرنلڈ بھی کہا جاتا ہے۔شاعری میں اُس کا بڑا کارنامہ اُس کی طویل نظم ''دی ویسٹ لینڈ'' کو قرار دیا جاتا ہے۔تنقیدی نقطۂ نظر سے وہ تخلیق کے لیے روایت اور تاریخی شعور کو لازم قرار دیتا ہے۔ٹی۔ایس ایلیٹ کو اگر ڈاکٹر جمیل جالبی کا پسندیدہ نقاد کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔وہ ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' سے پہلے ''ایلیٹ کے مضامین'' کے نام سے ایک کتاب پیش کر چکے تھے جس میں ایلیٹ کے چودہ تنقیدی مضامین کے تراجم شامل تھے۔''ارسطو سے ایلیٹ تک'' کے لیے انہوں نے انہی چودہ مضامین میں سے دو مضامین ''روایت اور انفرادی صلاحیت'' اور ''شاعری کا منصب'' کا انتخاب کیا۔

''ارسطو سے ایلیٹ تک'' کی صورت میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے مغرب کی ڈھائی ہزار سالہ تنقیدی روایت کی متنی تاریخ مرتب کر دی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اہم مغربی نقادوں کے اہم تنقیدی مضامین کے تراجم کے ذریعے مغرب کی فکری روایت کو مربوط انداز میں پیش کر دیا ہے۔ یوں اُردو کے شاعروں، ادیبوں اور قارئین پر مغربی فکر کے ایسے دریچے وا ہو گئے جہاں سے آنے والے تازہ ہوا کے جھونکے اُن کی فکر کو تازگی اور توانائی سے ہم کنار کرتے رہیں گے۔ جہاں تک ان مضامین کے ترجمے کے معیار کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں اُردو کے معروف ادیب اور دانشور احمد ندیم قاسمی کی یہ رائے کافی ہے:

''جمیل جالبی کے یہ تراجم اس لحاظ سے بھی منفرد ہیں کہ معلوم ہوتا ہے مغرب کے اکابر نے اپنے یہ مضامین لکھے ہی اُردو میں ہیں۔ یہ صدیوں رہنے والا کارنامہ ہے۔''

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ڈاکٹر جمیل جالبی کی ترجمہ نگاری میں دو خصوصیات بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ جس تحریر کا ترجمہ کرنے کا ارادہ کرتے ہیں خود اس تحریر کی تفہیم کے حوالے سے کسی قسم کے ذہنی ابہام کا شکار نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اصل متن کی تہہ میں موجود مفاہیم کو بہت واضح اور غیر مبہم انداز میں اپنی زبان میں منتقل کر دینے میں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ خود ایک ماہرِ لسانیات ہونے کے ناتے الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی ساخت کے اعتبار سے اُن کے تراجم میں بھرپور مہارت کے ساتھ ساتھ ایک تازگی اور شگفتگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ یوں اُن کے تراجم اپنی تمام تر علمی ثقالت اور سنجیدگی کے باوجود پڑھنے والے کے لیے ذہنی سطح پر کسی طرح کے بوجھل پن کا باعث نہیں بنتے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ڈاکٹر جمیل جالبی، پیش لفظ، ارسطو سے ایلیٹ تک، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص۹

۲۔ایضاً ص۱۰

۳۔علامہ اقبال، کلیاتِ اقبال (اُردو)، فضلی سنز، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص۳۹۱

۴۔احمد ندیم قاسمی، پس ورق، ارسطو سے ایلیٹ تک

جمیل جالبی کے تنقیدی، تحقیقی اور ادبی نظریات کا جائزہ

ڈاکٹر روشن آرا
گوپی ناتھ پور، پرولیا،
مغربی بنگال۔723121

ملخص

جمیل جالبی کی تحقیقی وتنقیدی سرگرمیاں بہت وسیع ہیں۔ وہ ادب کو فکری اور فنی ہر سطح سے بلندی عطا کرنے کے خواہاں تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے تحقیق وتنقید کے منشا ومقاصد اور طریقۂ کار کے متعلق بحثیں کی ہیں۔ اس کے لئے دائرۂ کار اور کئی سطحیں بھی متعین کرنے کی سعی کی ہے۔ تنقید میں مغرب کی ہمہ وقت پیروی کے مخالف ہیں اور چاہتے ہیں کہ تنقید کا پیمانہ اپنی روایت اور ادبی تاریخ کی بنیاد پر قائم ہو۔ دوسری زبان سے اثرات قبول کرنا الگ بات ہے اور آنکھ بند کر کے اس کے ہر اصول ونظریات اور طریقۂ کار پر ایمان لانا الگ۔ اس کے لئے مطالعے کی وسعت، قدیم وجدید دونوں طرح کے ادبیات کی یکساں اہمیت وافادیت پر زور دیتے ہیں۔ مزید برآں وہ تاریخی سطح تک پہنچنے کے لئے نقاد کا ادب کے ابتداء سے لے کر موجودہ عہد تک کا مربوط مطالعہ کرنے، اس کی گہرائیوں میں اترنے اور اس کے سارے ذائقوں اور لطافتوں سے واقفیت اور مرکزی روایت کا شعور رکھنے کی امید کرتے ہیں۔ وہ تحقیق وتنقید کے باہم اشتراک پر زور دیتے ہیں کیونکہ بنا تحقیق کے تنقید بے راہ روی، بے سمتی اور بحران کی طرف گامزن ہو سکتی ہے اور بنا تنقیدی شعور کے تحقیقی کاوشیں اپنا وقار کھو سکتی ہیں۔ دونوں کا منشا ومقصد ادب کی تفہیم اور اقدار کا تعین ہے۔ نیز مستقبل کے نظامِ خیالِ نو کی تشکیل کا ذمہ دار بھی محقق ونقاد کو گردانتے ہیں۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ ایک ہی شخص کے اندر تحقیقی اور تنقیدی دونوں ہی صلاحیتیں مجتمع ہو جائیں۔

جمیل جالبی تحقیق وتنقید کا کامل شعور رکھنے کے ساتھ ادب کے متعلق ان کا اپنا مطمحِ نظر ہے جسے وہ وقتاً فوقتاً اپنے مختلف مضامین کے ذریعہ سامنے لاتے رہے ہیں۔ وہ ادب کو تاریخی کڑی سے جوڑنے

کے لئے اپنی روایت کی اہمیت پر زور دیتے ہیں ان کا ماننا ہے زمانہ کتنی بھی تبدیلیوں سے آشنا ہو جائے تاہم اسے اپنی اصلیت کو بھولنا نہیں چاہیئے ۔مغربی تہذیب نے مشرق کے طرزِ بودو باش،طریقۂ کار،سماجی، سیاسی، ذہنی،معاشرتی افکار کے ساتھ ادب پر بھی کافی اثرات مرتب کیے ہیں۔وہ مغرب کی بے جا پیروی کو اپنی تہذیبی اقدار سے دوری کے ساتھ ادب میں در آئی بے راہ روی، بے سمتی، بحرانی، اور ابلاغ کے مسائل کھڑے ہونے کے مترادف خیال کرتے ہیں۔مشرق و مغرب ہر دو طرح کے طرزِ خیال کے اشتراک سے وہ ایک نئے دائرے کی تشکیل چاہتے ہیں جسے ابعادِ رابع (Fourth Dimension) کہتے ہیں۔انہوں نے اپنے انداز میں جدیدیت کی تعریف پیش کی ہے اور اس کی بے سمتیوں کی طرف اشارے بھی کئے ہیں۔ جدید شاعری، جدید افسانہ نگاری کے مختلف رجحانات،علامتی افسانہ نگاری کے اظہار میں ادب کی سلیت کو مجروح کرنے والے عناصر پر بھی گرفت کی ہے۔وہ ادب کو عصری مسائل کی پیش کش کا ذریعہ متصور کرتے ہیں نہ کہ ذہنی عیاشی۔اس طرح وہ ادیبوں سے سستی ذوق کی فراہمی،سنسنی خیزی، گروہ بندی سے پرہیز کرنے کی تاکید کے ساتھ تاریخی شعور، روایت کی پاسداری اور عصری آگہی کو ادب کی روح تسلیم کرتے ہیں۔ادب میں تجربہ اور احساس کے ساتھ مشاہدے اور قوتِ متخیلہ کی اہمیت پر بھی زور دیتے ہیں۔اس طرح بہتر ادب کی تخلیق کے لئے ،اپنے صحتمند نظریے کی بنیاد پر مختلف زاویوں سے اسے پرکھ کر نئے ممکنات سے آشنا ہونے اور نئے افق کو چھونے کی بشارت بھی دیتے ہیں۔

کلیدی الفاظ

جمیل جالبی۔تحقیق۔تنقید۔ ادب ۔ رجحانات۔ تاریخی شعور۔ روایت۔تہذیب۔ مغربی تہذیب کی پیروی۔امتزاج۔سماج۔ سیاست ۔معاشرہ۔فرد۔نفسیات۔تحقیقی عمل۔تنقیدی شعور۔اسکالر کریٹک ۔علامتی افسانہ۔منفی رجحان۔ مابعد الادب۔ نظامِ خیال۔ صنعتی ترقی۔تہذیبی اقدار۔طرزِ احساس۔بدلتی زندگی۔ نئے تقاضے۔خیال و عمل کی بے ربطی۔زوال پذیر معاشرہ۔میر و سودا کے پر انتشار عہد کی اعلیٰ ادبی کاوشیں۔تہذیبی ادارے۔ جری سورما۔ جدیدیت۔ کلچر۔ تاریخ۔ معاشرہ۔ اکائی۔ ردعمل۔ابعادِ رابع۔

جمیل جالبی کے تنقیدی و تحقیقی اور ادبی نظریات کا جائزہ

ڈاکٹر جمیل جالبی بحیثیت ایک نکتہ رس نقاد، ماہرِ لسانیات، ادبی مورخ محقق، مترجم، مرتب اپنی

پہچان آپ رکھتے ہیں، انہیں کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ پوری دل جمعی، لگن، محنت، مستقل مزاجی اور دقیق رسی کے ساتھ انہوں نے ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ نہ صرف موجودہ دور بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے بھی مشعلِ راہ ہونگی۔ ان کی شخصیت اور طرزِ فکر میں اذہان کو اپیل کرنے کی صلاحتیں ہیں۔ ادب کیا تھا؟ کیسا ہے؟ اور مستقبل میں اسے کن اوصاف کا حامل ہونا چاہئے؟ مزید ادب کے سمت و راہ کے تعین میں تنقید و تحقیق کا جو کردار یا پھر رول رہا ہے اس سے وہ بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے اپنی ستر سالہ دورانیۂ تصنیف و تالیف میں جو سمجھا، جو محسوس کیا اور وسیع مطالعہ، عمیق مشاہدہ اور غور و فکر کے بعد جن نتائج تک پہنچے انہیں اپنے مختلف النوع مضامین و خطبات کے ذریعہ اپنے قاری تک پہنچایا۔ اس طویل دورانیہ میں انہوں نے ادب کے تعلق سے جو کچھ کیا اور جو بھی تصانیف یادگار چھوڑیں وہ مقدار اور معیار ہر دو لحاظ سے قابلِ اعتبار ہیں۔ جس طرح ان کی شخصیت میں ایک طرح کا اعتدال و توازن تھا، ان کی تحاریر بھی انہیں اوصاف کی حامل ہیں۔ ان کی تخلیقات کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان کی سوچ و فکر اور ان کے منصوبے کافی بڑے تھے اور انہوں نے جس بھی ادبی کام کا بیڑہ اٹھایا اسے نہایت عمدگی کے ساتھ پایۂ تکمیل کو بھی پہنچایا۔

آپ کی پیدائش ۱۲/ جون ۱۹۲۹ء کو علی گڑھ کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں ہوئی۔ آپ کا اصل نام محمد جمیل خان اور والد کا نام ابراہیم خان تھا۔ آپ کے آبا و اجداد یوسف زئی پٹھان تھے جو اٹھارہویں صدی میں سوات سے ہجرت کر کے ہندوستان میں آ بسے تھے۔ ابتدائی تعلیم علی گڑھ سے ہی حاصل کی۔ ۱۹۴۳ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول سہارنپور سے میٹرک، ۱۹۴۵ء میرٹھ کالج سے انٹر اور ۱۹۴۷ء میں بی اے کی تعلیم مکمل کی۔ تقسیمِ ملک کے بعد کراچی منتقل ہو گئے جہاں انہیں بہادر یار جنگ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے کے لئے پیش کش کی گئی جسے انہوں نے نہایت خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیا اور اپنے فرائض انجام دینے لگے۔ اسی دوران انہوں نے ایم۔اے اور ایل۔ایل۔بی کی بھی تعلیم مکمل کر لی۔ ۱۹۷۲ء سندھ یونیورسیٹی سے ڈاکٹر غلام مصطفٰی کے زیرِ نگرانی پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے مقالے کا عنوان ''قدیم اردو ادب'' تھا۔ پھر ۱۹۷۸ء میں نادر مثوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' پر تحقیق کی بنا پر انہیں ڈی لٹ کی ڈگری سے نوازا گیا۔ پاکستان کے اعلیٰ ملازمتوں کے امتحانات میں بھی انہوں نے کامیابی حاصل کی اور محکمہ انکم ٹیکس سے بھی طویل عرصے تک وابستہ رہے۔ ماہنامہ ''ساقی'' میں معاون مدیر کی حیثیت سے

کام کیا اور پھر اپنا خود کا سہ ماہی رسالہ ’’نیا دور‘‘ بھی جاری کیا۔ انہوں نے کئی اداروں کی بھی سرپرستی کی۔ ۱۹۸۳ء میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔

پھر ۱۹۸۷ء میں مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین کے عہدے کو بھی سنبھالا۔ ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۷ء تک اردو لغت بورڈ کے سربراہ بھی رہے۔ ان کی ادبی خدمات کے صلے میں انہیں کئی اعزازات سے بھی نوازا گیا ۱۹۶۴ء۔ ۱۹۷۳ء، ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۵ء میں انہیں داؤد ادبی انعام ملے۔ پھر ۱۹۸۷ء میں یونیورسٹی گولڈ میڈل، ۱۹۸۹ء میں محمد طفیل ادبی انعام اور حکومتِ پاکستان کی جانب سے ۱۹۹۰ء میں ستارۂ امتیاز اور ۱۹۹۴ء میں ہلالِ امتیاز جیسے اعزازات سے سرفراز کیے گئے۔ ۲۰۱۵ء میں اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے پاکستان کے سب سے بڑے ادبی انعام ’’کمالِ فن ادب انعام‘‘ سے ان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ ۱۸/ اپریل ۲۰۱۹ء کو کراچی میں لگ بھگ ۹۰ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔

جمیل جالبی نے اپنی ادبی و علمی زندگی کا آغاز محض بارہ سال کی عمر میں کیا۔ ان کی پہلی تخلیق ’’سکندر اور ڈاکو‘‘ ہے جو کہ بطور ڈرامہ اسکول میں اسٹیج کیا گیا تھا۔ دہلی کے رسالے ’بنات‘ اور ’عصمت‘ میں ان کی تخلیقات شائع ہوتے رہے۔ ان کی اشاعت پذیر اولین کتاب ’جانورستان‘ ہے جو جارج آرویل کے ناول کا ترجمہ ہے۔ جیسا کہ شروع میں ہی ذکر کیا جا چکا ہے کہ جمیل جالبی کی ادبی سرگرمیاں ہمہ جہت تھیں۔ انہوں نے تحقیق، تنقید، تراجم، علمی و ادبی مضامین، ادبی تاریخ، ترتیب و تدوین، بچوں کے لئے کہانیاں، ڈرامے غرض مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ ’تاریخ ادب اردو‘ پر انہوں نے چار جلدوں میں کتابیں تصنیف کیں۔ یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے جس میں اردو زبان و ادب کی ابتداء سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک کے ادب کو تاریخ کی کڑی سے جوڑنے اور ادب کے مختلف سروں کو ملانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ہر جلد میں کئی فصلیں قائم کی ہیں اور ہر فصلوں کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ حوالے و حواشی سے مزین، مدلل انداز اور جاندار اسلوب کی حامل ہے۔ اپنے اسلوب کے متعلق وہ خود بتاتے ہیں کہ انہوں نے:۔

> ’’ایک ایسا اسلوب دریافت کیا ہے جو ادب کی فکری، تنقیدی و تہذیبی تاریخ کے لئے شاید نہایت موزوں ہے‘‘ (۱)

غرض ’تاریخ ادب اردو‘ ہماری ادبی روایت کو سمجھنے میں ہر طرح سے معاون و مددگار ہے اور

ادب کے طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہوجاتا ہے۔ تحقیق کے میدان میں ان کے دیگر کارناموں میں مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس موضوع پر انہیں ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔ یہ اردو زبان کی قدیم ترین دریافت شدہ مثنوی ہے۔ دکنی زبان میں فخر الدین نظامی نے دورِ احمد شاہ بہمنی میں ۸۲۵ھ تا ۸۳۹ھ بمطابق ۱۴۲۱ء تا ۱۴۳۵ء کے درمیان تصنیف کی ہے۔ اس مثنوی میں دو شہزادے بھائیوں کی بہادری کی داستان رقم کی گئی ہے۔

جالبی صاحب نے کئی کتابوں کی ترتیب و تدوین بھی کی ہے جن میں 'دیوانِ حسن شوقی'، 'دیوانِ نصرتی'، 'بزم خوش نفساں'، 'ن۔م۔راشد'، 'کلیاتِ میراجی'، 'میراجی: ایک مطالعہ'، 'قدیم اردو لغت'، 'قومی انگریزی لغت' اہم ہیں۔ مؤخر الذکر دو کتابیں ان کی بڑی مفید اور کارآمد ہیں۔ ''قدیم اردو لغت'' میں قریباً گیارہ ہزار قدیم اور متروک الفاظ، جو اردو کے قدیم ادب میں استعمال کیے گئے تھے، کا ذخیرہ مع سیاق وسباق اور مفاہیم وطرزِ ادا کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔

ترجمہ کی گئی کتابوں میں 'جانورستان'، 'ایلیٹ کے مضامین'، 'ارسطو سے ایلیٹ تک'، 'برصغیر میں اسلامی جدیدیت'، 'ہندو پاک میں اسلامی کلچر'، 'بوطیقا' شامل ہیں۔ 'ایلیٹ کے مضامین' میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے شخصی وادبی پہلوؤں کے بھرپور مطالعے کے ساتھ اس کے مضامین کے تراجم کئے ہیں اور 'ارسطو سے الیٹ تک' نامی کتاب میں مغرب کی دو ہزار سالہ تنقیدی فکر کو نہایت سلیقے سے ترجمہ وتعارف کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جالبی صاحب ترجے کے فن کو ایک مشکل کام تو مانتے ہیں تاہم وہ ترجمہ نگاری کے فن کو دو کلچروں کے وصل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا یہ اقتباس غور طلب ہے:۔

''ترجمہ کا کام یقیناً ایک مشکل کام ہے۔ اس میں مترجم مصنف کی شخصیت، فکر اور اسلوب سے بندھا ہوتا ہے۔ ایک طرف اس زبان کا کلچر جس کا ترجمہ کیا جارہا ہے اسے اپنی طرف کھینچتا ہے دوسری طرف اس زبان کا کلچر جس میں ترجمہ کیا جارہا ہے، اسے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مترجم کو دونوں کا وفادار رہنا پڑتا ہے۔ اس دوئی سے اسلوب کی سطح پر، خصوصیت کے ساتھ اس زبان کو فائدہ پہنچتا ہے جسمیں ترجمہ کیا جارہا ہے۔ اس زبان میں اسالیب کے بہت سے امکانات پیدا ہوجاتے ہیں۔ اسالیب کی یہ تبدیلی دراصل کلچر کی تبدیلی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

ایک زبان کا جملہ جب دوسری زبان میں جم کر ترجمہ ہوجائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ

''دو کلچروں'' کا وصل ہو گیا ہے۔'' (۲)

ادب اطفال پر 'حیرت ناک کہانیاں'، 'نہ ہوئی قرولی' اور 'بارہ کہانیاں' موجود ہیں۔ ملک و بیرون ملک کئی سیمیناروں میں شرکت کی ہے اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں اپنے ملک کی نمائندگی بھی کی۔ ان کے چند اہم خطبات میں سے 'محمد تقی میر' اور 'لکھنوی تہذیب کا نمائندہ شاعر قلندر بخش جرأت' اہم ہیں۔ کلچر، سماج اور تہذیبی اقدار و روایت پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ 'پاکستانی کلچر: قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ' اس موضوع پر لکھی گئی اہم کتابوں میں سے ایک ہے۔ غرض ہمارا یہ ادیب بنا تھکے میدانِ ادب پر ڈٹا رہا۔ لکھنے لکھانے کا عمل ان کے یہاں عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ بنا سوچے سمجھے قلم برداشتہ لکھتے رہے بلکہ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا اسے دلیلوں سے ثابت بھی کیا۔ لکھتے وقت تحقیقی عمل پر ان کا سارا زور صرف ہوتا ہے۔ وہ چھان پھٹک، کھنگالنے کے بعد ٹھوک بجا کر فیصلے صادر کرتے ہیں۔ تحقیق و تنقید اور ادب کے متعلق ان کے اپنے نظریات ہیں جن کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً اپنے مضامین میں کرتے رہے۔ ان کے مضامین کے مجموعے 'ادبی تحقیق'، 'نئی تنقید'، 'معاصر ادب'، 'تنقید اور تجزیہ' کے عنوانات سے شائع ہو چکے ہیں۔ ہم انہیں مضامین کے توسط سے ان کی چند تنقیدی و تحقیقی نظریات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ادب میں تخلیق، تحقیق اور تنقید کی بڑی اہمیت ہے۔ ہر بڑے ادب کے مدار پر یہ تینوں مختلف سیاروں کی مانند گردش کرتے رہتے ہیں۔ قربت کے باوجود بھی ان میں دوریاں برقرار رہتی ہیں اور پھر یہ بھی کہ ان میں لاکھ بُعد صحیح پھر بھی کہیں نہ کہیں ایک دوسرے کے ساتھ ان کا گزر ہوتا ہی ہے۔ ہر تخلیق تنقیدی شعور کے بغیر بے راہ روی اور بحران کا شکار ہو جاتی ہے اور بنا تحقیق کے تنقیدی رائے کچھ وقتوں تک مقبولیت کے آسمان پر چمک سکتی ہے لیکن دائم رہنے والی مقبولیت اس کے حصے میں نہیں آ سکتی کیونکہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب تحقیق کی بنیاد پر اس کی رائے کو غلط ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح تخلیق، تنقید اور تحقیق تینوں کے مابین گہرا ربط ہے اور وہ ان دیکھی ڈور سے ایک دوسرے سے بندھے ہوتے ہیں۔ جمیل جالبی اپنے نظریات کی تعمیر اسی بنیاد پر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک تخلیقی عمل تنقیدی شعور کے ساتھ ہی انجام پا سکتا ہے۔ ایک شاعر و ادیب جب اپنی تخلیق پیش کرتا ہے تو وہ اس کی تراش خراش میں ہمہ وقت لگا رہتا ہے اور اس کی اشاعت کی منزل تک وہ اسے نوک پلک سے درست کرنے میں لگا رہتا ہے۔ یہ تنقیدی شعور کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ بڑا تخلیقی ادب بنا تنقیدی شعور کے بحرانیت کا شکار ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ایک

نقاد تخلیق کو اس انداز سے پرکھتا ہے کہ اس کی قدر و قیمت متعین کی جا سکے۔ اس طرح تنقید نظامِ خیال کی تشکیلِ نو کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ تخلیق و تنقید کے اس رشتے کی وضاحت جمیل جالبی اس انداز سے کرتے ہیں:۔

''اگر کسی شاعر یا ادیب کی تخلیقات کا مطالعہ کرنا ہے تو تنقید کا کام یہ ہے کہ وہ اسے اس کے اپنے دور میں اور ساتھ ساتھ اپنے دور میں رکھ کر دیکھے کہ اسنے تخلیقی سطح پر فکر و احساس اور اسالیب کی دنیا میں کیا کام کیا ہے؟ یہ تنقید کا ایک کام ہے۔ اس کے علاوہ تنقید کا کام یہ ہے اور یہ بنیادی کام ہے کہ وہ اپنے دور کے لئے نظامِ خیال کی تشکیلِ نو کرے۔ ہر دور میں مختلف تاریخی دھاروں کے بہاؤ کی وجہ سے جو فکری، سماجی، معاشی اور تاریخی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور جن کی وجہ سے کلچر بدلتا رہتا ہے، تنقید کا کام یہ ہے کہ وہ اس نظامِ خیال کو نئے سرے سے مرتب کرتی ہے تا کہ ایک طرف تغیر میں تسلسل باقی رہے اور دوسری طرف زندگی کے ہر شعبے میں تخلیق کا عمل جاری رہے''(۳)

جالبی صاحب نئی تنقید کے موجودہ رجحانات سے تھوڑے ناخوش ہیں۔ ان کی نظر میں اردو ادب میں جو تنقیدی عمل کیے گئے اس کے اصول اور ان کے درجات متعین کرنے کے پیمانے مغرب سے مستعار لیے گئے ہیں۔ انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ ہر بڑا ادب دوسری زبان کے ادب سے اثرات ضرور قبول کرتا ہے اس میں کوئی ضرر نہیں۔ ان اثرات کو شعور کی سطح پر قبول کیا جا سکتا ہے لیکن ہمارے یہاں آنکھ بند کر کے مغرب کی پیروی کرنے سے ادب بے اثر اور بے جان چیز بن گیا ہے۔ ہر اصول، ہر نظریات کی تشکیل میں مغربی رجحانات کو ترجیح دی جاتی ہے اس طرح اپنی مخصوص روایت اور تہذیبی ورثے کو نظر انداز کرنے کا رویہ عام ہوتا گیا جو آج بھی قائم ہے۔ انہیں نئی تنقید کی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہے۔ ان کے نزدیک ہماری تنقید اپنے مقصد و منشے سے بھٹک گئی ہے۔ بیشتر تحریریں یکسانیت کا شکار ہیں۔ بنا مطالعے اور تحقیق کے نقاد اپنی بے باک رائے دینے سے گریز نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک ہمارے یہاں مواد کی جو فراہمی ہوتی ہے وہ ذرائع ابلاغ کی مرہون ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات سے موصول مواد کو ''چلتے ہوئے فقروں کے جادو سے ادب کا طلسم خانہ آباد'' کرنے کا نام دیتے ہیں اور ادبی رسائل میں موجود تحریروں سے انہیں ''کھٹی ڈکاروں کی بو'' آتی ہے۔ مزید برآں نفع و نقصان کی فکر، حصولِ زر کا پیمانہ، گروہ بندی، انگریزی الفاظ کا بے جا استعمال وغیرہ ہماری تنقید کو بے سمتی و بے

مقصدی کی راہ پر لے جا رہے ہیں۔اجتماعی زندگی میں پیدا شدہ انتشار اور بیماری کو اجاگر کرنا، اس کی تشخیص اور اس کے علاج کی دریافت کرنا، اپنی تاریخ اور روایت کے حوالے سے بنیاد کی تلاش اور نئے نظامِ خیال کی عمارت کی تعمیر کرنا وہ کام ہیں جو وہ تنقید سے امید کرتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ تنقید اس صورتِ حال کی وضاحت بار بار کر کے تخلیقی ذہنوں کو مثبت رجحانات ورویوں کو فروغ دے۔ان کے نزدیک نئی تنقید دو سطح پر کام کر سکتی ہے۔ایک فکر کی سطح پر اور دوسرے ادب کی سطح پر۔

آگے چل کر وہ نئی تنقید کے دائرۂ کار کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔وہ تنقیدی عمل کو محدود کرنے کے بجائے پوری زندگی پر محیط کرنے کے خواہشمند ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ تنقید کے ذریعہ سوالات کھڑے کیے جائیں اور ان سوالوں کے جواب کی تلاش میں سرگرداں رہا جائے۔وہ فرد و معاشرے میں تنقیدی روح کی بیداری کے خواہاں ہیں اور معاشرتی زندگی کو جبر وشقاکی سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔مزید عدم مساوات، منفی اقدار، طبقاتی فرق کے خلاف علم جہاد بلند کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی کہ وہ سائنس اور تکنیک کو اخلاق کا پابند اور ادب وفکر کا رشتہ زندگی سے جوڑنے کی وکالت کرتے ہیں۔وہ تنقید کرتے وقت واضح اسلوب اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور اچھی اور صاف ستھری نثر لکھنے اور ہر اصناف کی شمولیت پر زور دیتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو اردو کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔دوسری زبان کے الفاظ تبھی استعمال کیے جائیں جب اردو میں اس کے متبادل الفاظ موجود نہ ہوں۔

اپنے ایک مضمون ''نئی تنقید کے منصب'' میں وہ تنقید کی کئی شاخوں کا جائزہ لیتے ہوئے تنقید کے اصل منصب کو اجاگر کرتے ہیں۔وہ تنقید کے موجودہ صورتِ حال سے مطمئن نہیں۔اس صورتِ حال کو ان الفاظ میں اجاگر کرتے ہیں:۔

''ادبی نقاد سائنس داں، ماہرِ نفسیات، ماہرِ معاشیات، عمرانیات تو بن گیا۔اس نے تجربے اور توضیح کے نئے نئے طریقے بھی دریافت کر لیے ہیں لیکن تنقید ادبی نہیں رہی۔نہ صرف ادبی نہیں رہی بلکہ فلسفہ وفکر بھی اس کے دائرے سے خارج ہو گئے ہیں۔جدید علوم کے اثرات نئی تنقید میں انفرادی نقطۂ نظر تو ضرور پیدا کیا ہے لیکن ساتھ ساتھ مطالعۂ ادب میں یک رخا پن پیدا کر کے اسے مختلف ومتضاد خانوں میں تقسیم کر دیا ہے''۔(۴)

اس طرح وہ سماجی، نفسیاتی، جمالیاتی، تاثراتی، مارکسی اور سوانحی اقسامِ تنقید کے دائرۂ کار کا

مفصل جائزہ لے کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تنقید کی جتنی بھی قسمیں ہیں وہ بس کسی ایک پہلو سے ادب کا مطالعہ کرتی ہیں۔ادب میں ایک طرح کی وحدت اور اکائی ہوتی ہے جس میں تمام عوامل شامل ہوتے ہیں۔تنقید نہ صرف سماجی دستاویز ہی ہے اور نہ ہی محض دبی ہوئی خواہشوں کے اظہار کا نام۔ نہ تو اس میں محض اظہار کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور نہ ہی ذاتی و داخلی تاثرات ہی ہوتے ہیں اور نہ ادب پارے کی قدر و قیمت سوانحی حالات، زمانہ اور ماحول سے ہی متعین کی جاسکتی ہے۔کسی بھی ایک پہلو سے ادب پارے کا مطالعہ اسے محدود اور یک رخا بنا دیتا ہے اور ادب کے مطالعے کا دائرہ تنگ تر ہوتا چلا جاتا ہے۔اس کا حل وہ ان الفاظ میں تلاش کرتے ہیں:۔

''اس وقت تنقید کو ایک ایسے'' فطری امتزاج'' کی ضرورت ہے جو تنقید میں بیک وقت کئی سطحوں کو جذب کر کے اسے ایک وسیع تر متوازن صورت عطا کر دے۔یہی ''امتزاج'' نئی تنقید کا منصب ہے''۔(۵)

آگے چل کر وہ اس امتزاج کی تین سطحیں بھی متعین کرتے ہیں (۱) فلسفہ و فکر (۲) ادبی تاریخ اور (۳) کلچر۔ان کے مطابق فلسفہ سچائی کو سامنے لاتا ہے اور ادب اس سچائی کو محسوس کرا دیتا ہے۔فکر و فلسفے کے امتزاج سے تخلیقی و تنقیدی سطح پر نیا شعور پیدا ہوتا ہے۔ان کے مطابق بیسویں صدی سے قبل ادبی تخلیقات میں یہ امتزاج موجود تھا لیکن فکرِ مغرب کے زیرِ اثر یہ اکائی ٹوٹ گئی۔دوسری طرف ادبی تاریخ کی کئی سطحیں سامنے لائی جاسکتی ہیں مثلاً اپنے دور کی روح کا اظہار، مرکزی روایت، رجحانات، میلانات، تہذیبی، سماجی، سیاسی تبدیلیاں، عہد و معاشرے کے عروج و زوال کی داستان وغیرہ۔ یہاں وہ تنقید کا رشتہ تحقیق سے جوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔وہ اس کے ذریعہ ادوار کے تعین، تنقیدی شعور کے ساتھ جائزہ لے کر اصل حقیقت کا انکشاف، زبان کی تبدیلی، اثرات کی نشاندہی، گمنام ادیبوں کی دریافت، ادبی وغیر ادبی ماخذ سے مدد، ادب کی درجہ بندی وغیرہ پر زور دیتے ہیں۔اس ضمن میں وہ قدیم اور جدید دونوں ہی ادب کو یکساں اہمیت دیتے ہیں۔ یہاں وہ تاریخی سطح تک پہنچنے کیلئے نقاد کا ادب کے ابتداء سے لے کر موجودہ عہد تک کا مربوط مطالعہ کرنے، اس کی گہرائی میں اترنے اور اس کے سارے ذائقوں اور لطافتوں سے واقفیت اور مرکزی روایت کا شعور رکھنے کی امید کرتے ہیں۔آخر میں وہ کلچر کی سطح پر امتزاج کا جائزہ اس طرح لیتے ہیں:۔

''کلچر کی سطح پر تنقید میں بیک وقت سماجی، نفسیاتی، جمالیاتی، روایتی، فکری اور تخلیقی اقدار کا امتزاج ہوتا ہے اور ہوسکتا ہے۔ اس سے ادب اور ادب پارے کی وضاحت بھی ہوسکتی ہے اور قدر و قیمت اور مقام بھی متعین ہوسکتا ہے۔ کلچر پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے اور بڑا ادب بھی ساری زندگی کی روح کا اظہار کرتا ہے۔'' (۶)

اس طرح تنقید کو وسیع تناظر میں رکھنے کے حامی ہیں نہ کہ مختلف خانوں میں تقسیم کر کے اس کی اکائی و سالمیت کو مجروح کرنا چاہتے ہیں۔

دوسری طرف تحقیق کے متعلق بھی ان کے مضامین میں واضح خیالات سامنے آتے ہیں۔ تنقید کے ساتھ تحقیق کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے مطابق:۔

''تحقیق کے ذریعے کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد جو رائے قائم کی جائے گی اور جو لائحہ عمل مقرر کیا جائے گا وہ بھی صحیح و درست ہوگا۔ اس لئے زندہ معاشروں میں تحقیق کو وہی اہمیت دی جاتی ہے جو نوزائدہ مملکت کے نوزائدہ شاعر اپنی محبوبہ کو دیتے ہیں''۔ (۷)

غرض تحقیق کسی بھی زندہ معاشرے کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے۔ بنا تحقیق کسی بات کو تسلیم کرنا بے سمتی کی طرف قدم بڑھانے کے مترادف ہے۔ ان کے نزدیک سچ کو جھوٹ سے اور صحیح کو غلط سے الگ کرنے کا نام تحقیق ہے۔ تحقیق عملی زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہے۔ یہاں وہ چھوٹی چھوٹی مثالوں کے ذریعہ تحقیقی کی اہمیت کو دلنشیں کراتے ہیں۔ ایک جگہ وہ معروف نقاد پروفیسر احتشام کی مثال پیش کرتے ہیں۔ ان کے مطابق:۔

''ان (احتشام حسین) کی تحریروں کی بنیادی باتیں غلط اور نا درست مفروضات پر کھڑی نظر آتی ہیں۔ احتشام صاحب کا ایک مضمون ہے 'غالب کا تفکر اور اسکا پس منظر' جس میں غالب کی وسعتِ مطالعہ اور تاریخ سے گہری واقفیت کو غالب کے تفکر کی بنیاد بتایا گیا ہے اور غالب کے فارسی ترجمے کو جو مہر نیم روز کے نام سے مشہور ہے، ان کی وسعتِ مطالعہ اور تاریخ دانی کے ثبوت میں پیش کیا۔ اگر یہ باتلکھنے سے پہلے وہ تحقیق کی کسوٹی پر اسے پرکھ لیتے تو انہیں یہ مضمون لکھنے کی ضرورتہی باقی نہ رہتی اس لئے تاریخ یا اس کے مطالعے سے غالب کو سرے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ یہ بات واضح ہے کہ ''مہر نیم روز'' غالب کی تصنیف ہی نہیں بلکہ ترجمہ ہے جسے انہوں نے بادشاہِ وقت کے اصرار پر کیا تھا''(۸)

آ گے وہ ''نادراتِ غالب'' سے دو اقتباس درج کر کے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ غالب کا تاریخ دانی سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس طرح احتشام حسین نے غالب کے تفکر کی بنیاد کمزور اور بے معنی ہے اور اس سے جو نتائج نکلتے ہیں وہ بھی بے بنیاد، غیر ذمہ دار اور بے جان ہیں۔ اس پورے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ جمیل جالبی تحقیق کی بنیادی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ چلیے اسی تحقیقی نظر کے ساتھ ہم یہ پتا لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کیا سچ مچ احتشام حسین جیسے بڑے اور قابلِ اعتماد نقاد سے یہ بھول ہوئی ہے۔

سب سے پہلے ہم ''غالب کے خطوط'' سے یہ اقتباس پیش کرتے ہیں جو کہ غالب کے ایک خط مرقومہ ۱۰/اپریل ۱۸۵۳ء، بنام منشی نبی بخش کا حصہ ہے:۔

''کیسی تاریخ اور کیسی نقل۔ کیا فرماتے ہو۔ پہلے مجھ سے حقیقت تو پوچھ لیا کرو۔ اب سنیے ماجرا کیا ہے۔ جب ہمایوں کے حال تک پہچا تو میں نے اظہارِ حیلہ بلکہ بسبیل اظہارِ حقیقت واقعی حکیم صاحب کارفرما سے کہا کہ مجھ سے انتخاب حالات ممکن نہیں۔ آپ مدعا کتب سیر سے نکال کر زبانِ اردو میں ایک مسودہ اس کا لکھوا کر میرے پاس بھیجد یا کیجئے۔ میں اس کو فارسی کر کرتم کو دے دیا کروں گا۔ انہوں نے اس کو قبول کر ابتدائے آفرینش عالمِ ظہور آدم سے میرے پاس مسودہ بھیجا تو گویا اب ایک اور کتاب لکھنی پڑی۔ میں نے اس کا چھوٹا سا دیباچہ لکھ کر ایک اور ہی انداز کی عبارت میں لکھنا شروع کیا۔ آدم سے چنگیز خان تک انہوں نے مسودہ بھیجا۔ میں نے اپنے طور پر لکھا اور مسودہ حوالے کیا۔'' (۹)

اس سے قبل ۱۹/نومبر ۱۸۵۲ء کو منشی نبی بخش حقیر کو لکھے خط میں ہی وہ اپنی تاریخ دانی وسیاحت سے بے گانگی کا اظہار کرتے ہیں اور ساتھ ہی اقرار کرتے ہیں کہ ان کے پاس کوئی کتاب نہیں، محض بھیجے گئے خلاصۂ حالات پر ہی اکتفا کیا اور اسے فارسی کے حوالے کر دیا۔ اس مطالعے کے بعد جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا کہ غالب کو اپنی فارسی دانی دکھانی منظور تھی نہ کہ تاریخ دانی اب جب ہم سید احتشام حسین کے بیان پر نگاہ ڈالتے ہیں تو کم وبیش وہ بھی اسی طرح کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں کہ:۔

''مہر نیم روز ایک تحقیقی کتاب کی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ سو صفحوں میں ہزاروں سال کی تاریخ لکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ان کتابوں کی بنیاد پر غالب کو مورخ نہیں کہا جاسکتا۔ تاہم اس سے غالب کی واقفیت، وسعتِ مطالعہ اور نکتہ رسی کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ وہ زندگی کے تسلسل کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ قیامت کے بعد ایک نئے آدم کے ظہور کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں غالب نے

اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس کتاب میں میں وہ لکھ رہا ہوں جو مجھے مختلف ذرائع سے ملا ہے۔ کہیں کہیں اپنی دیدہ و دریافت سے بھی کام لیا ہے۔ یہاں غالب کا وسیع مطالعہ کام آیا ہے۔ انہوں نے تاریخی تحقیق کا فرض انجام نہیں دیا ہے لیکن آغاز آفرینش سے ان دو عقیدوں کو بڑی دلکشی سے پیش کیا ہے۔ جس سے ہندوستان کے علماء واقف تھے۔''(۱۰)

اس اقتباس کے مطالعے سے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ احتشام حسین کی واقفیت جمیل جالبی سے کسی طور کم ہے۔ احتشام حسین کے کسی بھی بیان سے اظہار نہیں ہوتا کہ انہوں نے غالب کے تفکر کی بنیاد ان کی تاریخ دانی پر قائم کی ہو بلکہ وہ اس کا انکار ہی کرتے نظر آتے ہیں۔ البتہ ان کے وسیع مطالعے کی جو بنیاد وہ ابتدائے آفرینش کے عقیدے پر قائم کرتے ہیں وہ مستعار لیے گئے ہیں۔ جیسا کہ ہمیں غالب کے ہی بیان میں مل جاتا ہے کہ انہوں نے بھیجے گئے اردو مسودوں کی بنیاد پر آدم سے لے کر چنگیز خان تک کی تاریخ لکھی ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ہم غالب سے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ انہوں نے لفظ بہ لفظ ترجمے پر قناعت نہ کیا ہو اور اپنے مطالعے کو بھی کام میں لایا ہو جیسا کہ احتشام حسین بیان کرتے ہیں۔ الغرض جمیل جالبی کی یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے کہ تنقید کے لئے بھی تحقیق کی ضرورت ہے اور یہی بات خود ان پر بھی واجب آتی ہے کہ وہ کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے اصل خیال تک رسائی حاصل کرلیں کیونکہ احتشام حسین کی مذکورہ باتیں بھی تحقیق سے مبرا نہیں ہیں۔

یہاں جمیل جالبی ایزرا پاؤنڈ کے حوالے سے ''اسکالر کریٹک'' کی ایک ترکیب پیش کرتے ہیں۔ اس ترکیب کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک اچھے نقاد کے اندر تحقیقی جذبہ اور ایک اعلیٰ پایہ کے تحقیقی عمل کے لئے تنقیدی شعور کا ہونا لازمی ہے۔ دونوں کا مقصد ادب کی درجہ بندی اور اقدار کا تعین ہے۔ لہٰذا دونوں کے تال میل سے ادب کے لئے نئی راہیں اور نئے امکانات روشن ہو سکتے ہیں۔ تحقیقی کام کی انجام دہی کے لئے وہ مطالعے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایک اچھا محقق ہونے کیلئے ہر طرح کے علوم، خواہ نفسیات، فلسفہ، عمرانیات ہوں خواہ علمِ زبان، لسانیات اور کلچر ہوں۔ اس کے علاوہ ادبی اور غیر ادبی ہر طرح کی تحریروں سے استفادہ اور غیر زبان کی تحریریں بھی مطالعے میں رہنی چاہیئے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

''نثر میں اچھا افسانہ لکھنا مشکل کام ہے لیکن اچھا تحقیقی و تنقیدی کام کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل

کام ہے۔''(۱۱)

موصوف کا ماننا ہے کہ مصنف کا اپنا زاویہ اور نقطۂ نظر، وہ بنیادی چیزیں ہیں جو اس کی تحریر کو وقعت اور انفرادیت عطا کرتے ہیں۔ اسی طرح تحقیق وتنقید کے تعلق سے ان کا یہ اقتباس بھی دیکھتے چلیں:۔

''تحقیق کو تنقید سے الگ کرنے سے ہمارے ہاں تنقید میں بے شمار غلطیاں درآئی ہیں اور مطالعہ ادب کو مشکوک بنا دیا ہے۔ تحقیق تنقید کی مدد کرتی ہے اور تنقید کیمطالعے کو بنیادیں فراہم کرتی ہیں۔۔۔۔۔ محقق ونقاد ایک دوسرے کے حریف نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ بہترین صورت تو یہ ہے کہ محقق ونقاد دونوں ایک ہی ذات میں جمع ہو جائیں۔ نئی تنقید ان دونوں کے امتزاج سے وجود میں آسکتی ہے''۔(۱۲)

اس بیان سے تحقیق وتنقید کے متعلق ان کا مطمع نظر واضح ہوجاتا ہے۔ وہ تحقیق وتنقید کے باہم اشتراک پر زور دیتے ہیں اور اپنی بات کو مدلل انداز میں پیش کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ تنقید کو فکر سے عاری نہیں سمجھتے بلکہ زندگی کے مسائل کا ادب کے تعلق سے سمجھنے پر زور دیتے ہیں۔ تحقیق وتنقید کے متعلق ان کے جتنے بھی نظریات ہیں ان کی تخلیقات میں کم وبیش تمام ہی موجود ہیں۔ اب ان کے ذہن وفکر اور ادب کے تعلق سے ان کے مختلف نظریات وترجیحات کو سمجھنے کے لئے ہمیں ان کے چند اور مضامین سے مدد لینی ہوگی۔ اپنے دو مضامین ''ادب اور مابعد لا ادب'' اور ''نیا ادب اور تہذیبی اکائی'' میں وہ ادب کو اس کے سیاق وسباق کے ساتھ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ادب کو اپنے معاشرے اور اپنی تہذیبی تاریخ کا روح قرار دیتے ہیں۔ زندہ ادب اپنے تہذیبی رویوں، اپنی اقدار وروایت اور اپنے معاشرتی مسائل سے منہ موڑنے کے بعد تخلیق ہی نہیں پاسکتا۔ انسان ترقی کے کتنے ہی زینے چڑھ لے لیکن ان کی بنیاد میں ان کی اپنی تہذیبی روایات موجود ہوتی ہیں جو انہیں ثابت قدم رہنے میں مدد دیتی ہیں۔ لیکن جب ان تہذیبی روح کو بھلا کر محض مغرب کی پیروی کو اپنا وطیرۂ خاص بنا لیا جائے تو ایسے دور میں ان ادبی تخلیقات کا بھی دم گھٹ جائے گا۔ جمیل جالبی کو اس بات کا شدت سے احساس ہے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ:۔

''ہماری تہذیب اور اس تہذیب کا نظامِ خیال بے جان اور منجمد ہو رہا ہے اور ہمارے تہذیبی

ادارے اوران کی روح ہماری معاشرتی ، مادی ، ذہنی ، روحانی خواہشات کو آسودہ کرنے اور ہم آہنگ رکھنے کی قوت سے عاری ہو چکے ہیں''۔(۱۳)

صنعتی ترقی کے بعد مغرب میں ایک نئے نظامِ خیال کا ظہور ہوا جسے روشن خیالی کے نام سے متصور کیا گیا۔ یہ روشن خیالی سائنسی ایجادات کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اورانہیں سائنسی ایجادات نے انسانی زندگی کو جہاں ایک طرف کئی آسانیاں فراہم کیں وہیں دوسری طرف پرانی تہذیبی اقدار میں تبدیلیاں لانی بھی شروع کر دیں۔ گاؤں کا زرعی طرزِ معاشرت، شہروں کے صنعتی وتجارتی مراکز میں تبدیل ہونے لگا اور ہر شعبۂ حیات اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور ساتھ ساتھ اس روشن خیالی نے انسانی ذہن وشعور کو بھی متاثر کیا اور وہ اپنے اسلاف کے کہنہ خیالی ، مذہبی تعصب ، مافوق الفطری عناصر اور سماجی ناانصافی ونابرابری پر بھی سوالیہ نشان کھڑا کرنے لگا۔ اس طرح نئے خیالات اور مذہبی اقدار وروایت کا ٹکراؤ شروع ہو گیا اور معقولیت ، سائنس ، منطق ، عقلیت ، معروضیت کے سبب جدید وقدیم کی رشہ کشی شروع ہوگئی اور یہی رشہ کشی موجودہ تہذیبی تعطل کا سبب بنی۔ اس طرح مشرقی تہذیب کی روحانیت ، احساسِ جمال ، اپنی ذات کو خدا کی ذات میں ضم کرنے کا روحانی عمل بھی متاثر ہونے لگے اور زمانہ روز بروز انقلابی سرگرمیوں کی زد میں آتا چلا گیا۔ مغربی فکر کی ایک خواہش یہ بھی جھلکتی ہے کہ وہ تمام مشرقی خیالات کو جذب کر کے ''نئی عالمگیر تہذیب کا ہیکل'' ، تعمیر کرنا چاہتی ہے لیکن اس گمان میں اس سے یہ چوک ہو جاتی ہے کہ:۔

''سائنسی آدرشوں کا افق انسان کی معاشرتی زندگی کے اندر مقید ہے، لیکن انسانی روح ان حدود کی بندش سے آزاد ہے''۔(۱۴)

اس طرح جب کبھی بھی مسلسل تہذیبی بدلاؤ کے انجماد کے بعد اصلاحات کا دور آیا تو ''خود مصلح بار بار اس امر کا اعادہ کرتا ہے کہ وہ اس اصلاح کے ذریعہ معاشرے کو بھی قدیم اور حقیقی روپ کی طرف لے جا رہا ہے۔ تاکہ وہ پھر سے زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھ سکے''۔ (۱۵) یہاں وہ کئی تہذیبی اکائیوں مثلاً ایرانی ، روسی ، چینی اور برِصغیر کے بھگتی تحریک اور ہندو ومسلمان کے تہذیب ، کو پیش کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مذکورہ تہذیبیں خود پر غالب آنے والے نئے ''نظامِ خیال کو اپنے مخصوص طرزِ احساس سے ہٹ کر قبول نہیں کر سکتیں۔ وہ کسی نئے نظامِ خیال کو اسی حد تک اور اسی شکل میں قبول کرتی ہیں جو اس کے اپنے طرزِ احساس سے مختلف ہوتے ہوئے بھی اس سے مطابقت رکھنے کی صلاحیت رکھتا

ہو'(۱۶) یہاں وہ مشرق و مغرب کا تجزیہ کرتے ہوئے دونوں کی اصلی شناخت کو ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں:۔

''مختصر یہ کہ مشرق و مغرب کا بنیادی فرق یہی ہے کہ مغرب کا کلچر اپنے ظاہری اور باطنی روپ میں ہر دم تبدیلی کو ترجیح دیتا ہے اور مشرق کا کلچر عقائد اور اقدار کو مستقل اور قائم بالذات سمجھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مشرق نے بحیثیت مجموعی مغرب کی اشیاء وغیرہ کا غلاف تو ضرور چڑھا لی ہے لیکن مزاجاً وہ ایک دوسرے کی طرف پیٹھ موڑے مختلف سمتوں میں دیکھ رہے ہیں''۔(۱۷)

اسلامی نظامِ خیال کو ایرانی طرزِ احساس نے اتنا ہی قبول کیا جتنی کہ ضرورت تھی باقی اسلامی خیالات کو ایرانی تہذیب کے ساتھ ضم کر کے عجمیوں کو عربوں پر فوقیت دلائی۔اسی طرح روسی تہذیب بھی کئی مرتبہ بدلاؤ کی زد میں آئی مثلاً اسکینڈ نیوین تہذیب کا اثر پڑا، پھر بازنطینی تہذیب اور پھر مغرب کی تہذیب سبھوں نے وقفے وقفے سے ایک غالب طاقت کی حیثیت سے روس پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی جبکہ مخصوص روسی طرزِ احساس نے اسے دوبارہ سے اپنی روایت کی طرف لوٹ آنے میں رہنمائی کی۔ آگے چل کر جب روسی نظامِ خیال نے ''مارکسزم'' کے روپ میں چین کو اپنی رو میں شامل کرنا چاہا تو یہاں بھی چینیوں نے اپنے مخصوص طرزِ احساس کو فنا ہونے نہیں دیا۔یہی حال بھگتی تحریک کا بھی رہا اور برِ صغیر ہند میں متواتر کے ساتھ کئی نئے فکری خیالوں نے اس کی تہذیب کو متبدل کرنے کی کوشش کی اور آج تک یہ تہذیبی طرزِ اظہار ہر دم بدلتی زندگی کے نئے نئے تقاضوں کی تکمیل کی کوشش میں منہمک ہے اور یہی مسئلہ ادب کا بھی ہے۔ادب چونکہ اپنی تہذیب و معاشرے، اقدار و روایت، عہد و ایمان، مسائل و مقاصد اور کئی اہم تقاضوں کے اظہار کا وسیلہ ہے، اسی تہذیبی دوئی کے درمیان کھڑا ''اندرونی طور پر ڈھا دینے والی کرب''میں مبتلا نظر آتا ہے۔ادب میں بھی قوتِ ارادی و ضمیری خود آگاہی کا فقدان نظر آتا ہے۔جمیل جالبی کو اپنے عہد کے ادبی رجحانات سے تشفی ہرگز نہیں۔وہ ادراکِ روحانی کو عصری صداقتوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے خواہشمند ہیں اور پھر وہ نئے ادب کے وجود میں آنے کی توضیح اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

''جب ادبی کلچر اور زندہ ادبی روایت ہی قائم نہ رہی ہو تو اس وقت ادیب اور اہلِ فکر کا سب سے اہم کام یہ ہو جاتا ہے کہ ادب کو خود ادب سے ماوراء کر دے۔اپنے بنیادی تہذیبی مسائل، انسان، معاشرہ اور کائنات کے رشتوں پر از سرِ نو غور کرے اور یہ مسائل یقیناً ادب کے نہیں ہیں۔مابعد الادب کے

کے مسائل ہیں۔اس وقت ہمیں ادب سے بالا اور بعد کے سوالوں کے جواب دینے ہیں تا کہ مابعد الادب کی مدد سے ہم زندگی کو نئے معنی دے سکیں اور تہذیبی تعطل کا حل تلاش کر سکیں۔ نیا ادب مابعد الادب کی کوکھ سے ہی جنم لے گا''۔ (۱۸)

اپنے مضمون ''نیا ادب اور تہذیبی اکائی'' میں اپنے دور کی ادبی تخلیقات اور ادیبوں کے رویوں سے پرملال نظر آتے ہیں۔ادب میں پیش کی جانے والی تخلیقات کی بے معنویت، خیال وعمل کی بے ربطی، زوال پذیر معاشرہ اور اسکے انتشار کی عکاسی، رشتوں کے بکھراؤ۔مثبت اخلاق واقدار کی کمی، کھوکھلے نظامِ خیال کی پیروی، جمی جمائی اقدار میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل، خیالات وعقائد کا بے معنی اور دوراز کار رفتہ ہونا وغیرہ نے انہیں بری طرح سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔انہیں ادیبوں کا سستی شہرت کے لئے ادب کا استعمال کرنا گراں گزرتا۔ادب میں سنجیدہ مسائل کی پیشکش کی جگہ ادبی سیاست کی کارفرمائی اور سستے ادبی ذوق کی تسکین کے سامان کی فراہمی پر انہوں نے اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے۔موصوف فرماتے ہیں:۔

''جب میں عہدِ حاضر کے اردو ادب اور ادیبوں کا خیال کرتا ہوں تو معاً مجھے اس بڑے سے غبارے کا دھیان آتا ہے جس کی ہوا نکل گئی ہو اور وہ میلی کچیلی دھجی کی مانند کسی بچے کے ہاتھ میں لٹک رہا ہو۔اب اس غبارے کا استعمال صرف یہ ہے کہ بچے اپنے منہ سے چھوٹے چھوٹے غبارے بنائیں اور ہاتھ پر رکھ کر پٹاخ سے پھوڑیں تا کہ گھر والے چونک جائیں اور بچے مزا لیں۔گزشتہ چار پانچ سال سے اردو ادب کے ادیب یہی کھیل کھیل رہے ہیں۔اردو ادب کو دیکھئے تو فقرہ بازی کی ہوا سے ننھے ننھے غبارے بنا کر پٹاخ پٹاخ کی آواز سے سنسنی پھیلائی جا رہی ہے اور اس عمل کو نئے ادب کا نام دیا جا رہا ہے۔ادب سے سنجیدگی غائب ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اردو ادیبوں کے سامنے فکر و ادب کا کوئی سنجیدہ مسئلہ باقی نہیں رہا۔ادیب کو آج یہ معلوم نہیں کہ وہ کس کے لئے لکھ رہا ہے اور کیا لکھ رہا ہے''۔ (۱۹)

یہ ایک عام سا نظریہ ہے کہ جب بھی سماج ومعاشرہ انتشار، افراتفری، تنزلی اور زوال پزیری کی طرف مائل ہوتا ہے، ادبی رویے بھی انحطاط اور زوال کا شکار ہو جاتے ہیں، جیسا کہ مصنف کے زمانے کے حالات اور ادبی ترجیحات کا حال رہا ہے لیکن مصنف اس خیال کی تردید کرتے ہوئے میرؔ وسوداؔ کے دورِ انحطاط اور زوال پزیر معاشرے میں پیدا ہونے والے اعلیٰ ادب کی مثال پیش کرتے ہیں۔میر وسودا کا

عہد ایسا پر انتشار تھا کہ ہر طرف مچی لوٹ مار، سیاسی خلفشار، قدروں کی پامالی، اخلاقی گراوٹ، حکمرانوں کی بے عملی کے سبب کسی بھی ذی روح کا سکون سے سانس لینا محال تھا جبکہ ایسے پر آشوب ماحول میں بھی ادب نے خوب ترقی کی اور آج جب اردو ادب کی تاریخ لکھی جاتی ہے تو اس دور کو اردو شعر و ادب کے عہدِ زریں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آخر اس عہد کے زوال پزیر معاشرے اور موجودہ عہد کے تضاد و بحران کے شکار معاشرے میں کیا فرق ہے کہ ادب بے سمتی و تنزلی کا شکار ہے۔ اس کا جواب جمیل جالبی یوں دیتے ہیں کہ میر و سودا کا عہد بھلے ہی انتشار اور زوال آمادہ ہو لیکن اس عہد کے تہذیب اور کلچر کی بنیادیں جن تہذیبی اداروں پر قائم تھیں وہ کسی بھی اثر اور انقلابِ زمانہ کی زد میں نہ آسکیں۔ جبکہ اس کلچر کے خارجی ڈھانچے اور مروجہ اقدار پر لوگوں کا ایمان باقی رہا۔ جبکہ موجودہ عہد کے معاشرے میں یہی روایتی تہذیبی ادارے دم توڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تہذیبی سطح پر یہ بدلاؤ سائنسی برکات کے رہین منت ہیں۔ اس انقلاب نے زمانے کو ذہنی، جسمانی، سماجی، تہذیبی، معاشی ہر سطح پر تغیر سے آشنا کیا۔ اس طرح اس عہد کا ادب بھی ان متواتر بدلاؤ اور انقلاب کے سبب بحران، انتشار اور تضاد کا شکار ہو گیا۔ غرض نئے ادب سے جمیل جالبی کو جو امیدیں وابستہ تھیں ان کا لب لباب یہ ہے کہ:۔

''آج اردو ادب کو ہرکاروں اور گورکنوں کے بجائے جری سورماؤں کی ضرورت ہے۔ ایسے جری سرما جو زندہ رہ کر موت کا تجربہ کرنا جانتے ہوں۔ جو میر یا اقبال کی ڈیڑھ درجن خصوصیات گنوانے، روایتی انداز میں غزلیں نظمیں کہنے یا بندھے ٹکے موضوعات پر افسانے، ناول لکھنے کے بجائے عہدِ حاضر کے مسائل پر سوچنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ جو عہدِ حاضر کے طوفانی دھاروں، اور ہلکی ہلکی پھواڑوں دونوں سے باخبر ہوں۔ جو روایت کو اپنا کر توڑنے کی تو تبھی رکھتے ہوں۔ جو معاشرے کو فکری مسائل میں شریک کر کے اسے تبدیلی کا نیا شعور دینے کا حوصلہ بھی رکھتے ہوں اور شاید عہدِ حاضر کے اردو ادب اور ادیبوں کا یہی سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔''(۲۰)

اپنے مضمون ''جدیدیت کیا ہے'' میں وہ جدیدیت کو اپنے فکری رویے کے مطابق پیش کرتے ہیں۔ ان کے مطابق جدیدیت کو محض ایک دور میں باندھا نہیں جا سکتا اور اس کے آغاز اور گزرگاہوں کے بیان تک ہی محدود کر دینا جدیدیت کے صحیح مفہوم کو واضح کرنے میں معاون و مددگار نہیں ہوتے۔ موصوف کے الفاظ میں:۔

''میں محض تلخی، جھلاہٹ، اداسی اور اکیلے پن کے اظہار کو جدیدیت نہیں سمجھتا۔ جدیدیت ایک اضافی چیز ہے۔ وہ چیز جس کا تعلق کسی لمحہ، کسی خاص زمانے یا دور سے ہوگا وہ اضافی ہوگا۔ مطلق نہیں۔۔۔۔۔۔آج کی جدیدیت کل پرانی ہوجائے گی''۔ (۲۱)

جمیل جالبی کے نظامِ خیال کے مطابق ہر عہد کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں جن کے پیشِ نظر ان کے معیار اور پیمانے مقرر کیے جاتے ہیں۔ جن کے ذریعے اپنے عہد اور ماضی کے ادب پاروں کو پرکھا جاتا ہے۔ ایک عہد کا پیمانہ دوسرے عہد میں آ کر الگ طرز اور انداز کا حامل ہوجاتا ہے۔ اس طرح ''فکر کی سطح پر دھوپ چھاؤں کا یہ کھیل ہمیشہ جاری رہتا ہے۔'' اس کے بعد وہ سرسید، ٹیگور، ترقی پسند، آزادی کے بعد سے لے کر اپنے عہد تک کے ادب کے امثال کے ذریعے یہ واضح کرتے ہیں کہ کس طرح ہر عہد کی ادبی تخلیقات اپنے دور میں اپنے سے ماقبل کے ادب پاروں سے جدید تھیں اور مغرب کے اثر سے نئے نئے بدلاؤ کو اپنی جلو میں لے کر اٹھیں تھیں لیکن اس زمانے میں انہیں جدید ہونے کے باوجود لفظ ''جدیدیت'' کے ذیل میں شامل نہیں کیا گیا۔ غرض جمیل جالبی جدیدیت کی تعریف مختصراً ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

''جدیدیت صنعتی معاشرے کے ہر دم بدلنے والے مزاج کا منطقی نتیجہ ہے''۔ (۲۲)

اس طرح جب جب معاشرے میں کوئی نیا بدلاؤ آئے گا معاشرہ جدید تر ہوتا چلا جائے گا۔ انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ ہندوستانی معاشرے میں فکری، فنی، تہذیبی اور ادبی سطح پر جو بھی تبدیلیاں یا پھر انقلاب رونما ہوئے وہ تمام تر مغرب کی دین ہیں۔ وہ جدیدیت کو ایک رویہ، ایک اندازِ فکر کا نام دیتے ہیں جو مغرب کے نظامِ خیال اور سائنسی اندازِ فکر پر قائم ہے۔ جبکہ وہ جدیدیت کا تعلق ماضی سے بھی قائم کرتے ہیں کہ:۔

''زندہ اور تخلیقی جدیدیت سائنسی اندازِ نظر کی ہمراہی میں تاریخی شعور کی کوکھ سے پیدا ہوگی۔''

(۲۳)

اس طرح جالبی صاحب تاریخی شعور کے ساتھ روایت و احساس کے گہرے شعور پر بھی زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

''اصل فن کار وہ ہے جس کا تاریخی شعور زندہ ہو اور جو یہ جانتا ہو کہ جس طرح ماضی حال کو

متعین کرتا ہے اسی طرح حال ماضی کو بدلتا رہتا ہے''۔ (۲۴)

اپنی روایت سے انحراف کو جدیدیت کا دشمن خیال کرتے ہیں کہ:۔

''ہماری تمام جدید اقدار، جدید اندازِ نظر، نظامِ خیال، ادارے، رسوم و رواج، جدید لباس، مسلّم حقائق اور اصول جنہیں ہم مانتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں سب کے سب خلا میں پیدا نہیں ہوئے اور یہ سب کے سب صرف محض جدید دور کی پیداوار بھی نہیں ہیں۔ ان میں ہماری روایت کی روح تحلیل ہو کر نئے معنی پیدا کر رہی ہے۔ اس لئے اگر جدیدیت کے معنی ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہر نقشِ کہن کو مٹایا جائے، ہر روایت کو جلا دیا جائے تو ہم تخلیقی وفکری سطح پر صرف ہوا میں گرہ لگانے کی کوشش کریں گے۔ جس کا نتیجہ وہی اکیلاپن، وہی تلخی وہی اداسی، وہی ذہنی پسپائیت اور وہی فرار ہوگا، جس سے آج ہمارے ادب کی جدیدیت دوچار ہے''۔ (۲۵)

اس نظریے کے تحت وہ اپنے کلچر، تاریخ اور معاشرے کو ایک اکائی کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ جدیدیت کے متعلق کچھ مسائل کو بھی انہوں نے بیان کیا ہے تا کہ نئے ادب کو پیش کرنے میں سنبھلی ہوئی اندازِ نظر کو فروغ دیا جا سکے۔ جدیدیت کو محض کلچر کے زوال، انحطاط اور سماجی اور تہذیبی تعطل وانتشار کی علامت سمجھا جاتا ہے یا پھر نظامِ خیال کے دم توڑنے، پرانے تہذیبی سانچے اور طرزِ احساس کی نفی، تہذیبی رشتوں کے بکھراؤ، قدروں کے ٹوٹنے بکھرنے اور تعلیم یافتہ طبقے اور عوام کے درمیان کی خلیج کو جدیدیت سمجھنے کا رویہ عام ہے۔ مزید یہ بھی کہ اقدار وخیال کا وہ صحت مند نظام اب باقی نہیں جن پر اعلیٰ پایہ کے ادب کی بنیاد ہو بلکہ معاشرہ خود کو بدلنے کے کرب میں اسقدر مبتلا ہے کہ ادب کے لئے روحانی تجربہ حاصل کرنا محال ہے۔ دوسری طرف نئے نظام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ:۔

''ایک طرف مغرب کا کلچر سائنس کی ترقی کے ساتھ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کو ہمارے نظامِ خیال کے تہذیبی دائرے سے باہر کھینچ رہا ہے اور دوسری طرف اس دائرے کی مرکزی کشش اسے اپنے اندر کی طرف کھینچ رہی ہے۔ اس لئے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ معطل کھڑا ہے اور سارا سماجی انتشار، تضاد، کشمکش، تصادم، بے یقینی اور عدم توازن کا شکار ہے''۔ (۲۶)

آگے چل کر وہ اس مسئلے کا حل ان دو دائروں کے ملاپ سے ایک نئے دائرے کی تشکیل میں ڈھونڈتے ہیں۔ اس طرح سے کہ:۔

''تاریخ کی نئی تعبیر اور نئے تاریخی شعور کے ذریعہ ہم ایک ایسے دائرے کی تشکیل کر سکتے ہیں جس کا سنگم مغرب اور ہمارے اپنے کلچر کے گہرے اور وسیع ادراک پر قائم ہوگی۔ یہی سنگم ہمارا بعادِ رابع (Forth Dimension) ہے''۔ (۲۷)

اپنے مضمون ''جدید اردو نثر کا مسئلہ'' میں بھی وہ نثر میں مغرب کی بے جا پیروی کو اجاگر کر کے اردو نثر کی کئی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ موصوف کے مطابق موجودہ عہد میں نثر لکھتے وقت ادیبوں کے جو رجحانات ہوتے ہیں ان میں خیال کی اہمیت اور بیان کے روایتی انداز سے غفلت برتی جاتی ہے اور نتیجہ اظہار کے سلیقے سے بے نیازی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ موصوف کے مطابق ادباء لکھتے تو اردو میں ہیں لیکن ان کے مطالعے کا مرکز و محور انگریزی کتابیں ہوتی ہیں جن کے سبب ''جملوں کی ساخت، بندشوں، فقروں کا لہجہ، جملۂ معترضہ اور فاعل، فعل، مفعول کی ترتیب بھی متاثر'' ہوتے ہیں۔ اس طرح ادیب جب کسی غیر زبان کی کتاب کا ترجمہ اپنی زبان یعنی کہ اردو میں کرتا ہے تو نامانوس بندشوں اور بعید از فہم تراکیب سے نثر کو بوجھل بنا دیتا ہے جبکہ ترجمہ کرتے وقت مصنف کو بڑی محنت کے بعد نئے خیالات کو اپنی زبان کا حصہ بنانا پڑتا ہے۔ اس طرح لکھنے والے کو بدیسی زبان و ادب کا مطالعہ اس طرح کرنی چاہیے کہ وہ الفاظ اس کے شعور و ادراک کا حصہ بن جائیں اور وہ آسانی کے ساتھ ان خیالات کو اپنی زبان میں پیش کر سکے۔ اچھی نثر کے لئے لفظو کے نئے نئے رشتوں کی تلاش، عبارت آرائی کے بجائے فکر و خیال پر زور، خیال اور جذبے کا اتحاد، نئی لحن کی کھوج، سادہ اسلوب، پیش کش پر زور، انفرادیت، غیر مبہم انداز کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ مزید یہ بھی کہ وہ جدید نثر کو شاعری کے اثر سے باہر نکالنے کے خواہاں ہیں۔ ان کے مطابق نثر کو شاعرانہ رنگ دینے اور بے جا اشعار اور مصرعوں کے استعمال سے عبارت آرائی کا زور تو پیدا ہو جاتا ہے جبکہ فکر و خیال کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ وہ مفہوم کی ادائیگی کے لئے سامنے کے الفاظ کے استعمال کے بھی معترض ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایسے الفاظ تلاش کیے جائیں جو اظہار کے تقاضوں کو پورا کریں اور وہ ایک ہی لفظ کو کئی طریقے سے بیان کرنے کو اسلوب کی انفرادیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ انہیں جدید لکھنے والوں میں بیان کے مسلسل اظہار کا بھی فقدان نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

''اظہار کے مسئلے کو اگر سامنے رکھ کر جدید اردو نثر کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ہمارے ہاں عام طور پر لکھنے والوں کے ہاں بیان کا مسلسل اظہار نہیں ملتا۔ ایک پیراگراف کے مختلف جملوں کو

دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ خیال کا تسلسل ہر نئے جملے پر مجروح ہو رہا ہے۔ایک حصہ دوسرے حصے سے پیوست نہیں ہے۔ بات کو سامنے کے ایسے لفظوں سے جو، بغیر کسی کوشش کے ذہن میں آ گئے ہوں، ادا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ایک ہی بات کو بار بار دہرایا جا رہا ہے اور لفظوں کو اس طرح لٹایا جا رہا ہے جس طرح دلہن کے ڈولے پر اشرفیاں نچھاور کی جاتی ہیں۔ان باتوں کی مزید وضاحت کیلئے ضروری ہے کہ جدید اردو کی طبع زاد تحریروں اور ترجموں کو سامنے رکھ کر جملوں کی ساخت، لفظوں کے انتخاب و استعمال، خیال کے اظہار کے طریقوں، لہجوں کی تاثیر، اور زبان کی تبدیلی کے عمل کا مطالعہ کیا جائے تا کہ جدید اردو نثر اور اس کے اسالیب کے مسائل واضح ہو سکیں''۔ (۲۸)

''جدید افسانے کے رجحانات'' میں افسانہ نگاری کی روایت اور عروج کی داستان کو ابتداء سے لے کر عہد بہ عہد کی تبدیلیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے سنائی ہے۔ان کے نزدیک اتحادِ اثر افسانے کی روح ہے۔ وہ چاہے پریم چند یا پھر ترقی پسند ادب کی حقیقت پسندی ہو کہ نفسیاتی وسماجی نظریات کی واشگافی یا چاہے شعور کی رو اور علامتی اندازِ بیان ہو وحدتِ تاثر ان کے افسانے کے مجموعی تاثر کو ابھارنے کا ذریعہ ہے۔ایک اعلیٰ پایہ کے افسانے کی تخلیق میں وحدتِ تاثر نہایت ضروری ہے وہ عہد بہ عہد کے افسانوی ترجیحات کو پیش کرتے ہوئے افسانہ نگاری کے چند بنیادی مسائل کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔مثلاً وہ ادبی رسائل کی کمی پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہیں اور اخباروں میں پیش کیے جانے والے سستے ادب کو جس میں سنسنی خیزی، جرائم، فراریت، بیمار جذباتیت، جھوٹی روحانیت ہوتی ہے، فرضی واقعات کی کہانی پر مبنی قرار دیتے ہیں۔اس طرح ان دونوں مسائل کو افسانے کے نقصان سے تعبیر کرتے ہیں۔۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک کا جو مخصوص رجحان رہا وہ یہ ہے کہ اس دور میں نئے نئے تجربے کیے گئے اور قصہ پن اور فرضی واقعات کے بجائے علم پر مبنی دعوتِ فکر دینے والے واقعات کو ہی افسانوں میں جگہ دیا جاتا۔واقعیت، ریئلزم، نظریے کی اہمیت، اشتراکی ونفسیاتی، جنسی محرکات وتصورات کو افسانوں میں برتا جاتا جبکہ ۱۹۴۵ء کے بعد واقعت کی جگہ مافوق الفطری تخیلی اور جذباتی عناصر نے لے لی اور اپنے خیالات کو علامتی پیرائے میں واضح کرنے کا رجحان عام ہوا۔ پرانی اساطیری کہانیوں کو نئے مفہوم پہنانے کی سعی کی گئی اور افسانے میں اس قدر ابہام پیدا کیا جانے لگا جس سے افسانے اور شاعری کے درمیان حدِ فاصل مٹنے لگا۔وقتی اور عارضی سنسنی خیزی کا رواج عام ہوا۔ پھر تجریدی افسانے کا دور آیا جس میں تجریدی مصوری کی تکنیک

استعمال کی گئی لیکن اس کے ذریعے بے معنویت کے گہرے ابہام کی کہر افسانے پر چھا گئی اور بیمار رومانیت کے ماسوا کچھ بھی نظر نہ آتا جس سے حقیقی دنیا کے عکس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مزید افسانوں میں لمحوں کی کہانی سنانے، بنا ہیئت کے افسانے لکھنے کے بھی تجربات کیے گئے جو موصوف کی نظر میں محض خام تجربے ہی تھے۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ افسانے کی جان ''وحدتِ تاثر'' ان میں ضرور موجود تھا۔ ان افسانوں میں تذبذب، پریشانی، کرب تو ہے لیکن ان سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں اور یوں محسوس ہوتا جیسے ''افسانہ نگار اخلاقی طور پر بزدل، نفسیاتی طور پر مذبذب'' ہے ان میں ایک طرح کے تھکن کا احساس ہے جو زندگی کے مثبت پہلوؤں سے نظریں چرانے کا نتیجہ ہے۔ مزید وہ چٹکوں پر مبنی افسانوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جن میں زندگی کا کوئی تجربہ نہیں محض دل بہلانے کا ایک ذریعہ ہی تصور کرتے۔ ان تمام رجحانات کی پیشکش کے بعد وہ اردو افسانہ نگاری کے نئے امکانات سے مایوس بھی نہیں۔ فرماتے ہیں:۔

''افسانے کی ان سب جدید رجحانات کو دیکھ کر ہمیں اردو افسانے سے مایوس ہو جانا چاہئے تھا لیکن اس کوڑے میں کچھ ایسے پھول بھی کھلے ہیں جن میں رنگ و بو اور ہیئت کے مخصوص توازن کا شدت سے احساس ہے۔ ان میں تجربہ پہلی اور بنیادی شرط ہے۔ قصے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مختلف نظریات بھی حسبِ ضرورت استعمال میں آرہے ہیں۔ ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اردو افسانے میں اب تک جو تجربات ہوئے ہیں ان کو نئی مرکزیت حاصل ہو رہی ہے اور میرا خیال ہے کہ اب اردو افسانے کے ایک نئے دور کے آغاز میں بہت دیر نہیں ہے''۔ (۲۹)

غرض جمیل جالبی اپنے عہد کے مخصوص افسانوی رجحانات سے ناخوش ضرور ہیں، اور ہر طرح کی مسائل کو بڑے ہی بے لاگ انداز میں اجاگر بھی کیا ہے تا کہ ان مسائل کے حل تلاش کیے جا سکیں اور اردو افسانہ نگاری کے لئے ایک صحتمند رویہ اپنا جا سکے جو اس کی ترقی کی راہ میں معاون ہو۔ ساتھ ہی اردو افسانہ نگاری کے بہترین دور کی بشارت بھی دیتے ہیں کیونکہ ان کے عہد میں ہی علامتی حصار کو توڑ کر افسانہ نگاری کی نئی روایت کی داغ بیل ڈالی جا چکی تھی۔ وہ جدید علامتی افسانے کو ایک منفی رجحان کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ علامتی انداز ایک طرح کے ردِعمل کے طور پر نمایاں ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں سول حکومت کے خاتمے کے بعد جب ایوب خان کی حکومت قائم ہوئی تو اس نے اپنے دس سال کے دورانیہ میں خود کے وضع کیے گئے قوانین وضوابط پر عمل پیرا رہا۔ اظہار کی آزادی چھین لی گئی اور مارشل لا کا نفاذ عمل

میں لایا گیا۔اس طرح جدید افسانہ نگاروں نے اس کے ردِعمل میں حقیقت بیانی سے منہ موڑ کر علامتی انداز کو اپنایا اور معاشرتی مسائل کو اجاگر کرنے کے بجائے ذات کے عرفان کی طرف پیش قدمی کی۔اس طرح کے افسانوں کو پڑھ کر انہیں کوفت ہوتی ہے اور افسانہ کے پڑھنے سے:۔

''شدید بدہضمی سے پیدا ہونے والی کھٹی ڈکاروں کی بو دل و دماغ کو جلا دیتی ہے اور افسانہ مجذوب کی بر بن کر رہ جاتا ہے''۔(۳۰)

ان کے مطابق اگر غزل میں یہی علامتی انداز اپنائی جائے تو وہ ایک معمہ نہیں بلکہ اس سے اس کا حسن ،اور تہہ داری جھلکتی ہے جبکہ افسانے کا یہ انداز اس کے ابلاغ میں مسائل کھڑی کر دیتا ہے۔اس ابلاغ کے مسئلے کو انہوں نے تین نکات سے سمجھایا ہے۔اول اسے محض فیشن کے طور پر استعمال کیا گیا جس سے جدید افسانہ ذہنی و تخلیقی سطح پر بے سمتی کا شکار نظر آتا ہے۔دوم لکھنے والوں کے پاس نہ تو کوئی موضوع اور نہ ہی حقیقی مسائل کا شعور ہے اس طرح وہ احساسِ محرومی اور شکست خوردگی کو عرفانِ ذات کی تلاش کے پردے میں عیاں کرتے ہیں۔سوم انہیں خود ہی ابلاغ کا شعور نہیں کہ کس انداز سے وہ اپنی بات قاری تک پہنچائے۔ان کے یہاں ایک طرح کی بے ربطی ہے،انداز ذہنوں کو جھٹکے دینے کا سا ہے اور زبان سے بھی ناواقفیت کا اظہار ہوتا ہے کیونکہ زیادہ تر انگریزی الفاظ کے استعمال کا چلن عام ہے۔ان کے نزدیک حقیقت کو علامت پر فوقیت حاصل ہے۔وہ اپنے مطمحِ نظر کو ان الفاظ میں اجاگر کرتے ہیں:۔

''علامت حقیقت کو اجاگر کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ آج جب ہم اپنی زبان میں کہانیاں پڑھتے ہیں تو واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا افسانہ نگار حقیقت سے نا آشنا ہے اور اسی لئے وہ حقیقت کو علامت کے ذریعے پیش کرنے کے بجائے علامت کے ذریعے حقیقت کو دیکھنے کا عمل کر رہا ہے۔ یہ بالکل ویسا ہی عمل ہے جیسے ایک شخص جسے نہ ڈرائنگ آتی ہو،جس کے پاس کوئی موضوع یا حقیقت کا شعور بھی نہ ہو اور جسے رنگ و خطوط کا سلیقہ بھی نہ ہو اور وہ تجریدی مصوری سے اپنے کام کا آغاز کرے۔فکشن کسی سمت میں سفر کرے حقیقت سے آنکھیں نہیں چرا سکتا۔ یہ بات یاد رہے کہ علامت کو حقیقت پر فوقیت نہیں''۔ (۳۱)

یہاں انہیں علامتی افسانوں میں اپنی روایت سے رشتہ منقطع ہونے کا احساس ہے۔اظہارِ فکر اور گہرے تجربے کی کمی بھی کھٹکتی ہے اور ایک طرح کے انتشار کا بھی پتہ چلتا ہے۔ان افسانوں کے ذاتی

نوعیت کے ہونے سے ایک طرح کی بے معنویت بھی جنم لیتی ہے جو ادب پارے کا رشتہ اس کے قاری سے منقطع کر دیتی ہے اور ابلاغ کا مسئلہ سامنے آ جاتا ہے۔

جمیل جالبی شاعری کو محض احساسات کا اظہار نہیں بلکہ ایک تجربے کا نام دیتے ہیں۔ شاعری میں مشاہدے کی اہمیت اور قوتِ متخیلہ کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ شاعر جب اپنے احساسات کو لفظوں کا جامہ پہناتا ہے تو اس میں اس کے اپنے تجربے بنیاد کا کام کرتے ہیں۔ یہ تجربے محض تخیل کی بنیاد پر حاصل نہیں ہو سکتے بلکہ ان کے لئے ان واقعات کے درمیان زندگی گزارنی ہوتی ہے جن سے وہ تجربات حاصل ہوتے ہیں۔ اور جب شاعر اپنے تجربات کے لئے لفظوں کا انتخاب کرتا ہے تو اس کے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ایسی شاعری معیاری ہو جاتی ہے۔ اپنے مضمون ''جدید شاعر'' میں وہ جدید شاعری کے چند مخصوص پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ وہ جدید شاعر کو رومان شاعر سے الگ جانتے ہیں جو محض تصور میں ہی زندگی کے شب و روز گزارتے ہیں۔ جبکہ جدید شاعر زندگی سے فرار نہیں ڈھونڈتا بلکہ وہ بیماریوں، تعفن، کڑواہٹ، کسک، ترقی و تنزلی اور منفی و مثبت پہلوؤں کے ساتھ اسے قبول کرتا ہے۔ اس طرح وہ جدید شاعر کے خواص کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

''وہ دورِ جدید جس پر بڑے بڑے صنعتی شہر چھائے ہوئے ہیں؛ جہاں شاعرانہ تجربہ پیچیدہ ہو گیا ہے اور اسی لئے جدید شاعر مشکل شاعر ہے۔ جدید شاعر کو عام بول چال کے لفظو سے بڑے شہروں کے پیچیدہ تجربوں کو سمیٹنے کی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔ جدید شاعر بڑے صنعتی شہروں کی پیچ در پیچ زندگی کے تجربوں کو سمیٹتا ہے جس سے اسلاف شعراء کا واسطہ ہی نہیں پڑا۔ جدید شاعر وہ ہے جو صنعی شہر کی پیچ در پیچ زندگی سے پیدا ہونے والے تجربات کو اپنی شاعری کا موضوع بناتا ہے۔ جدید شاعر اپنی ساری آلودگیوں اور خرابیوں کے باوجود، ہمارے دور کی ایک زندہ حقیقت ہے''۔ (۳۲)

یہاں ہمیں جمیل جالبی کا دو رخا رویہ صاف نظر آتا ہے۔ ایک طرف جہاں وہ جدید افسانے کے اظہار کے طریقۂ کار کو بے راہ روی و بے سمتی سے معمور بتاتے ہیں وہیں وہ جدید شاعری کو اپنے دور کی ایک زندہ حقیقت تسلیم کرتے ہیں جو کہ صنعتی زندگی کے پر پیچ زندگی سے پیدا ہونے والے تجربات کو اپنا موضوعِ سخن بناتا ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جدید افسانہ نگار ان مراحل سے نہیں گزرا ہوگا جن سے جدید شاعر گزرا تھا پھر جدید شاعر کا علامتی انداز زندہ حقیقت جبکہ جدید افسانہ نگار کا یہی انداز ابلاغ کے

مسائل کس طرح پیدا کر دیتا تھا؟ کیا جدید شاعر کے یہاں ابلاغ کا مسئلہ نہیں؟ممکن ہے جمیل جالبی اچھی نثر کے لئے جس اسلوب پر زور دیتے ہوں وہی وہ افسانے کے لئے بھی ضروری خیال کرتے ہوں۔لیکن یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہر فن کار اپنے تجربات کے اظہار کے لئے اپنا مخصوص انداز اختیار کرتا ہے جو گزرے تمام ادوار کے اختیار کردہ طریقے سے مختلف بھی ہوسکتا ہے یا پھر انہیں کے نقشِ قدم پر چلنے والا بھی ہوسکتا ہے۔تاہم مع خوبیوں اور خرابیوں کے ادب میں اس کا مخصوص مقام ہے جسے رد نہیں کیا جاسکتا۔

غرض انہوں نے اپنی تحریروں سے ادب کی کئی گتھیوں کی سلجھانے کی کوشش کی ہے اوران بے شمار مسائل کو بھی اجاگر کیا ہے جن سے بے راہ روی عام ہو رہی تھی اور ایک صحتمند ادب کی تشکیل میں رکاوٹیں کھڑی کر رہی تھیں۔اپنے تحقیقی،تنقیدی اور کئی ادبی رویوں کے ذریعہ ادب کے مختلف رجحانات پر قدغن لگانے کے ساتھ انہیں اپنی روایت کے ساتھ جڑے رہنے کی تاکید بھی کی ہے کیونکہ یہی روایات ہماری اصل شناخت ہیں۔ان سے رشتہ منقطع کر کے بے راہ روی اور بے سمتی ہی ہاتھ آئے گی۔جڑیں اگر اپنی مٹی میں پیوست ہوں تبھی پورا پیڑ مضبوطی کے ساتھ کھڑا رہ سکتا ہے ورنہ Hydrophonic پودوں کی طرح ان کا دورِ حیات وقتی ولمحاتی ہی رہ جائے گا۔اس طرح کے ادب میں نہ اپنے دور پر اثر ڈالنے کی قوت ہوگی اور نا ہی آنے والی نسل کے لئے کچھ باقیات چھوڑ جانے کی استطاعت ہوگی کہ اس کی بنیاد پر مزید نئے نئے گل بوٹے کھلائے جاسکیں۔اس طرح وہ ایک بہترین ادب کی تشکیل کے لئے راہیں متعین کرنے کے واضح نقوش اجاگر کرتے ہیں۔بحیثیت مجموعی ان کی تحریروں سے ان کے وسیع مطالعے، مدلل انداز،حوالہ جات کی فراہمی،صاف وشستہ اسلوب،برجستگی اور اپنی باتوں کو مثالوں سے واضح کرنے کا انداز جھلکتا ہے۔ان کی تحریروں سے ان کے خیالات کی ترسیل باآسانی ہوجاتی ہے۔اس میں اپنے قاری پر اثر انداز ہونے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ان کے یہاں دقیق الفاظ و پیچیدہ تراکیب کا استعمال تقریباً ناپید ہے۔اپنی تین درجن سے زائد کتابوں کے ساتھ انہوں نے ادب کی بھرپور خدمات انجام دی ہے اور نئی نسل کے لئے واضح راستے بھی متعین کی ہے جس سے آنے والے دور میں ادب کا نئی شاہراہوں پر چلنا اور وقت و حالات کے نئے امکانات کا مقابلہ کرنا آسان ہو سکے گا۔غرض ان کے خدمات کو فراموش کرنا آسان نہیں۔ان کی اہمیت ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔

☆☆☆

حواشی

۱۔ تاریخ ادب اردو۔ جلد اول۔ ص ٦۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی
۲۔ ارسطو سے ایلیٹ تک۔ طبع اول۔ پیش لفظ۔ ۱۹۷۷ء۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی
۳۔ ایضاً
۴۔ نئی تنقید۔ مرتب خاور جمیل۔ ص ۲٦۔ ۱۹۸۸ء۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی
۵۔ ایضاً ۔ ص ۴۷
٦۔ ایضاً۔ ص ۵۵
۷۔ ادبی تحقیق۔ مضمون: تحقیق کے جدید رجحانات۔ ص ۱۱۔ ۱۹۹٦ء۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی
۸۔ ایضاً ۔ ص ۱۳
۹۔ غالب کے خطوط۔ جلد سوم۔ مرتبہ خلیق انجم۔ ص ۲۴۔ ۱۱۲۳۔ ۱۹۸۷ء۔ غالب انسٹی ٹیوٹ۔ دہلی
۱۰۔ تنقید اور عملی تنقید۔ مضمون: غالب کا تفکر۔ سید احتشام حسین۔ ص ۹۰۔ ۱۹٦۱ء۔ ادارۂ فروغ اردو۔ لکھنو
۱۱۔ نئی تنقید، مضمون: تحقیق و تنقیدی موضوعات پر لکھنے کے اصول۔ ص ۵۷
۱۲۔ ایضاً۔ ص ۴۵۔ ۴٦
۱۳۔ ادب اور مابعد لا ادب۔ تنقید و تجزیہ۔ جمیل جالبی۔ ص ۱۹۔ ۱۹٦۷ء۔ مشتاق بک ڈپو۔ کراچی
۱۴۔ ایضاً۔ ص۔ ۳۵
۱۵۔ ایضاً۔ ص۔ ۳۳
۱٦۔ ایضاً۔ ص۔ ۲۳
۱۷۔ ایضاً۔ ص۔ ۳۳
۱۸۔ ایضاً۔ ص ۳۷۔ ۳٦
۱۹۔ نیا ادب اور تہذیبی اکائی۔ ص ۳۸
۲۰۔ ایضاً۔ ۴۹۔ ۴۸

۲۱۔ جدیدیت کیا ہے۔نئی تنقید۔ ص۷۹۔۷۸

۲۲۔ ایضاً ۔ ص ۸۰

۲۳۔ ایضاً ۔ ص ۸۳

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ ایضاً ۔ ص ۔۸۴

۲۶۔ ایضاً ۔ ص۔ ۸۶

۲۷۔ ایضاً ۔ ص۔ ۸۶

۲۸۔ (ص۔۹۶)

۲۹۔ (جدید اردو افسانے کے رجحانات ۔ص۔۱۰۶)

۳۰۔ جدید علامتی افسانہ: ایک منفی رجحان ۔ص۔۱۰۹

۳۱۔ ایضاً ۔ص۔۱۱۲

۳۲۔ جدید شاعر۔ ص۱۶۔۱۱۵

کتابیات

۱۔ ادبی تحقیق۔ جمیل جالبی۔ ۱۹۹۶ء۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی

۲۔ ارسطو سے ایلیٹ تک۔ جمیل جالبی۔ ۱۹۷۸ء۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی

۳۔ ایلیٹ کے مضامین۔ ترجمہ و تالیف؛جمیل جالبی۔ ۱۹۷۸ء۔ محمد یحیٰ مجتبیٰ خان

۴۔ بزمِ خوش نفساں (شخصی خاکے)۔ شاہد احمد دہلوی۔ مرتبہ؛ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ۱۹۸۵ء۔ مکتبہ اسلوب۔کراچی

۵۔ پاکستانی کلچر (قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ)۔ جمیل جالبی۔ ۱۹۶۴ء۔ مشتاق بک ڈپو۔ کراچی

۶۔ تاریخ ادب اردو۔جلد اول تا چہارم ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ۲۰۱۷ء۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی

۷۔ تنقید اور تجزیہ۔ جمیل جالبی۔ ۱۹۶۷ء۔ مشتاق بکڈپو۔ کراچی
۸۔ تنقید اور عملی تنقید۔ سید احتشام حسین۔ ۱۹۶۱ء۔ ادارۂ فروغ اردو۔ لکھنو
۹۔ دیوان حسن شوقی۔ مرتبہ جمیل جالبی۔ ۱۹۷۱ء۔ انجمن ترقی اردو۔ پاکستان
۱۰۔ غالب کے خطوط۔ مرتبہ خلیق انجم۔ جلد سوم۔ ۱۹۸۷ء۔ غالب انسٹی ٹیوٹ۔ دہلی
۱۱۔ محمد تقی میر۔ جمیل جالبی۔ ۱۹۸۰ء۔ انجمن ترقی اردو۔ پاکستان
۱۲۔ معاصر ادب۔ جمیل جالبی۔ ۱۹۹۶ء۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی
۱۳۔ میراجی ایک مطالعہ۔ جمیل جالبی۔ ۱۹۹۱ء۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی
۱۴۔ نئی تنقید۔ جمیل جالبی۔ مرتب خاور جمیل ۱۹۸۸ء۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی

☆☆☆☆☆

تاریخ ادب اردو اور سر سید احمد خان

سمیرا بشیر
پاکستان

ABSTRACT :

History of Urdu Literature and Sir Syed Ahmed Khan" .

Dr. Jamil Jalibi is a multidimensional personality of Urdu literature. His literary services have many aspects and have earned him a high place in the field of literatur His book "History of Urdu Literature" is not only the most well-known of his works, but also a masterpiece of Urdu literature. The reason of its popularity is the extraordinary research on various genres of Urdu literatur. "History of Urdu Literature" comprises four volumes wherein he has presented the evolution of Urdu poetry and prose

in a detailed manner.

In the fourth volume ,he has made the Five Elements of Urdu literature: that is , Sir Syed Ahmed Khan Hussain Hali, Mohammed ,Altaf

Hussain Azad ,Shibli Nomani and Deputy Nazeer Ahmed .Dr.Jalibi has written about the different aspects of these literary giants.

Sir Syed Ahmed Khan was the most eminent of these Five Elements of Urdu literature. Dr. Jamil Jalibi has fammiliarised us with a factual research on the different aspects of his literary and educational services. At some points, he has even presented some details of previously researched material.

☆☆☆

ڈاکٹر جمیل جالبی اردو ادب کی ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ اِن کی ادبی خدمات کے کئی حوالے ہیں۔ اردو ادب کے ہر میدان میں انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

اِن کی تصنیف ''تاریخ ادب اردو'' ڈاکٹر جمیل جالبی کی ہی نہیں بلکہ اردو ادب کی مقبول ترین اصناف میں سے ایک ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت کی وجہ ادب کی مختلف اصناف کی غیر معمولی تحقیق ہے انہوں نے ادب کی ہر صنف کے پہلو کا جائزہ لیا ہے۔

''تاریخ ادب اردو'' چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ جس میں انہوں نے اردو شاعری اور نثر کی مختلف اصناف کا ارتقائی سفر بڑے مفصل انداز میں پیش کیا ہے۔

''تاریخ ادب اردو'' کی چوتھی جلد میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو کے عناصر خمسہ کا بھی بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ اردو کے عناصرِ خمسہ یعنی سرسید احمد خان ،مولانا الطاف حسین حالی ،محمد حسین آزاد، مولانا شبلی نعمانی اور ڈپٹی نذیر احمد نے جدید اردو ادب کو متعارف کرانے اور ترقی دینے میں سرسید کا بھرپور ساتھ دیا اور ان سب کی کوششوں سے اردو ادب کی اصناف کا دائرہ وسیع ہوا۔

سرسید احمد خان اردو کے عناصر خمسہ کے سب سے اہم رکن تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اُن کی شخصیت اور علمی وادبی خدمات کو تین حصوں میں پیش کیا ہے۔

(۱) سوانحی حالات و واقعات (۲) شخصیت ومزاج (۳) تصانیف وتالیفات جمیل جالبی نے مذکورہ بالا پہلوؤں کو مدِنظر رکھ کر سرسید پر تحقیق کی ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے بعض جگہ تحقیق کے نئے نئے حقائق اور بعض جگہ تحقیق شدہ حقائق کی مزید تفصیلات سے آگاہ کیا ہے۔

سرسیداحمد خان کی رہنمائی اور قائدانہ صلاحیتوں کا ہی کمال تھا جس سے اُس دور کے نامور ادیبوں کو سرسید نے قائل کیا اور اُن ادیبوں نے سرسید کے مقاصد کو سمجھا اور اُن مقاصد کے حصول کے لیے سرسیداحمد خان کا بھر پور ساتھ دیا اور ادب کی نئی نئی اصناف اور موضوعات کو نہ صرف متعارف کروایا بلکہ اُن کی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔

سرسیداحمد خان اردو ادب کا بڑا نام ہے۔اِن کی خدمات صرف اردو ادب تک ہی محدود نہیں بلکہ تعلیمی اور سیاسی میدان کے علاوہ انہوں نے مذہبی معاملات میں بھی اپنی خدمات پیش کیں گو کہ مذہبی معاملات میں انہیں مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

اردو ادب کی تاریخ چونکہ سرسید کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔اس لیے تقریباً ہر بڑے محقق اور نقاد نے سرسید کو اپنی تحقیقی اور تنقیدی تصانیف کا موضوع بنایا اور سرسید کے علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی خدمات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔

''سرسیداحمد خان ایک مختلف الحیثیات شخص تھے۔انہوں نے اپنی ہنگامہ خیز زندگی میں میں سیاسی، تعلیمی، مذہبی، ادبی، تحقیقی، غرض ہر قسم کے علمی اور قومی مشاغل میں حصہ لیا۔انہوں نے عمل میں اپنا نقش چھوڑا اور ہر جگہ دیرپا اثرات چھوڑے۔۔۔۔۔وہ اردو ادب کے اولین معماروں میں تھے۔'' [۱]

لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے دوسرے نقادوں اور محققین کے مقابلے میں سرسید کی شخصیت اور فکری وفنی پہلوؤں کو غیر معمولی انداز سے اُجاگر کیا ہے۔

مثلاً سرسید کے والد میر متقی کے انتقال کے بعد انہیں مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو اُنہوں نے انگریز سرکار کی ملازمت کرنے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنے خالو صدرالدین امین دہلی مولوی خلیل اللہ خان سے منصفی کا کام سیکھنے کی اجازت مانگی جہاں انہیں ۱۸۳۹ء میں آگرہ میں نائب منشی مقرر کردیا گیا۔اِس عرصے میں سرسید نے منصفی کا امتحان پاس کرنے کے ساتھ ساتھ علمی وادبی

خدمات بھی پیش کیں۔

''۔ اس زمانے میں ''جام جم'' کے نام سے فہرست، جدول کی صورت میں مرتب کی جس میں امیر تیمور سے بہادر شاہ ظفر تک ۴۳ بادشاہوں کا حال قلم بند کیا۔ یہ ۱۸۴۰ء میں شائع ہوئی۔۔۔ اِسی زمانے میں سرسید نے ''جلاء القلوب بذکر المحبوب '' (کے نام ۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹)میں مستند روایات کی بنیاد رکھی، ''مولود شریف'' لکھا جو ۱۲۵۹ھ/ ۱۸۴۳ میں شائع ہوا۔'' ۲

''۔۔۔اِسی زمانے میں تحفہء حسن'' (۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴) ۳

اور ایک رسالہ ''تسہیل فی جز الثقیل''(مطبوعہ ۱۸۴۴)لکھا ۴

۱۸۴۲ میں سرسید دہلی آئے تو حکیم احسن اللہ کی سفارش پر بہادر شاہ ظفر نے انہیں'' دادا کے خطاب سے نوازا۔''

''۔۔۔۱۸۴۲ میں وہ دہلی آئے تو حکیم احسن اللہ نے بادشاہ بہادر شاہ ظفر سے عرض کیا کہ دادا کا خطاب سرسید کو عطا کیا جائے بہادر شاہ ظفر نے درخواست منظور کی اور نہ صرف دادا کے خطاب ''جوادالدولہ'' سے سرفراز کیا بلکہ عارفِ جنگ کا بھی اضافہ کیا۔ ۵

سرسید کو جدید سائنسی علوم کے علاوہ مذہب سے بھی لگاؤ تھا اِس کے لیے انہوں نے دہلی میں مولوی نوازش علی، مولوی فیض الحسن اور مولانا محضوص اللہ کو اسلامی تعلیمات کا استاد بنایا۔

''۔۔ یہاں سرسید احمد نے مولوی نوازش علی سے فقہ میں قدوری، شرح وقایہ اور نور الانوار پڑھیں، مولوی فیض الحسن سے مقاماتِ حریری ، سبعہ معلقات پڑھیں اور مولانا محضوص اللہ سے مشکوٰۃ ،جامع ترمذی ،صحیح بخاری پڑھ کر قرآن مجید کی سند بھی لی۔'' ۶

اِس کے بعد سرسید احمد خان نے'' آثار الضادید'' مرتب کی جس میں دہلی کی عمارتوں اور نقشوں وغیرہ کی تفصیلات جمع تھیں، اِس سے پہلے دہلی کی عمارتوں کی تاریخی اہمیت اور پس منظر پر کسی نے توجہ نہ دی تھی۔'' آثارِ الضادید'' سرسید کی تصانیف میں خاص اہمیت رکھتی ہے اور اس کے بارے میں ہر مصنف نے تحقیق پیش کی ہے،

''۔۔۔اُن کی معرکتہ آلاراتصنیف'' آثار الضادید'' ہے۔ جو پہلی بار ۱۸۴۷ میں چھپ کر شائع ہوئی۔ یہ پہلی کتاب ہے جو دہلی کی عمارات پر کمال تحقیق اور غیر معمولی محنت اور صحت سے لکھی گئی۔'' ۷

''آثارالصنادید'' سرسید کی تصانیف میں خاص اہمیت رکھتی ہے، ڈاکٹر سید عبداللہ نے اِس پر یوں تبصرہ کیا ہے،

''صاحب جب فتح پور سے تبدیل ہو کر دہلی آئے تو اِس زمانے میں انہوں نے دہلی کی عمارات کا حال لکھا۔ اِس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۵۴ میں شائع ہوا۔ ۱۸۴۷ والے ایڈیشن کا اسلوبِ بیاں پُر تکلف ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں آسان اور سلیس زبان استعمال کی گئی ہے۔'' ۸

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اُردو میں سرسید کی آثارالصنادید کے بارے میں پوری تفصیلات کو کیوں بیان کیا ہے،

''۔۔۔آثارالصنادید۔۔۔جس میں کچھ اوپر سوا سو عماراتِ دہلی کے حالات وتاریخ مع نقشہ جات مرتب کیے گئے تھے۔۔۔سرسید نے نہ صرف خود عمارت کے عرض وطول اور اُونچائی کی پیمائش کی بلکہ ہر کتبہ کو اِس کے اصل خط میں اُتارا۔ ٹوٹی پھوٹی عمارتوں کے نقشے تیار کروائے۔ اِس کام میں مولانا امام بخش صہبائی۔۔۔اِن کے مددگار تھے۔

۔۔۔اِس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ میں شائع ہوا۔ یہ کتاب مسٹر رابرٹ نے انگلستان میں ''لائل ایشیاٹک سوسائٹی'' کو پیش کی اور ''سوسائٹی'' نے اِسے انگریزی زبان میں ترجمے کے لیے کہا:

''۔۔۔۱۸۵۴ میں اِس کا نیا ایڈیشن شائع ہوا، اُدھر گارسیں دتاسی نے اِسے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کر کے ۱۸۶۱ میں شائع کیا فرانسیسی ترجمے کو دیکھ کر ۱۸۶۴ میں ''رائل ایشیاٹک سوسائٹی'' نے سرسید کو اپنی فیلوشپ دی۔ ''آثارالصنادید'' کے اِس دوسرے ایڈیشن کے کم وبیش سارے نسخے ۱۸۵۷ کی بغاوت میں تلف ہو گئے۔'' ۹

''آثارالصنادید'' چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب شہر کے باہر کی عمارتوں کے بارے میں ہے جس میں ۱۳۵ عمارتوں کے علاوہ اِن کے کتبے اور نقشوں کا ذکر ہے۔

دوسرے باب: میں ''قلعہ معلٰی کی عمارت کے حال میں''۔ اِس میں ۳۹ عمارتوں کا ذکر ہے۔

تیسرا باب: '' حالِ خاص شہر شاہجہاں آباد'' میں شہر کی مسجدوں، مندروں، مدرسوں، گرجا گھروں اور بازاروں کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

چوتھا باب: ''دلی اور دلی کے لوگ'' کے بیاں پر مشتمل ہے جس میں دلی کی عمارتوں مثلاً قلعہ رائے،

قصرِ سفید ،قصرِ ہزارستون ،کوٹلہ فیروز شاہ ،تغلق آباد ،وغیرہ کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

سر سید احمد خان نے بلاشبہ علمی اور ادبی خدمات کا سلسہ اپنی زندگی تک جاری رکھا۔ اِن کی علمی وادبی خدمات میں وسعت بھی ہے اور جدیدیت بھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تحقیق میں سر سید کی اُن تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے جس سے بیشتر لوگ ناواقف تھے۔

'' قیام دہلی کے زمانے میں سر سید نے کئی رسالے بھی تحریر کیے جس میں ''فوائد الافکار فی اعمال الفرجار'' ترجمہ ۱۸۶۴ قولِ متین درالبطال حرکتِ زمین ،کلمۃ الحق ،مؤلفہ ۱۸۴۹ء''

''راہِ سنّت در ردبدعت ''مؤلفہ ۱۸۵۰ ۔منقہ در بیاں مسئلہ تصور شیخ بزبان فارسی مرقومہ ۱۸۵۲،

''سلسلۃ الملکوک'' مرتب ۱۸۵۲ اور'' کیمیائے سعادت'' کے چند اوراق کا ترجمہ مرقومہ ۱۸۵۳ شامل ہیں۔'' [۱۰]

'' تاریخ ضلع بجنور'' ۱۲ جون ۱۷۵۵ میں سر سید احمد خان مستقل صدرِ امین کی حیثیت سے بجنور چلے گئے۔ جہاں حکومتِ ہند کے کلیم پر ''ضلع بجنور'' لکھی لیکن ۱۸۵۷ کی جنگ میں یہ کتاب بھی تلف کردی گئی۔

<u>آئینِ اکبری :</u> ۱۹۵۶ میں سر سید نے ابوالفضل کی'' آئینِ اکبرِی'' کی تصحیح کی۔

''۔۔۔آئینِ اکبری تین جلدوں پر مشتمل تھی جن میں سے دوسری جلد ۱۸۵۷ کے ہنگامے میں تلف ہوگئی اور اب صرف پہلی جلد مطبوعہ ۱۲۷۲ھ مل جاتی ہے۔'' [۱۱]

<u>تاریخ سرکشی بجنور :</u> یہ کتاب ۱۸۵۸ میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب سر سید نے مرادآباد میں لکھی جس میں مئی ۱۸۵۷ تا اپریل ۱۸۵۷ تک پیش آنے والے تمام اہم واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔

''۔۔۔سرکشی کے زمانے میں وہ تمام خط و کتابت، جو مختلف لوگوں سے ہوئی اس کتاب میں شامل ہے۔'' [۱۲]

<u>اسبابِ بغاوت ہند :</u> ۱۸۵۹ میں سر سید نے مرادآباد میں ایک فارسی مدرسے کے علاوہ اپنا

مشہور رسالہ ''اسبابِ بغاوت ہند'' لکھا اِس رسالے کے کئی زبانوں کے ترجمے ہوئے۔ سر سید نے اِس رسالے میں انگریزوں کے خلاف بڑی جرأت اور سچائی کے ساتھ ۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی کے اصل اسباب بیان کئے ہیں۔

''۔۔۔اِس دور میں جرأت اور آزادی سے اپنی بات کہنا ہنسی کھیل نہیں تھا۔ سر سید نے اِس کی پانچ سو جلدیں چھپوائیں اور چند جلدیں اپنے پاس رکھ کر باقی سب جلدیں حکومتِ برطانیہ کو اور ایک جلد حکومتِ ہند کو بھیج دی۔ حکومتِ ہند کے ایک حلقے میں اِسے باغیانہ تحریر کیا گیا لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ یہ شائع نہیں کی گئی ہے۔۔۔۔تو معاملہ دب گیا۔'' ۱۳

۱۸۶۰ء میں سر سید نے اُردو اور انگریزی زبان میں ''رائل محمڈن آف انڈیا'' کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا جس کے صرف تین شمارے ہی نکل سکے اور ۱۸۶۱ میں یہ بند ہو گیا۔ اِس رسالے میں انہوں نے اُن مسلمانوں کا تعارف کروایا ہے جنہوں نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ کے دوران انگریزوں کا ساتھ دیا تا کہ مسلمان اُن کے غضب سے بچ سکیں۔

مسلمانوں کو انگریزوں کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے سر سید نے لفظ نصاریٰ کی تحقیق کر کے ایک رسالہ نکالا تا کہ انگریز اِس لفظ کے مطلب کو سمجھ سکیں کیونکہ،

''۔۔۔نصاریٰ کا لفظ استعمال کرنے پر کان پور میں ایک مسلماں کو انگریزوں نے اِس ''جرم'' میں پھانسی دی تھی۔'' ۱۴

سر سید نے ضیا برنی کی تصنیف ''تاریخ فیروز شاہی'' کی تصحیح کی۔

جمیل جالبی نے اِس کتاب پر اِن الفاظ میں تحقیقی تبصرہ کیا ہے۔

''قیام مراد آباد کے زمانے میں سر سید احمد نے ضیاالدین برنی کی ''تاریخ فیروز شاہی'' کو چار خطی نسخوں سے مقابلہ وتصحیح کر کے مرتب کیا جسے ۱۸۶۲ میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے شائع کیا۔ اِس کا دیباچہ سید احمد نے اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے ۲۴ اگست ۱۸۶۶ کے شمارے میں بھی شائع کیا۔ ۱۵

سر سید احمد خان نے ہندوستانی قوم کے اتحاد اور مسلمانوں اور انگریزوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کے لیے اپنی تحریروں کا سہارا لیا اور کوشش کی کہ اِن کے آپس کے اختلاف اور بدگمانیاں ختم ہو جائیں۔ ''تبین الکلام'' جو سر سید نے مراد آباد میں لکھنا شروع کی تھی غازی پور میں جا کر مکمل ہوئی۔

اِس کتاب کا پس منظر اور مقاصد کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے کیوں بیان کیا ہے،

''سر سید احمد خان بدلے ہوئے سیاسی وتہذیبی منظر میں مسلمانوں کی ترقی اور بقاء کے لیے عیسائی اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اِس زاویے سے بائبل کی تفسیر لکھنے کا منصوبہ بنایا اور بڑی محنت سے اس موضوع پر یورپین مصنفین کی مستند کتابیں فراہم کیں۔ عبرانی وانگریزی زبان کے ماننے والوں کی خدمات حاصل کیں۔ حدیث وتفسیر قرآن کے حوالوں کے لیے ایک عربی عالم کو ملازم رکھا۔ یہ ایک مشکل کام تھا جسے سر سید نے محنت ولگن سے انجام دیا اور پہلی جلد تیار کی۔[۱۶]

سر سید نے ۱۸۶۲ میں جدید سائنسی علوم جو انگریزی زبان میں ہے کا ترجمہ اردو زبان میں کرنے کے لیے ایک ادارہ ''سائنٹفک سوسائٹی'' کے نام سے قائم کیا اور تراجم کا کام شروع کر دیا۔ اور پھر ۱۸۶۲ میں چندہ جمع کر کے غازی پور میں ہی ایک مدرسہ قائم کیا۔

۱۸۶۴ میں سر سید کا تبادلہ غازی پور سے علی گڑھ ہوا تو ''سائنٹفک سوسائٹی'' کا دفتر پورے عملے سمیت علی گڑھ منتقل کر دیا۔ سوسائٹی کا صدر ایک انگریز جج مقرر ہوا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحقیق سے ''سائنٹفک سوسائٹی'' میں ہونے والی علمی سرگرمیوں کو یوں بیان کیا ہے۔

''سوسائٹی کے جلسوں میں ہر مہینے نئے نئے موضوعات پر لیکچر کا انتظام کیا جاتا تھا۔ یہاں سے کئی مفید کتابیں ترجمہ ہو کر شائع ہوئیں جن میں الفنسٹن کی تاریخ ہندوستان، رولن کی ''تاریخ مصر قدیم''، ''تاریخ یونان قدیم''، اسکاٹ ہرٹ کا رسالہ سیاست مدن، مرجان میلکم کی ''تاریخ ایران'' ریورنڈ ایکسوس کی ''تاریخ چین'' کا فارسی سے ترجمہ وغیرہ شائع ہوئے۔ [۱۷]

۱۸۶۶ میں سر سید نے ''سائنٹفک سوسائٹی'' سے ایک ہفتہ وار اخبار ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کے نام سے نکالا جو سر سید کی وفات تک شائع ہوتا رہا۔

جب ملکہ وکٹوریہ نے حکومتِ ہند کے اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لیے تو سر سید نے ۱۰ مئی ۱۸۶۶ میں ''علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن'' اس مقصد کے لیے قائم کی کہ انہیں اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے برطانوی حکومت کا تعاون مل سکے۔ انہیں اپنے مقصد میں کامیابی بھی حاصل ہوئی لیکن سر سید کے بنارس میں تبادلے کے بعد یہ انجمن قابل ذکر کام نہ کر سکی۔

۱۸۶۷ میں سرسید نے ''علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن'' کو ایک درخواست بھیجی جس میں یہ مطالبات پیش کیے۔

''ا۔)اعلیٰ درجے کی تعلیم کا ایک سررشتہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علم وفنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہوا کرے۔

۲۔)دیسی زبانوں میں انہیں مضمونوں کا سالانہ امتحان ہوا کرے جن میں اب طلبہ کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی میں امتحان دیتے ہیں۔

۳۔)جو سندیں انگریزی میں طلبہ کو علم کی مختلف شاخوں میں دی جاتی ہیں وہی سندیں ان طلبہ کو بھی عطا ہوا کریں۔

۴۔)اردو فیکلٹی یا تو کلکتہ یونیورسٹی سے قائم کی جائے یا شمالی مغربی اضلاع میں ایک جدا یونیورسٹی دیسی زبان میں قائم ہو۔

۵۔)اِس غرض سے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا کام جہاں تک ممکن ہوگا ''سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ'' انجام دے گی۔۱۸؎

سرسید کے اِن خیالات کو حکومتِ ہند نے سراہا اور ساتھ میں یہ بھی تجویز پیش کی کہ صرف نصاب کی انگریزی کتابوں کا ہی نہیں بلکہ اعلیٰ علوم کی دوسری کتابوں کا بھی دیسی زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہیئے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دلی سے پیارے لال ،مولوی ذکاءاللہ اور پنڈت دھرم نرائن ترجمہ کرنے کے لیے تیار ہوگئے بحث مباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ،

''۔۔۔یہ یونیورسٹی لاہور میں قائم کی جائے اور اگر دونوں صوبوں میں ایک ہی یونیورسٹی قائم کی جائے تو اس کا مقام دلی ہونا چاہیئے۔مگر نہ معلوم کس وجہ سے سرسید کی دلچسپی اِس خیال سے ہٹ گئی۔

حالی نے لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ'' گورنمنٹ کا ارادہ کلکتہ یونیورسٹی توڑ کر اِس کی جگہ ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا۔۱۹؎

جن پر سرسید نے یہ تجویز پیش کی،

''۔۔۔ایسوسی ایشن کی ہرگز یہ رائے نہیں ہے کہ انگریزی صرف بطور ایک زبان کے سکھائی

جائے اور اس کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ نہ گردانا جائے بلکہ اس کی یہ خواہش ہے کہ انگریزی تعلیم کا طریقہ بدستور جاری رہے مگر اس کے ساتھ ایک رشتہ قائم کیا جائے جس سے انگریزی علوم وفنون اور خیالات ایسی زبان کے ذریعے بکثرت عام ہندوستان میں پھیلائے جائیں۔ پس یا تو کلکتہ یونیورسٹی میں ایک شعبہ قائم ہو یا ایک جداگانہ ورنیکلر یونیورسٹی خاص اِس اضلاع میں قائم ہو'۔ [۲۰]

جب سرسید کو احساس ہوا کہ ورنیکلر یونیورسٹی کی تجویز اب اِن کے مقاصد کو پورا نہیں کرسکتی تو اُنہوں نے اس کو نظر انداز کر دیا۔ اصل میں سرسید کی تجویز پر اگر عمل کیا جاتا تو اُردو زبان کے فروغ کے امکانات زیادہ تھے اِس لیے ہندوؤں نے اِس کے خلاف آواز اُٹھائی اور اُردو کے ساتھ ہندی زبان کی بات ہونے لگی۔

حیاتِ جاوید میں حالی نے اِس کی وضاحت یوں کی ہے۔

'' اُردو زبان کے مخالفوں نے اخباروں میں اِس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی کہ اس یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لیے اُردو اور ہندوؤں کے لیے ہندی زبان مخصوص کی جائے اور باوجود تسلیم کرنے اِس بات کے کہ ہندی زبان سرِدست ترجمہ کی قابلیت نہیں رکھتی اِس امر پر زور دیا جاتا تھا کہ اِس کی ترقی میں کوشش کر کے اِس کو ترجمہ کے لائق بنا دیا جائے۔'' [۲۱]

سرسید کی ہر ممکن کوشش تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نا اتفاقی اور دوری پیدا نہ ہو لیکن مل جُل اور ایک قوم بن کر رہنا ہندوؤں کو پسند نہ تھا لہٰذا انہوں نے مسلمانوں اور اُردو زبان کی مخالفت شروع کر دی۔

انگریز بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کو لڑتے جھگڑتے دیکھنا چاہتے تھے انگریزوں نے اِس نفرت کو ہوا دی ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق ،

''۔۔۔ اِس زمانے میں انگریز مدارس کے نصاب میں تاریخ ہندوستان کی وہ کتابیں شامل تھیں جو مسلمانوں کے خلاف تعصب سے بھری ہوئی تھیں جن میں خصوصیت سے مسلمانوں کی ظالمانہ کاروائیوں کو تفصیل کے ساتھ درج کیا گیا تھا۔'' [۲۲]

اُردو زبان جو اصل میں ہندی بھاشا کی ترقی یافتہ شکل ہے اور اِس کی ترقی مسلمانوں کے عہد میں ہوئی۔

اِس لیے ہند ہندی بھاشا کی جگہ دیونا گری کو رائج کرنا چاہتے تھے۔

''۔۔۔چنانچہ ۱۸۶۷ میں بنارس کے بعض سر برآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اُردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اِس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیونا گری سے لکھی جائے۔'' ۲۳

۱۸۸۲ میں شمال مغربی اضلاع اور پنجاب کے ہندوؤں نے اُردو زبان اور فارسی رسم الخط کے خلاف آواز اُٹھائی، جواباً سرسید اور اُن کے حامیوں نے بھی ''انجمن حیات اُردو'' قائم کی اور جواباً کمیشن کو عضر بھی بھیجے۔

''۱۸۹۸ میں سر انتھونی میک ڈونلڈ کی سرکار میں اضلاع شمال مغرب و اودھ کے سر برآوردہ ہندوؤں نے ایک یاداشت پیش کی کہ عدالتوں کچہریوں میں اُردو زبان و فارسی رسم الخط کے بجائے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔'' ۲۴

سرسید احمد خان جب تک زندہ رہے تمام مخالفتوں کا مقابلہ کرتے رہے اور یہ بات سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ اُردو کی مخالفت محض قومی تعصب کی وجہ سے ہے۔

۱۸۹۸ میں سرسید کی وفات کے بعد انتھونی میک ڈونلڈ نے ہندوؤں کے مطالبات کو مان لیے اور ہندی و دیونا گری رسم الخط رائج کر دیا۔

جب ۱۸۶۹ میں وظیفے پر برطانیہ جانے کے لیے سرسید کے بیٹے سید محمود کا انتخاب ہوا تو سرسید اور اُن کے بیٹے سید محمود بھی اُن کے ساتھ گئے اور ذاتی اخراجات پُورے کرنے کے لیے اپنا کتب خانہ فروخت کر دیا اور اپنے گھر کو گروی رکھوا دیا۔ بنارس سے انگلستان کے سفر کی تفصیل سرسید احمد خان نے ''مسافرانِ لندن'' میں لکھی ہے۔

لندن میں سرسید کو بہت عزت ملی اور بڑے بڑے اعزازات سے نوازا گیا۔

''۔۔۔انگریزوں نے اِن کا پُر تپاک خیر مقدم کیا اور ۶، اگست ۱۸۶۹ کو انڈیا آفس میں تقریب منعقد ہوئی اور اِن کو سی ایس آئی کا خطاب اور تمغہ بھی دیا گیا۔'' ۲۵

لندن کے قیام کے دوران سرسید نے وہاں کے نظامِ تعلیم کو دیکھا اور کیمبرج یونیورسٹی کے طرزِ تعلیم سے متاثر ہوئے۔

لندن کے قیام کے دوران انہوں نے ''خطباتِ احمدیہ'' لکھی جو مسلمانوں کے تحفظ اور دفاع کے لیے تھی اور سر ولیم لیور کی کتاب ''لائف آف محمد'' کے اُن اعتراضات کا جواب تھی جو انہوں نے آپ ﷺ پر لگائے تھے۔ ''خطباتِ احمدیہ'' آپ ﷺ کے ۱۲ خطبات پر مشتمل ہے۔ سر سید خطبات احمد کے بارے میں ایک خط میں لکھتے ہیں،

''۔۔۔میں شب و روز تحریر کتابِ سر مصطغوی صلعم میں مصروف ہوں سب کا چھوڑ دیا ہے ۔۔۔ ادھر فکر ترکیبِ مضامین ادھر فکر جواب اعتراضات ۔۔۔الٰہی! لکھنا اور چھپوانا تو شروع کر دیا، روپیہ کہاں سے آوے گا۔'' ۲۶

سر سید احمد خان ۴ ستمبر ۱۸۷۰ میں بنارس واپس آ گئے اور انہوں نے مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کے لیے عملاً کوششیں شروع کر دیں۔

''۔۔۔انہوں نے اپنے علم دوست احباب ورفیق کاروں سے مشورہ اور کافی غور وخوض کے بعد تعلیم کے سلسلے میں تین تجاویز پیش کیں۔

۱۔) کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے یہ معلوم ہو کہ مسلمان تعلیم میں دلچسپی کیوں نہیں لیتے۔

۲۔) تعلیم کی عدم دلچسپی کی وجوہات معلوم ہونے پر انہیں دور کر کے تعلیم کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی جائے۔

۳۔) ایک ایسا مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے جو مسلمانوں کی تعلیمی غرض و غایت کے لیے مناسب ہو۔'' ۲۷

پہلی تجویز کو مدِنظر رکھتے ہوئے سر سید نے ''کمیٹی خواستگارِ ترقی وتعلیم مسلمانان'' بنائی تاکہ معلوم کیا جائے کہ مسلمان جدید تعلیم سے دلچسپی رکھنے کے بجائے خود کو قدیم تعلیم تک ہی محدود کیوں رکھنا چاہتے ہیں۔ اِس سلسلے میں انہوں نے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں سے مشورے کے لیے اور اِن مسائل کو حل کرنے کے لیے مضامین بھی لکھوائے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق،

''۔۔۔انہوں نے ''کمیٹی خواستگار ترقی وتعلیم مسلمانان'' قائم کی اور ساتھ ہی ۱۸۷۰ میں

''تہذیب الاخلاق'' کی بنیادرکھدی جس کا پہلا پرچہ یکم شوال ھ/۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ءکوشائع ہوا۔'' ۲۸

ڈاکٹر جمیل جالبی ''تاریخ وادب میں لکھتے ہیں کہ،

''۔۔۔تہذیب الاخلاق ابوعلی مسکویہ کی وہ اہم تصنیف تھی جس کے فن اخلاق سے متعلق حصے کا عربی سے فارسی میں ترجمہ خواجہ نصیرالدین طوسی نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب ''اخلاقِ ناصری'' میں شامل کیا تھا۔'' ۲۹

تہذیب الاخلاق سرسید کے تمام کارناموں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔جب سرسید انگلستان کے دورے پر گئے تو انہیں پتا چلا کہ انگلستان میں ایڈیسن اوراسٹیل نے اپنی قوم کی اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کے لیے دو رسالے اسپیکٹیڑ اورٹیٹلر نکالتے ہیں اور اِس میں ایسے مضامین شامل ہوتے ہیں جس سے قوم کی اخلاقی طور پر اصلاح ہوتی ہے تا کہ وہ اچھے شہری اور مضبوط شخصیت کے مالک بن سکیں ،تہذیب الاخلاق کے پہلے پرچے کی تمہید میں سرسید نے اِس رسالے کے واضح مقاصد بیان کئے،

''۔۔۔اِس پرچے کے اجراء کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کامل درجے کی سویلائزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تا کہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہواور وہ بھی دنیا میں معزز ومہذب قوم کہلاویں۔'' ۳۰

۱۲۸۷ ہجری میں نکالا جانے والا رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' ۱۲۹۴ھ تک شائع ہوسکا۔کیو نکہ اِس بعد یہذ یب الاخلاق کیلئے چندہ ملنا دشوار ہوگیا تھا اور سرسید بھی کسی حد تک مطمئین ہوگئے تھے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سوچ وفکر وغیرہ کی جس طرح اصلاح کرنا چاہ رہے تھے اس میں اُنہیں کامیابی مل رہی تھی۔۔

گو کہ سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' معاشرتی اصلاح کے لیے نکالا تھا لیکن تہذیب الاخلاق میں لکھے جانے والے مضامین انگریزی مذہب،تہذیب وتمدن،زبان وادب اور دوسرے موضوعات پر بھی تھے یہ مضامین انگریزی سے تراجم شدہ بھی تھے۔سرسید نے خود بھی لکھے اور ان کے ساتھیوں نے بھی اِس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کیں۔اور اِس کے اثر سے معاشرے میں مذہبی،اخلاقی اور ادبی سطح پر تبدیلیاں آئیں۔جس کا ذکر سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ایک شمارے میں یوں کہا،

''جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اُردو زبان کے علم وادب کی ترقی میں اپنے اِن ناچیز پرچوں

کے ذریعے سے کوشش کی مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا جہاں تک ہماری کچ مج زبان نے یاری کی الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی کی رنگین عبارت جو تشبیہات اور استعاراتِ خیالی سے بھری ہوئی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے۔ دل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا ۔پرہیز کیا۔۔۔۔ جہاں تک ہوسکا سادگی عبارت پر توجہ دی۔ ۳۱

''تہذیب الاخلاق''۔۔۔پہلی بار ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ کو نکلا اور سات سال تک پابندی سے شائع ہوتا رہا اور رمضان المبارک ۱۲۹۴ھ میں اسے اس لیے بند کر دیا گیا کہ مولانا امداد العلی خان نے کالج کی حمایت کے لیے شرط رکھی تھی کہ ''تہذیب الاخلاق'' بند کر دیا جائے یا اس میں کوئی مضمون مذہب کے متعلق مت لکھو۔'' ۳۲

''۔۔۔دوسری بار ''تہذیب الاخلاق'' جمادی الاول ۱۲۹۶ھ کو شائع ہوا اور دو برس پانچ ماہ جاری رہ کر بند ہو گیا۔ تیسری بار محسن الملک کی تحریک پر یکم شوال ۱۳۱۱ھ کو سرسید اسے پھر شائع کیا اور تین برس جاری رہ کر بند ہو گیا۔'' ۳۳

سرسید کے اسلوب پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اِن کی تحریروں میں طویل اور بے ترتیب جملے ہوتے ہیں یا بعض اوقات لفظوں اور جملوں کی تکرار کی جاتی ہے جس سے اِن کی تحریر پر بُرے اثرات پڑتے ہیں، انگریزی الفاظ یا انگریزی اور اُردو ملا کر بھی لفظوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔

مثلاً ریڈریں ،لیڈری

ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے کے مطابق،

''۔۔۔سرسید کی نثر بھی سادگی کے ساتھ نفاست کا اثر قائم کرتی ہے اِس لیے ہم اِسے ''حقیقی نثر'' کا نام دے سکتے ہیں بول چال کی نثر کی بنیاد جذبات و تخیل کی رو پر قائم ہوتی ہے۔ حقیقی نثر وہ ہے جس پر عقل (Reason) حاوی ہوتی ہے سرسید کی نثر اِسی ذیل میں آتی ہے اور یہی اِن کی انفرادیت ہے۔'' ۳۴

سرسید نے اُردو اور مسلمانوں کی ترقی اور کامیابی کیلیے ہر ممکن کوشش کی لیکن انہیں اِس کے بدلے پذیرائی کم اور مخالفت زیادہ ملی۔ لیکن نہ ان کے ارادے کمزور ہوئے، نہ خلوص اور نیک نیتی میں کمی آئی بلکہ ایک کے بعد دوسرے مقصد کے حصول کیلیے کامیاب ہونے تک کوشاں رہے۔ تہذیب الاخلاق

کیلیے بھی مالی تعاون کی ضرورت تھی اور ''مدرسۃ العلوم'' کو چلانے کے لیے بھی سر سید نے مولانا امداالعلی کی تجویز پر عمل کیا اور'' تہذیب الاخلاق'' بند کر کے'' مدرسۃ العلوم'' کی ترقی کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔اِس کے لیے بھی انہیں بہت سی مخالفتوں اور الزامات کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ ہمیشہ کی طرح ڈٹے رہے اور بالآخر کامیاب بھی ہوئے۔

''۔۔۔۲۴مئی ۱۸۷۵ء کو ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ کے دن مدرسہ کا افتتاح ہوا اور یکم جون ۱۸۷۵ء سے تعلیم شروع ہوگئی ۱۸۷۶ء میں سر سید پنشن لے کر علی گڑھ آ گئے اور دن رات کالج کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔۔۔۔۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو۔۔۔لارڈلٹن وائسرائے و گورنر جنرل ہند نے کالج کا سنگِ بنیاد رکھا۔'' ۳۵

بلاشبہ سر سید احمد خان جدید اُردو نثر کے بانی ہیں اِن کی علمی وادبی سیاسی خدمات کو ہمیشہ سراہا جائے گا۔علم وادب اور سیاسی سوچ وفکر میں سر سید نے جو جدت پیش کی وہ قابلِ ستائش ہے۔انہوں نے مسلمانوں کی اصلاح اور ہر میدان میں ترقی کے لیے علمی وادبی تحریریں اور جدید تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لیے ادارے قائم کئے۔اپنی تحریروں کے ذریعے انہوں نے مسلمانوں کے ذہن اور سوچ سے بے علمی، توہم پرستی ،غلط رسم و رواج اور مذہبی فرقہ بندی سے نجات دلانے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔

اِس کے ساتھ انہوں نے اپنی تصانیف کے ذریعے انگریزوں کے دل سے مسلمانوں کے لیے نفرت وتعصب کو مٹانے کی کوشش کی اِس سلسلے میں انہوں نے ،۱۸۴۹ میں کلمۃ الحق لکھی جو پیری مریدی کے خلاف تھی۔۱۸۵۰ء میں راہِ سنّت ور دِبدعت لکھی جس میں طریقہ محمدیت کی تائید ہے۔

'' خطبات احمدیہء میں انہوں نے سر ولیم کی کتاب'' لائف آف محمدؐ'' میں کیے گئے اُن اعتراضات کا جواب دیا ہے جواُس نے آپ ﷺ پر کیے تھے۔

سر سید کے زمانے میں بعض مسلمان فرقوں میں بٹ گئے تھے اپنے فرقے کی فکر وسوچ پر بغیر کسی مضبوط دلیل کے شدت سے قائم تھے اور پیری مریدی ہی نجات و کامیابی کا واحد ذریعہ سمجھا جاتا،

ڈاکٹر جمیل جالبی نے سر سید کے زمانے میں مذہبی صورتِ حال کو یوں بیان کیا ہے،

''۔۔۔محیرالعقول کرامات ،قبر پرستی، بدعات،عرس،فاتحہ،وظیفے اور چلے اِس کے عقیدے

میں شامل ہو گئے تھے۔اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر بھی اپنے وقت کے بزرگوں کے مرید تھے۔۔۔شاہ عبدالعزیز اور اِن کے خاندان کے بزرگ لڑکوں کو بعض بیماروں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک گنڈا دیا کرتے تھے جس میں ایک تعویز بھی ہوتا تھا اور اِس تعویز میں ایک حرف یا ہندسہ سفید مرغ کو ذبح کر کے اِس کے خون سے لکھا جاتا تھا اور اس لڑکے کو پہنایا جاتا تھا بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کھانے کا اِس کو امتناع ہوتا۔'' ۳۶

ایک طرف تو سر سید نے مسلمانوں کو معاشرتی اور مذہبی معاملات میں توہم پرستی ،جعلی پیروں کی جھوٹی کرامات ۔قبر پرستی وغیرہ سے نجات دلانے کی کوشش کی اور دوسری طرف اسلامی تعلیمات ،قرآن کی تفسیر اور پیغمبروں کے معجزات کو عقل پر پرکھ کر نعوذ باللہ غلط ثابت کرنے لگے۔اور ایسے تصورات پیش کیے جو اسلام کی منافی اور عیسائیت دوسرے لفظوں میں انگریزوں کی خوشنودی کیلیے تھے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق،

''سر سید خدا کو بھی عقل ہی سے پہچانتے ہیں۔عقل ہی سے اچھے بُرے کی تمیز رونما ہوتی ہے اسلام وکفر میں تمیز،حسن وقبح میں فرق بھی عقل ہی سے قائم ہوتا ہے۔'' ۳۷

مذہب کے معاملات میں سر سید کا اپنی سوچ وفکر پر فخر کرنا اور اِسے ترقی وکامیابی کا راستہ سمجھنا نہ صرف مسلمانوں کے لیے تکلیف دہ بنا بلکہ سر سید کیلیے نقصان دہ ثابت ہوا سر سید کے ساتھیوں نے بھی مذہب کے معاملات میں اِن سے اختلاف کیا اور مولانا الطاف حسین حالی،محمد حسین آزاد،ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا شبلی نعمانی اِن سے الگ رائے رکھتے ہیں۔

''سر سید کے اِس نقطہ نظر کا قوی ترین مخالفانہ ردِعمل علامہ اقبال کے تصورات کی صورت میں ہوا جن کی بنیاد اِس خیال پر ہے کہ حقائق کا کامل ادراک عقل سے نہیں بلکہ وجدان اور حاسہ مذہبی ہی سے ممکن ہے۔'' ۳۸

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اُردو کی چوتھی جلد میں اُردو کے عناصرِ خمسہ کو ادب کے دیگر موضوعات کی طرح بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

انہاں نے عناصر خمسہ کی تمام شخصیات کی زندگی کے ہر پہلو پر تحقیق وتنقید کی ہے۔تاریخ ادب اُردو کی ہر جلد کی طرح چوتھی جلد کے مطالعہ کرنے کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی کو غیر معمولی محقق ونقاد اور مورخ

کہنا بے جا نہ ہوگا۔

تاریخ ادب اُردو پر ڈاکٹر خاور جمیل نے یوں تبصرہ کیا ہے،

''کتابیات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے کئی ہزار کتابیں اور رسالے کھنگالڈالے ہیں۔'' ۳۹

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ،

''پاپا تاریخ ادب اُردو کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ میری خواہش تھی کہ تاریخ ادب اُردو کی ایک ایسی تاریخی کتاب لکھی جائے جو پرانے سانچوں کو توڑ کر ادبی تاریخ نویسی کا ایک نیا ڈھانچہ فراہم کردے اِس میں حالات و واقعات صحیح اور درست ہوں جو حقیقی نقطۂ نظر سے سارے مواد کو کھنگال کر واقعات کے سروں کو دوسرے سے ملاتی ہے جس میں ادبی شخصیات کے تحقیقی کاموں کا جدید انداز سے مطالعہ کیا گیا ہو۔'' ۴۰

اِس مقالے میں اُردو کے عناصر خمسہ کی صرف ایک شخصیت ''سر سید احمد خان'' زیر بحث ہے۔جس پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اُردو کی چوتھی جلد میں بڑی تفصیل سے تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا ہے۔

سر سید احمد خان ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے انہوں نے زندگی کے ہر رُخ پر غور وفکر کی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی کے بعد انہوں نے ہندوستان کو معاشرتی،تہذیبی،سیاسی اور تعلیمی ہر لحاظ سے بہت کمزور پایا،اور انہی کوششوں سے ہندوستانی قوم اور خاص طور پر مسلمانوں کو ہر لحاظ مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے علمی وادبی اور مذہبی خدمات پیش کیں۔

سر سید کی تمام کاوشوں کا ذکر ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی مشہور ومقبول تصنیف ''تاریخ ادب اُردو''(جلد چہارم) میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ایسی تحقیق کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جہاں اتنے اعلیٰ درجے کی تحقیق کی ہے وہاں بعض جگہ تکرار بھی ہوئی ہے مثلاً انہوں نے سر سید کی تصانیف پر تبصرہ کیا ہے لیکن جب وہ سر سید کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہیں تو دوبارہ تصانیف کے بارے میں تحقیق وتنقیدی جائزہ پیش کرتے ہیں۔

جب اُن کے مذہبی تصورات کو بیان کرتے ہیں تو دوبارہ مذہبی موضوعات پر لکھی جانے والی

تصانیف پر گفتگو پیش کرتے ہیں، جس سے بات کی تحریر طویل ہو جاتی ہے۔

ہر باب کے آخر میں ڈاکٹر جالبی نے خواہش دی ہے لیکن کتاب کے آخر میں کتابیات کی تفصیل پیش نہیں کی گئی۔

بقول ڈاکٹر گیان چند جین،

''یہ ایک فردِ واحد کا کارنامہ ہے اور اِس میں شبہ نہیں کہ اِس وسیع وعریض کام کو اِس قدر عمق کے ساتھ کوئی ادارہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔۔۔اِسے اہل نظر پہچا نسکتے ہیں۔ جالبی نے جس کثرت سے اصل ادبی وغیر ادبی ماخذات کو دیکھا ہے اِس کی دوسری نظیر نہیں ملتی۔'' [۸]

ڈاکٹر جمیل جالبی جیسی ہمہ جہت شخصیت نے ادب ، زبان، تراجم، تاریخ، تحقیق اور تنقید ہر میدان میں اپنی خدمات پیش کیں جن کی اہمیت کبھی کم نہ ہوگی۔

☆☆☆

<u>حوالہ جات :</u>

۱۔سر سید احمد خان اور اُن کے رفقاء کی اُردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ از سید عبداللہ سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۸ ص (۹)

۲۔مقالات سر سید، مرتب محمد اسمٰعیل پانی پتی، (جلد ہفتم) ص (۳۔۴) مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۲، بحوالہ تاریخ ادبِ اُردو (جلد چہارم)، ڈاکٹر جمیل جالبی مجلس ترقی ادب اُردو لاہور ۲۰۱۹ ص (۹۔۸)

۳۔مقالات سر سید جلد ۱۶، ص (۸۴۷۔۔۸۵۶) مجلس ترقی اُردو ادب لاہور، ۱۹۶۵ بحوالہ تاریخ ادب اُردو (جلد چہارم)، ڈاکٹر جمیل جالبی مجلس ترقی اُردو ادب لاہور ۲۰۱۹ ص (۹۔۸)

۴۔ ایضاً

۵۔تاریخ ادب اُردو، ڈاکٹر جمیل جالبی ص (۹۔۸) مجلس ترقی اُردو ادب لاہور ۲۰۱۹

۶۔ ایضاً ص (۹۔۸)

۷۔سر سید احمد خان حالات و افکار، بابائے اُردو مولوی عبدالحق ص (۳۴) انجمن ترقی پاکستان، اشاعتِ سوم ۱۹۹۸۔

۸۔''سر سید احمد خان اور اُن کے نامور رفقاء کی اُردو نثر کا فنی و فکری جائزہ''، سید عبداللہ لاہور ۲۰۰۸ ص (۱۳)

۹۔تاریخ ادب اُردو(جلد چہارم)ڈاکٹر جمیل جالبی، ص(۸۱۰)

۱۰۔تاریخ ادب اُردو(جلد چہارم)ڈاکٹر جمیل جالبی، مجلس ترقی اُردوادب لاہور،طبع سوم اگست ۲۰۱۹ ص (۸۱۰)

۱۱۔حیات جاوید،الطاف حسین حالی، ص(۵٦)،مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، بارسوم ۱۹۲۲ بحوالہ تاریخ ادب اُردو (جلد چہارم)ڈاکٹر جمیل جالبی ص (۸۱۰)

۱۲۔تاریخ ادب اُردو (جلد چہارم)ڈاکٹر جمیل جالبی ص(۸۱۲)

۱۳۔ ایضاً ص(۸۳٦)

۱۴۔ حیات جاوید،الطاف حسین حالی، ص(۵۸)بحوالہ تاریخ ادب اُردو (جلد چہارم)ڈاکٹر جمیل جالبی ص (۸۱۲)

۱۵۔مقالات سرسید،مرتب محمد اسمٰعیل پانی پتی، ص(۵۰۷)مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹٦۵ بحوالہ تاریخ ادبِ اُردو(جلد چہارم)،ڈاکٹر جمیل جالبی ص(۸۱۳)

۱٦۔ تاریخ ادبِ اُردو(جلد چہارم)،ڈاکٹر جمیل جالبی ص(۸۱۳)

۱۷۔ تاریخ ادب اُردو(جلد چہارم)محولہ بالا ص (۸۱۴)

۱۸۔ ایضاً ص (۸۱۵)

۱۹۔ ایضاً ص (۸۱۵)

۲۰۔ حیات جاوید محولہ بالا ص(۹۰۔۹۱)بحوالہ تاریخ ادب اُردو،(جلد چہارم) ڈاکٹر جمیل جالبی، ص(۸۱۵)

۲۱۔حیات جاوید محولہ بالا ص(۹۰)بحوالہ تاریخ ادب اُردو، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص(۸۱٦)

۲۲۔ تاریخ ادبِ اُردو(جلد چہارم)،ڈاکٹر جمیل جالبی ص(۸۱٦)

۲۳۔حیات جاوید،محولہ بالا ص(۹۳۔۹۴)بحوالہ تاریخ ادب اُردوڈاکٹر جمیل جالبیص(۸۱٦)

۲۴۔ تاریخ ادب اُردو(جلد چہارم)ڈاکٹر جمیل جالبی، ص(۸۱۸)

۲۵۔ تاریخ ادب اُردو(جلد چہارم)ڈاکٹر جمیل جالبی، ص(۸۱۸)

۲٦۔ ایضاً ص(۸۱۹)

۲۷۔ ''اُردو کی علمی ترقی میں سرسید اور اُن کے رفقاء کار کا حصہ'' ڈاکٹر اے۔ایچ ۔کوثر لائبریری

پروموشن بیورو، کراچی ۱۹۸۴ ص(۹۸)

۲۸۔ تاریخ ادب اُردو(جلد چہارم)ڈاکٹر جمیل جالبی، ص(۸۶۱)

۲۹۔ ایضاً ص(۸۶۱)

۳۰۔مقالات سر سید،(جلد ہشتم)،مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی مجلس ترقی ادب،لاہور۱۹۶۲ص(۱۰۴) بحوالہ تاریخ ادب اُردو،ڈاکٹر جمیل جالبی ص(۸۶۱)

۳۱۔مقالات سر سید، (جلد دہم)مجلس ترقی ادب،لاہور، ص(۷۵۔۷۶)بحوالہ تاریخ ادب اُردو ،ڈاکٹر جمیل جالبی ص(۸۶۶)

۳۲۔مقالات سر سید، (جلد دہم)مجلس ترقی ادب،لاہور، ص(۴۸)بحوالہ تاریخِ ادب اُردو ،ڈاکٹر جمیل جالبی ص(۸۶۳۔۸۶۴)

۳۳۔ تاریخ ادب اُردو(جلد چہارم)ڈاکٹر جمیل جالبی ص(۸۶۴)

۳۴۔ تاریخ ادب اُردو(جلد چہارم)ڈاکٹر جمیل جالبی ص(۸۸۳)

۳۵۔ ایضاً ص(۸۲۱)

۳۶۔ ایضاً ص(۸۴۵)

۳۷۔ایضاً ص(۸۵۳)

۳۸۔ سر سید احمد خان اور اُن کے رفقاء کی اُردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ ،ڈاکٹر سید عبداللہ سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور۲۰۰۸ ص (۳۱)

۳۹۔ڈاکٹر جمیل جالبی (بڑی مشکل ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا)مرتب ڈاکٹر خاور جمیل،اسیٹ پبلشرز کراچی ۲۰۱۶ ص(۱۳۰)

۴۰۔ ایضاً ص(۱۳۰)

۴۱۔ ماہ نامہ قومی زبان،''ڈاکٹر جمیل جالبی،تاریخ ادب اُردو،گیان چند جین''اکتوبر۲۰۱۹ اشاعتِ خاص(ڈاکٹر جمیل جالبی) ص(۱۱۳)

☆☆☆

ڈاکٹر جمیل جالبی...... تعلق اور تحقیق کی خوشبو

ڈاکٹر زاہد منیر عامر
پروفیسر و صدر شعبہ اردو،
پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، لاہور۔ پاکستان

ABSTRACT:

Dr Jamil Jalibi (1929-2019) is a well-known writer, literary historian and critic. There are over thirty books on these genres, to his credit. He wrote a matchless History of Urdu Literature and edited a legendary literary magazine, *Naya Daur*, for many years. In this article, the author has remembered him, through his personal reflections. Unpublished letters of Dr Jamil Jalibi, addressed to the author, have also been produced here. These letters not only express his sentiments towards his addressee but also reflect his own personality through the words of affection and literature. Questions raised by the author are also answered by the literary genius. Issues requiring explanations have been expounded on, in the endnotes.

Keywords: Dr Jamil Jalibi, unpublished letters, Nizami Dakni, modern criticism, *History of Urdu Literature*, Poetics, First literary book of Urdu literature.

انھیں میرے متعلق ہی نہیں ہر ایک کے متعلق عام طور پر معلوم ہوتا تھا کہ وہ کون ہے، کیا ہے، اس کا خاندان کہاں سے متعلق ہے، اس کی دادی کے کتنی مرتبہ آپریشن ہوا تھا، اس کی نانی کی موت کس

مرض میں واقع ہوئی تھی اوراس کے ایک خالو کو کس جرم میں حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی، یہ مقدمہ کن عدالتوں میں رہا،کس کس وکیل نے کیا جرح کی وغیرہ وغیرہ............

یہ تو دادا کا حال تھا، پوتے کا حال یہ تھا کہ اسے اپنے ذہن پر کسی غیر ضروری یادداشت کا بار ڈالنا تک گوارا نہ تھا۔ وہ اتنا عملی انسان تھا کہ اسے اگر کسی کا ٹیلی فون نمبر بھی یاد ہو جاتا تو وہ کوشش کر کے اسے بھلا دیتا تھا تا کہ ذہن کی اس جگہ میں کسی کام کی بات کو رکھا جائے، ٹیلی فون نمبر تو ایک ڈائری بھی یاد رکھ سکتی ہے۔جالبی صاحب نے مجھ سے یہ بات اس وقت کہی جب موبائل ٹیلی فونوں نے فون نمبر یاد رکھنے کا کام نہیں سنبھالا تھا۔آغازِ کلام کی سطور شوکت تھانوی کی ہیں جنھوں نے شیش محل میں جالبی صاحب کے دادا کے بھائی جالب دہلوی کا خاکہ اڑایا ہے۔اس خاکے کو پیش نظر رکھیں تو جالب اور جالبی میں ایک اور فرق بھی معلوم ہوتا ہے...... بہت بڑا فرق۔دادا کا عالم یہ تھا کہ کسی نے سوال کیا اور وہ جھاڑ کا کانٹا بنے۔ان کے بے پناہ علم اور تجربے کا دریا بہتا رہتا یہاں تک کہ سائل اپنے سوال پر پچھتا تا ہوا غائب ہو جاتا۔جالب دہلوی کے برعکس جالبی صاحب کا یہ عالم تھا کہ سوال کے بقدر جواب ملتا۔گنے چنے الفاظ، جو نہایت سلیقے سے سوچ سمجھ کر ادا کیے جاتے اور سائل کے پاس اگر مزید سوال نہ ہوتا تو جواب کی تکمیل پر گویا اسے رخصت کی اجازت مل جاتی۔ان کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ان کے کاموں کی فہرست اوران کی مصروفیات کی جانب دیکھیں تو معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سب کام ایک شخص نے کیے ہیں۔ایک تاریخ ادب اردو ہی کو لیجیے۔جس میں انھوں نے دکنی ادب سے انیسویں صدی تک کے زمانے کا احاطہ،اپنے کام کو بنیادی مآخذ پر استوار کر کے کیا ہے۔جس کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ ادب اگر زندگی کا آئینہ ہے تو ادب کی تاریخ کو بھی اس دور کے ادب کا آئینہ ہونا چاہیے اور آئینہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ پوری تہذیب، پوری تہذیبی تاریخ، اپنے سارے رجحانات، اپنے سارے میلانات کے ساتھ ادب کی تاریخ میں آجانی چاہیے تا کہ جب آدمی تاریخ پڑھے تو اس دور سے بھی پوری طرح واقف ہو جائے۔اردو ادب کی جتنی تاریخیں لکھی جا چکی ہیں ان میں اگر کوئی تاریخ اس تعریف پر پوری اترتی دکھائی دیتی ہے تو وہ جالبی صاحب ہی کی تاریخ ہے۔صرف تاریخ ادب اردو نہیں ،قدیم دکنی مخطوطات سے تعلق،مثنوی کدم راؤ پدم راؤ جیسے مشکل متن کی تدوین(۱۹۷۳ء)دیوان حسن شوقی (۱۹۷۱ء)دیوان نصرتی (۱۹۷۲ء)قدیم اردو کی لغت (۱۹۷۳ء)

قومی انگریزی اردولغت (۱۹۹۲ء)فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ کی دوجلدیں(۱۹۹۱ء،۱۹۹۳ء)ایلیٹ کے مضامین کا ترجمہ(۱۹۶۰ء)، میراجی جیسے شاعر کے متن کی جمع آوری (۱۹۸۹ء) راشداورمیراجی جیسے جدید تر شاعروں کے فن اور شخصیت کا مطالعہ (۱۹۸۶ء،۱۹۹۰ء)۔مغرب کی ڈھائی ہزار سالہ ادبی تاریخ کے شاہ کار مضامین کا ترجمہ ارسطو سے ایلیٹ تک (۱۹۷۵ء) تنقیداور تجربہ(۱۹۶۷ء)نئی تنقید(۱۹۸۵ء) ادب، کلچراورمسائل (۱۹۸۶ء) محمد تقی میر (۱۹۸۱ء)معاصرادب(۱۹۹۱ء)قلندر بخش جرات (۱۹۹۰ء) جیسے تنقیدی مضامین کے مجموعے،ساقی میں کالم نگاری اور نیادور جیسے ادبی جریدے کی ادارت اوران سب کے ساتھ انتظامی مصروفیات۔وہ بھی کیسی؟ کمشنر انکم ٹیکس، کراچی یونی ورسٹی کی وائس چانسلری، مقتدرہ قومی زبان کی سربراہی......اللہ اللہ ایک انسان تھا یا انسانوں کی کوئی جماعت جس نے مل کر یہ سب کارنامے انجام دیے......؟ایک ایسے دور میں جب ادب کی لگن عام نہ ہواور معاشرہ محض مادی مفادات کے پیچھے بھاگ رہا ہو، ملازمتیں تو خیر ضرورت کے تحت کی جاتی ہیں لیکن ایسے علمی وتنقیدی کام جن کے ساتھ کوئی مادی مفاد بھی وابستہ نہ ہو، ذوق وشوق کے بغیر ممکن نہیں فقط ذوق وشوق کی بنا پر اتنے کاموں کا انجام دینا معمولی بات نہیں۔ممتاز مفتی نے درست کہا تھا کہ ان کے کاموں کی فہرست مور کی دم کی طرح اتنی لمبی اور بھڑکیلی ہے کہ ساری توجہ دُم ہی پر مرکوز ہوکر رہ جاتی ہے اوران کی شخصیت نظرانداز ہوجاتی ہے۔[1] خوبیٔ قسمت سے،راقم کو، جالبی صاحب کے کاموں ہی سے نہیں ان کی شخصیت سے بھی تعارف کا موقع ملا۔ایک باران سے ان کے کاموں اور کامیابیوں کا راز دریافت کیا تو کہنے لگے؛ میں نے دیکھا ہے کہ زندگی میں اگر آدمی کے پاس دس فیصد ذہانت ہواور وہ نوے فیصد محنت کرسکتا ہوتو کامیابی کے لیے اتنا کافی ہے۔

محمد جمیل خان، یوسف زئی پٹھان تھے ان کا ددھیال میرٹھ اورننھیال سہارنپور کا تھے۔وہ دس بہن بھائیوں میں پہلوٹھی کے تھے۔والدہ شعر کہتی تھیں، والدانھیں ادب سے دوررکھنا چاہتے تھے۔ان کی شخصیت میں یہ دونو رویّے جمع ہوگئے۔شروع میں شعر کی طرف مائل ہوئے لیکن پھر انھوں نے خودکو دریافت کرلیا لیکن یہ عمل خاصا طویل ثابت ہوا۔انگریزی، فارسی اوراردو میں ایم اے کیا، قانون کی ڈگری حاصل کی، سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا،، پی ایچ ڈی کی، ڈی لٹ کی ڈگری ملی......اس سارے سفر میں

ادب ان کی پہلی اور آخری محبت ثابت ہوا۔ اردو ادب کی خوش قسمتی کہ انگریزی ادب کا یہ طالب علم اس کی جانب متوجہ ہوا جس نے اردو کے دامن کو کلاسیکیت ہی سے نہیں جدید مغربی سرمائے سے بھی ثروت مند کیا۔ انھیں اسکول میں داخلے کے لیے لے جایا گیا تو کم عمری کی بنا پر داخلہ نہ ملا۔ اگلی بار والد انھیں علی گڑھ کٹ پاجامہ، شیروانی اور ترکی ٹوپی پہنا کر لے گئے تو عمر میں بڑے نظر آنے لگے اور داخلہ مل گیا۔ انھوں نے عملی زندگی کا آغاز بھی ایک اسکول کی ملازمت سے کیا لیکن اپنے اسی اصول کی بنا پر جس کا سطور ماقبل میں ذکر ہوا ترقی کرتے کرتے وائس چانسلری تک پہنچے۔

راقم کے دور طالب علمی کی بعض کتب ان سے اوّلین رابطے کا ذریعہ بنیں۔ یہ ۱۹۸۹ء کی بات ہے۔ انھوں نے راقم کی طالب علمانہ کاوشوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے انھیں فکر اور فلسفہ کو عہد حاضر کے حوالے سے ادب کا حصہ بنانے کی قابل تعریف کوشش قرار دیا۔ جس سے کم عمر مصنف کا حوصلہ بڑھا لیکن ان سے پہلی بار ملاقات کا موقع ۱۹۹۱ء میں ملا۔ وہ اس زمانے میں مقتدرہ قومی زبان کے سربراہ تھے۔ اپنے کسی سلسلے میں لاہور تشریف لائے۔ عزیز جاپانی دوست سویامانے، نے کہا کہ جالبی صاحب آ رہے ہیں ملنے چلیں گے......؟ میں بخوشی تیار ہو گیا۔ ادبی کتب کے مشہور اشاعتی ادارے سنگ میل پبلشرز پر ہماری پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ ایک موٹی سی کتاب ہاتھ میں لیے کہہ رہے تھے کہ کلیات جعفر زٹلی بھی اسی انداز سے شائع ہونی چاہیے۔ انھیں جعفر زٹلی کے کلام سے خاص دلچسپی تھی۔ انھوں نے اس کے کلام کے کئی نسخے جمع کر رکھے تھے، لندن سے ایک مائیکرو فلم بھی منگوائی تھی۔ تاریخ ادب اردو کی دوسری جلد میں انھوں نے اس پر جو کچھ لکھ دیا ہے وہ شاید کہیں اور نہیں ملے گا۔ ان کے بہ قول جعفر، ذہین، طباع، تیز مزاج، حاضر جواب اور اکڑفوں والے انسان تھے۔ زبان میں ایسی کاٹ کہ جس پر چل گئی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ قادر الکلام ایسا کہ جس بات کو جس طرح چاہا ادا کر دیا، قوتِ اختراع ایسی کہ اظہارِ بیان کے لیے بے شمار نئے الفاظ وتراکیب وضع کر ڈالیں۔ ان کے مطابق جعفر زٹلی ایک ایسا منفرد شاعر ہے جس کے کلام سے اس دور کے نہ صرف حالات وعوامل کا پتہ چلتا ہے بلکہ معاشرتی وتہذیبی گراوٹ اور سیاسی واخلاقی زوال کے بنیادی اسباب کا بھی پتا چلتا ہے۔ جعفر نے غزل کو اپنے اظہار کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اپنے مخصوص مزاج کی تندی و تیزی، راست بازی وحق گوئی کے باعث بے باکی کے ساتھ ایسی نظمیں لکھیں جن کے احاطہ اثر میں سارا معاشرہ آ گیا۔ جعفر کے ان اوصاف کے باوصف ادب کا عام قاری اسے فحش نگار یا ہزل گو سے زیادہ کوئی

حیثیت نہیں دیتا۔[۲] سنگ میل کے مینیجنگ پارٹنر غالباً اعجاز مرحوم نے جعفر زٹلی جیسے شاعر کے کلام کی اشاعت کی راہ میں حائل سماجی عوامل کا ذکر کیا تو جالبی صاحب کہنے لگے کہ ایک پٹی چھاپ کر اس پر لپیٹ دی جائے جس پر لکھا ہو ''صرف محققین کے لیے''۔

اس ملاقات کی یاد کچھ تصویروں کی شکل میں اب تک محفوظ ہے۔ان کا تاریخ ادب کا منصوبہ جاری تھا، پہلی دو جلدیں چھپ چکی تھیں اور ہم ادب کے طالب علم کے طور پر انھیں دیکھ کر مبہوت ہوتے رہتے تھے۔میں نے انھیں بتایا کہ میں دیوان میر سوز کے ایک خطی نسخے پر کام کر رہا ہوں۔اس کام کے دوران مجھے ۱۲۷۲ھ کی مکتوبہ ایک بیاض ملی ہے۔اس بیاض میں میر سوز کا انتخاب بھی ہے۔بیاض خاصی قیمتی ہے اور اس میں سوز کے علاوہ نیاز، قدسی، امیر خسرو اور سودا کا کلام بھی موجود ہے۔انھوں نے میری باتوں میں دلچسپی لی اور میری اس خواہش پر کہ وہ کچھ وقت نکال کر یہ بیاض دیکھ لیں، مثبت ردِعمل ظاہر کیا۔یہی نہیں وہ سچ مچ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری تشریف لے گئے اور انھوں نے اس بیاض کو ملاحظہ فرمایا اور واپس اسلام آباد جا کر مجھے اس بیاض کے بارے میں ایک مفصل خط تحریر فرمایا۔یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔اس خط کے بعد ان سے مزید خط کتابت ہوئی۔بیاض سے متعلق انھوں نے جس دلچسپی کا مظاہرہ کیا اس سے حوصلہ پا کر میں نے انھیں کراچی کے اردو لغت بورڈ کی لائبریری میں محفوظ ایک اور خطی نسخے کی جانب متوجہ کیا۔انھوں نے اس پر بھی کمال مہربانی کا مظاہرہ کیا اور اپنے دورۂ کراچی کے دوران اردو لغت بورڈ کی لائبریری میں تشریف لے گئے اور میرے نشان دادہ خطی نسخے کو دیکھ کر اس کی تاریخ کتابت کے بارے میں مجھے خط لکھا۔اس نسخے کے کاتب کا نام سید میر تھا جس سے گمان ہوتا تھا کہ شاید یہ میر سوز کا اپنا کتابت کردہ نسخہ ہو کیونکہ راقم میر سوز کے ایک دستخطی نسخے سے واقف اور اس کی جستجو میں تھا اس لیے جالبی صاحب سے دریافت کیا کہ کہیں یہ وہی نسخہ تو نہیں ہے جس پر انھوں نے لکھا کہ وہ نسخہ میر سوز کا لکھا ہوا نہیں ہے۔مزید معلومات کے لیے انھوں نے لغت بورڈ کی لائبریرین سے میرا رابطہ کروادیا۔یہ وہ دن تھے جب وہ ماریشس کی عالمی اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے پاکستانی وفد کے ساتھ ماریشس جا رہے تھے۔

راقم نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تو انھوں نے اس پر مبارک باد کا خط لکھا اور دعاؤں سے نوازا۔ایچی سن کالج سے متعلق راقم کی یادنگاری کی حوصلہ افزائی کی اور رسالے میں چھپنے والے اس مضمون کو ایسا مربوط قرار دیا جس میں کسی قسم کے اضافے کی ضرورت نہیں انھوں نے اس کام میں تحقیق کو تخلیق سے

آمیز پایا اور اسے جلد کتابی صورت میں شائع کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ راقم کی تحریروں کو خواہ وہ نظم ہوں یا نثر دل چسپی سے پڑھتے اور اسے اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازتے تھے۔ راقم نے ان سے اپنے شعری مجموعے پر پیش لفظ لکھنے کی فرمائش کی تو انھوں نے اسے بہ کمال محبت پورا کیا اور ''تقریش'' کے عنوان سے ایک حوصلہ افزا پیش لفظ تحریر فرمایا حالانکہ ان دنوں وہ بہ قول خود'' تاریخ ادب اردو کی تیسری جلد میں دھنسے ہوئے تھے۔'' راقم کی کتاب تاریخ جامعہ پنجاب شائع ہونے کی خبر ان تک پہنچی تو انھوں نے اسے پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا اور پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر سے اس کا ایک نسخہ حاصل کرنے کی گزارش کی۔ وہ راقم کے ساتھ کیسا اخلاص رکھتے تھے اس کا اندازہ ان کی ان دعاؤں سے کیا جا سکتا ہے جو راقم سطور کے لیے ان کے قلم سے تراوش ہوئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بس کام میں لگے رہیے اور اچھے اچھے کام کرتے رہیے آپ سے بڑی امیدیں ہیں ان شاء اللہ کامیاب ہوں گے۔ شکر ہے کہ وہ نہ صرف تیسری جلد مکمل کر سکے بلکہ انھوں نے اپنے منصوبے کی چوتھی جلد بھی مکمل کی۔ چار ہی جلدیں ان کے پیش نظر تھیں یہ الگ بات کہ چوتھی جلد انیسویں صدی پر ختم ہوگئی اور بیسویں صدی کے ہنگامہ خیز دور کا احاطہ نہ ہو سکا۔ جب وہ مقتدرہ میں تھے تو اس زمانے میں انھوں نے پاکستان ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام ''گیسٹ آور'' میں فرمایا تھا کہ میں اب تاریخ ادب کو مکمل کرنے کے لیے مقتدرہ سے جانا چاہتا ہوں کیونکہ میرے حساب سے اگر میں دن رات کام کروں تو بقیہ دو جلدوں کے لیے مجھے چودہ سال درکار ہیں، عمر تو ماشا اللہ بڑھ رہی ہے، قیامت کے بورے کس نے سمیٹے ہیں۔ یہ بات ۲۵ ستمبر ۱۹۹۴ء کی ہے۔ اس وقت وہ پینسٹھویں برس میں تھے۔ وہ مزید چودہ برس کے حساب سے اناسی اسی برس کو بھی زیادہ خیال فرما رہے تھے۔ اللہ نے انھیں نوے برس دیے۔ آخری چند برسوں کی شدید علالت کو نکال دیا جائے تو بھی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اس مہلت کا کوئی حصہ ضائع نہیں کیا۔

افسوس کہ ان کے ساتھ مراسلت طویل وقفوں کا شکار رہی۔ ملاقاتوں کا آغاز تو جیسا کہ عرض کیا گیا، ایم اے کے زمانہ طالب علمی میں ہوا لیکن ان میں اضافہ اس وقت ہوا جب راقم اسلام آباد میں مقیم ہوا۔ جالبی صاحب کی مقتدرہ قومی زبان کی صدرنشینی کا زمانہ چل رہا تھا۔ ایک بار انھوں نے فون کر کے مجھے بلوایا۔ انھیں معلوم تھا کہ میں ایم اے کر چکا ہوں اور کسی معقول ملازمت کی تلاش میں ہوں۔ کہنے لگے کہ مجھ سے ریڈیو پیکنگ والوں نے رابطہ کیا ہے، انھیں اپنی اردو سروس کے لیے آپ جیسے کسی

نوجوان کی ضرورت ہے۔ کیا آپ چین جانا پسند کریں گے......؟ میں نے سوچنے کے لیے کچھ مہلت طلب کی جو انھوں نے بخوشی دے دی اور کہا ٹھیک ہے جب آپ مجھے جواب دیں گے تو میں انھیں بتاؤں گا ۔ کچھ دنوں کے بعد ان کے دفتر سے وقت لے کر میں جب ان کی خدمت میں حاضری کے لیے جا رہا تھا تو میرا مستعار اور بیمار موٹر سائیکل راستے میں خفا ہو گیا۔ بہت منانے کے باوصف نہ مانا جس کے باعث میں مقررہ وقت پر ان کے دفتر نہ پہنچ سکا۔ جب میں ان کے پی اے کے پاس پہنچا تو مجھے بے اعتنائی کا احساس دلایا گیا۔ پی اے نے کہا جالبی صاحب کو کہیں جانا تھا وہ آپ کا انتظار کر کے چلے گئے ہیں لیکن اس کے انداز سے یوں لگتا تھا جیسے وہ سچ نہیں بول رہا اور جالبی صاحب اپنے دفتر میں موجود ہیں۔ میں دفتر کے ماحول کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ مایوس ہو کر واپس آ گیا۔ اس کے بعد بار دگر جب جالبی صاحب سے ملاقات کا وقت طے ہوا تو خوبی قسمت سے راستے کی کوئی مشکل رکاوٹ نہ بنی اور میں وقت مقررہ پر ان کے دفتر پہنچ گیا۔ کہنے لگے اس روز میں دانستہ آپ سے نہیں ملا۔ اس طرح میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ انسان کی زندگی میں ایک وقت آتا ہے جب دوسرے اس کا انتظار کرتے ہیں۔ اس وقت کے آنے سے پہلے اسے دوسروں کا انتظار کرنا ہوتا ہے......ان کی یہ بات زندگی کے تجربے پر مبنی تھی یوں بھی وہ ایک سینئر اور بزرگ شخصیت تھے اور راقم ایک خورد اور تازہ تازہ ایم کرنے والے ایک نوجوان کی حیثیت سے ملازمت کا جویا......لہٰذا میں نے ان کے اس رویے کو درست سمجھا۔

چین کی پیش کش کے حوالے سے میں کچھ ایسی مثالوں پر غور کرتا رہا تھا جنھوں نے اپنے کیریر کے اوائل میں بیرون وطن کا سفر اختیار کیا، جب واپس آئے تو کسی ادارے سے وابستہ ہونے کی عمر سے گزر چکے تھے اس لیے وہ زندگی بھر ادھر ادھر گردش کرتے رہے اور جم کر کسی ادارے کی خدمت نہ کر سکے۔ دوسرے مجھے یہ خیال بھی تھا کہ اگر میں ابھی وطن سے باہر چلا گیا تو میرے باطن میں اپنے وطن کے لیے جو جذبات ہیں جن کا اظہار میں اپنی دور طالب علمی کی تصانیف اور خاص طور پر لمحوں کا قرض میں بھی کر چکا تھا، ان کے بروئے کار آنے کی کوئی صورت نہ رہے گی اور میری توانائیوں کا زمانہ دیارِ غیر ہی میں گزر جائے گا۔ میں نے اپنے یہ تمام احساسات جالبی صاحب کے سامنے رکھ دیے۔ وہ میرے خیالات جان کر نہایت خوش ہوئے اور میرے انکار سے آزردہ ہونے کے بجائے کہنے لگے بالکل درست ہے آپ کو اسی طرح سوچنا چاہیے۔ اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو اس مرحلے پر میں بھی باہر جانا قبول نہ کرتا،

ٹھیک ہے میں ان لوگوں کو آپ کے انکار سے آگاہ کردوں گا۔

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب مرحوم ومغفور مقتدرہ میں ان کے پیش رو تھے۔وہ بڑے مردم شناس، صاحب علم اور فعال شخصیت کے مالک سربراہ تھے۔غضب کا حافظہ پایا تھا ایک بار جس سے مل لیتے وہ ہمیشہ کے لیے ان کے حافظے کی تختی پر محفوظ ہو جاتا۔جس شخص میں کوئی صلاحیت دیکھتے اسے اس کے حسبِ حال کام پر لگا دینا چاہتے۔راقم نے اپنے دور طالب علمی میں مولانا ظفر علی خان کے خطوط کا اوّلین مجموعہ مرتب کیا تھا یہ مجموعہ ان کی نظر سے گزرا تو انھوں نے باوجود یکہ راقم ابھی کالج کا ایک کم سواد طالب علم تھا اس سے مولانا ظفر علی خان کی کتابیات تیار کرنے کی فرمائش کی۔یہ ملاقات مقتدرہ قومی زبان کے لاہور آفس میں، جو اس زمانے میں ریواز گارڈن میں تھا، ہوئی (اب تو مقتدرہ اور اور اس کا لاہور آفس دونو مرحوم ہو چکے)اس ملاقات میں ڈاکٹر انور سدید مرحوم بھی شریک تھے بلکہ وہی مجھے ڈاکٹر صاحب سے ملوانے کے لیے لے گئے تھے۔میں نے ہامی بھر لی اور کچھ ہی دن میں کتابیات کا مسودہ تیار کرکے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھجوا دیا لیکن اس کی اشاعت میں اس قدر تاخیر ہوئی کہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا دور ختم ہو گیا اور جالبی صاحب مقتدرہ کے سربراہ بن کر آ گئے۔انھوں نے اپنے پیش رو کے کیے ہوئے معاہدوں اور منصوبوں کو جاری رکھا۔یوں ان کے عہد میں میری مرتب کردہ کتابیات مقتدرہ سے شائع ہو گئی۔[۳] میرے لیے خاص بات یہ تھی کہ جالبی صاحب نے اس کتابیات پر پیش لفظ بھی لکھا۔انھی کے دستخطوں سے مجھے حق تصنیف کا چیک ملا۔ان کے اس اندازِ کار کے باوصف ڈاکٹر وحید قریشی صاحب ان سے کچھ نالاں ہی رہتے تھے۔کہا کرتے تھے کہ تاریخ ادب اردو کا کام میرے گھر بیٹھ کر افسر صدیقی نے کیا ہے۔یا پھر یہ فرمایا کرتے تھے کہ قومی انگریزی اردو لغت کا سارا منصوبہ میں بنا کر آیا تھا جالبی صاحب نے اس پر اپنا ٹھپا لگا کر چھاپ دیا درآنحالیکہ جالبی صاحب کا کہنا تھا کہ انھوں نے زندگی میں بہت محنت کی ہے لیکن اتنی کسی منصوبے پر نہیں کی جتنی انگریزی اردو لغت پر ہوئی ہے۔''اگر کام کرنے کے گھنٹوں کو شمار کیا جائے اور ان راتوں کو بھی جن میں یہ کام ہوا تو اس پر کم وبیش دس سال کے برابر عرصہ لگا ہے ویسے یہ کام تقریباً ساڑھے تین سال میں بفضل تعالیٰ پایہ تکمیل کو پہنچا ہے''[۴] وغیرہ وغیرہ۔عربی میں کہا جاتا ہے کہ من صنف فقد استہدف جو تصنیف کرتا ہے وہ دوسروں کے اعتراضات کا ہدف بھی بنتا ہے۔اگر کوئی شخص دس ریسرچ اسسٹنٹ رکھ کر بھی تاریخ ادب اردو ایسی کتاب لکھ دے تو اسے

سر آنکھوں پر بٹھانا چاہیے۔ کچھ ایسے ہی اعتراضات بعض دوسرے اصحاب کی جانب سے بھی سننے میں آئے۔ ایک بار ڈاکٹر وزیر آغا نے راقم سے کہا کہ ایک اہل قلم کانفرنس میں دو دو ادیبوں کو ایک کمرے میں ٹھہرایا جا رہا تھا۔ جب مجھ سے پوچھا گیا کہ میں کس کے ساتھ رہنا چاہوں گا تو میں نے جالبی صاحب کا نام لیا۔ ان دنوں میں کلچر کے بارے میں پڑھ رہا تھا اور جالبی صاحب کی اس سے پہلے اسی موضوع پر اردو اور انگریزی کتب شائع ہو چکی تھیں۔ اردو میں ان کی کتاب پاکستانی کلچر: قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ [۵] اور انگریزی میں [۶] *Pakistan the Identity of Culture* اور *Pakistani Culture* شائع ہو چکی تھیں۔ وہ عزیز احمد کی کتاب *Islamic Culture* کا اردو ترجمہ برصغیر میں اسلامی کلچر [۷] کے نام سے کر چکے تھے۔ انھیں پاکستانی کلچر پر ۱۹۶۵ء کا داؤد ادبی انعام بھی مل چکا تھا۔ میں ان کے ساتھ غرفہ نشیں ہوا تو میرے ذہن میں بہت سے مباحث اور سوالات تھے لیکن افسوس کہ وہ کلچر سے متعلق کسی بھی موضوع پر بات نہ کر سکے اور مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا سے یہ بات سننے کے بعد راقم نے کلچر سے متعلق جالبی صاحب کی کتب دیکھیں۔ پاکستانی کلچر کو اچھی خاصی فکر انگیز کتاب پایا۔ جس میں مصنف نے بڑی آزادہ روی سے بہت اہم موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ اختر حسین رائے پوری کی یہ رائے کہ یہ کتاب اس مشکل مسئلہ پر مدلل اور تفصیلی بحث کرتی ہے اور خیال و اظہار کی آزادی کی قابل تعریف مثال ہے، قابل توجہ معلوم ہوئی۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اس نے اس کتاب کو لکھنے سے پہلے اور لکھتے وقت بہت دکھ اٹھائے اور اس بے چینی کو پایا جو اس کے خیال میں اچھے ادب کی عطا ہوتی ہے۔ مصنف نے اپنے مآخذ کا اعتراف فراخ دلی سے کیا ہے اور اپنے قاری کو بتا دیا ہے کہ ''یوں تو میں نے اس کتاب کے لکھنے میں متعدد کتابوں سے استفادہ کیا ہے لیکن خاص طور پر سائنس آف کلچر کے تیرھویں باب سے اپنی کتاب کے چھٹے باب کو اور کلچر اینڈ ہسٹری کے چوتھے اور پانچویں باب سے اپنی کتاب کے دوسرے باب کے ایک حصے کو سجایا ہے [۸] عزیز احمد (م: ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۸ء) کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ برصغیر میں اسلامی کلچر دیکھنے سے بھی مصنف کے ہاں اس موضوع سے لگن کا احساس ہوا۔ یہی نہیں انھوں نے عزیز احمد کی ایک اور کتاب *Islamic Modernism* کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالا جو برصغیر میں اسلامی جدیدیت کے نام سے شائع ہوئی [۹]۔ ان دونو کتابوں کی جانب متوجہ

ہونے اور ترجمے کے لیے منتخب کرنے کے پس پردہ مترجم کا یہ احساس ہے کہ ہم زندگی کو آگے بڑھانے والے بڑے اور بنیادی سوالوں سے غافل ہو کر صرف عظمتِ رفتہ کے خواب دیکھنے میں مصروف ہیں۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ہم اپنے عمل سے ناانصافیوں کو قائم اور قرآن کی نفی کر رہے ہیں۔ اسی تاریخی شعور کے فقدان کی وجہ سے ہم اسلام جیسی متحرک و نامیاتی قوت کو آگے بڑھنے والی زندگی کے بڑے دھارے سے کاٹ کر اسے منجمد کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ عزیز احمد کی یہ دونو کتابیں مطالعہ تاریخ کے ذریعے ہمیں اپنے افکار و اقدار کا جائزہ لینے پر اکساتی ہیں اور ہمارے اندر سوئے ہوئے تاریخی شعور کو بیدار کرتی ہیں [۱۰] سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جالبی صاحب کا اس موضوع سے اتنا گہرا تعلق تھا تو ڈاکٹر وزیر آغا جیسے جینوئن نقاد کے ہاں اس احساس نے کیوں جنم لیا جس کا سطور بالا میں ذکر ہوا؟۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ جالبی صاحب محنت اور مطالعے کی مدد سے تصنیف کا ملکہ رکھتے تھے لیکن یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر مصنف اپنے موضوعات پر بات بھی کر سکتا ہو (اگر چہ آئیڈیلی ایسا ہونا چاہیے)یوں بھی جالبی صاحب کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ تقریر کے آدمی نہیں تھے ۔کراچی یونی ورسٹی کی وائس چانسلری کے دوران بھی وہ ہمیشہ لکھی ہوئی تقریر پڑھا کرتے تھے [۱۱] یہی نہیں کہ وہ تقریر کے آدمی نہیں تھے بلکہ بہ قول خود تقریب کے بھی آدمی نہیں تھے ان کا کہنا تھا کہ لوگوں کی مہربانی ہے کہ مجھے بلاتے ہیں، منصب صدارت پر بٹھانے کے خواہاں ہوتے ہیں، میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور پھر معذرت کر لیتا ہوں کہ میں تقریب کا آدمی ہی نہیں ہوں [۱۲] وہ تقریر اور تقریب کے آدمی نہیں تھے لیکن اس کے باوصف وہ تقریر اور تقریب دونو کو نبھانا جانتے تھے اور اس میں کیا شبہ ہے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے منتظم تھے۔

ان کی تحریروں میں یہ احساس جھلکتا دکھائی دیتا ہے کہ آزادی کے بعد سے کسی شعبہ زندگی میں ہم نے کوئی عظیم ہستی پیدا نہیں کی اور نہ کوئی قابل فخر عظیم کارنامہ انجام دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہم ذہنی قیادت کے لیے صرف اور صرف دوسری اقوام کی طرف دیکھنے اور ان پر تکیہ کرنے کی خدمت ضرور انجام دے رہے ہیں [۱۳] اس صورت حال کا باعث ان کے خیال میں یہ ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام انسانی نفسیات کے مسلمہ اصولوں سے منحرف اور ان بنیادوں سے محروم ہے جن پر اسے استوار ہونا چاہیے تھا۔ جس کا ایک نتیجہ معاشرے میں عوام اور خواص کے الگ الگ طبقات میں تقسیم ہو جانے کی صورت میں نکلا ہے۔ عوام یعنی مزدور، کسان، کلرک، فقیر، بھکاری اور رعیت اور خواص جن میں زمیندار، جاگیر دار، سردار، سائیں اور

دولت مند طبقہ شامل ہے یہی ملک کے اقتدار و وسائل پر قابض ہیں۔ جالبی صاحب کہتے ہیں کہ زمینیں ان کی ملکیت ہیں، تجارت وصنعت ان کے تصرف میں ہے، سرکاری ملازمتوں کی صورت میں اختیار کی کنجیاں ان کے پاس ہیں، قانون ساز اداروں میں وہی عوام کے نمائندہ ہیں۔ [۱۴] ایسے میں عوام جبر و استحصال کا شکار ہیں، انصاف اور اہلیت کا تصور بے معنی ہوگیا ہے۔ آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور مسائل کی شدت اس انقلاب کی راہ ہموار کر رہی ہے، جسے صرف اور صرف حقیقی انصاف ہی کے ذریعے روکا جاسکتا ہے [۱۵] ان کے خیال میں طبقات کی باہمی خلیج اتنی گہری ہے کہ خواص کا تعلیم یافتہ طبقہ خود کو اس معاشرے میں اجنبی محسوس کرتا ہے اور ہمارے قومی و تاریخی ہیرو اس کے ہیرو نہیں رہے ہیں [۱۶] ان کے خیال میں اس تفریق کا باعث تعلیمی نظام کا نقص ہے۔ وہ معاشرے کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ فرد، جدید تعلیم کے پروردہ، انگریزی ادبیات میں ایم اے، سی ایس پی، اعلی انتظامی عہدوں پر فائز رہنے والے ایک کامیاب شخص تھے۔ وہ ملک کی ایک بڑی جامعہ کے وائس چانسلر بھی رہے اس تمام تجربے کے بعد انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہماری تعلیم، طالب علم کے ذہن میں اترنے اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں ناکام رہی ہے [۱۷] ان کے تجزیے کے مطابق اس کا بڑا سبب نظام تعلیم کا ایک اجنبی زبان پر استوار ہونا۔ ہمارا ذریعہ تعلیم ۱۸۳۵ء سے انگریزی ہے۔ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوصف یہ نظام بڑی شخصیتیں پیدا نہیں کر سکا۔ انھوں نے ماضی قریب کی تاریخ سے مثالیں دے کر بتایا کہ دہلی کالج کے وہ طالب علم جو اردو میں تعلیم پاتے، سائنس میں انگریزی ذریعہ تعلیم والے طالب علموں سے بڑھے ہوئے تھے۔ رُڑکی انجینئرنگ کالج ہو یا آگرہ میڈیکل کالج جہاں بھی اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا ناکامی نہیں ہوئی۔ انجمن پنجاب اور جامعہ عثمانیہ کے تجربات اس کے امکانات کے روشن ہونے کا پتا دیتے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں، جس کا نظام مولانا محمد علی جوہر نے وضع کیا، ذریعہ تعلیم انگریزی نہیں تھا، یہاں بی اے کا نصاب ایف اے میں پڑھا دیا جاتا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں سر راس مسعود ذریعہ تعلیم کے مطالعے کے لیے جاپان گئے تو واپس آکر انھوں نے اعتماد کے ساتھ پوری توجہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے پر دی [۱۸] جالبی صاحب اس خیال کے حامی تھے کہ مسلم تعلیمی روایت میں عوام وخواص کی کوئی تخصیص نہیں رہی، مسلمانوں کے تصور میں تعلیم دینا اور پھیلانا ثواب اور آخرت سنوارنے کا ذریعہ تھا۔ مادی فوائد کا کوئی تصور نہیں تھا، اس کے برخلاف آج اسکول اپنی فیسوں سے پہچانے جاتے ہیں اور تعلیم کو اب صنعت کا درجہ

دے دیا گیا ہے [19] جالبی صاحب نے یہ خیالات ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی یادگاری خطبے میں ظاہر کیے تھے۔ یہ خطبہ ۲۸ر جنوری ۱۹۹۳ء کو کراچی میں دیا گیا۔ راقم کو انھوں نے اس کی مطبوعہ کاپی اپنے دستخطوں کے ساتھ ''عزیزی زاہد منیر عامر کے لیے، جمیل جالبی ۲۹؍۴؍۱۹۹۳ء'' لکھ کر عنایت فرمائی۔اس کے بعد وطن عزیز میں تعلیم جس طرح مزید جنس بازار بنتی چلی گئی، وہ ان کے تجربے میں نہیں آیا۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن کے زیر اثر تحقیقی مقالات ومجلّات کی گرم بازاری، اساتذہ میں حصول منفعت کے لیے غیر صحت مندانہ مسابقت، تعلیمی اداروں میں پنپنے والی غلیظ سیاست، عہدوں اور اعزازات کی غیر معیاری جنگ نے صورت حال کو اس سے کہیں زیادہ ابتر کر دیا ہے جس کا مشاہدہ جالبی صاحب نے کیا تھا۔

جو شخص جتنا کام کرتا ہے اس پر اتنی ہی انگشت نمائی کے مواقع پیدا ہو جاتے ہیں۔ جالبی صاحب کے یادگار کاموں میں مغربی تنقید کے شاہ کار مضامین کا اردو ترجمہ ارسطو سے ایلیٹ تک بھی شامل ہے، جو خود ان کے بہ قول ان کی خشک سالی کے دنوں کی پیداوار ہے۔ جب انھیں اس خیال نے آلیا تھا کہ اب ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا تو انھوں نے اس کرب ناک کیفیت کا مقابلہ اس طرح کیا کہ چلیں اگر میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے تو دیکھتے ہیں کہ دنیا کے دوسرے سوچنے اور لکھنے والوں کے پاس کیا ہے؟ چنانچہ انھوں نے مغرب کی ادبی فکر کو تسلسل کے ساتھ اردو میں منتقل کرنے کا کام کیا۔ لاہور کے زمانہ قیام میں انھوں نے ان تراجم کے ساتھ مصنفین کے حالات زندگی اور فکری کارناموں پر تعارفی نوٹ بھی لکھ ڈالے اور مغرب کی فکری تاریخ میں ان مضامین کی اہمیت بھی بتا ڈالی۔ راقم نے اپنے دور طالب علمی میں اس کتاب کا مطالعہ کیا اور مغربی تنقیدی فکر سے آشنائی کے لیے اسے ایک مفید کتاب پایا تاہم موازنے سے متن کے ساتھ ترجمے کی وفاداری کا حال کھلا۔ ارسطو کی Poetics کو دنیائے تنقید میں جو مقام حاصل ہے محتاج بیان نہیں۔ یورپ میں تو اسے ادبی تنقید کی پہلی کتاب مانا جاتا ہے بہ قول عزیز احمد ''نہ صرف یونان بلکہ یورپ بھر میں ارسطو کی یہ کتاب فنِ تنقید پر پہلی کتاب تھی جس میں شاعری کو ایک جداگانہ اور خود مختار فن سمجھ کے بحث کی گئی ہے''۔ [20] بوطیقا کا عربی ترجمہ براہ راست یونانی سے نہیں ہوا بلکہ عربی ترجمہ جس کا مسودہ پیرس میں محفوظ ہے اور جو چودھویں صدی عیسوی کے وسط کا مکتوبہ ہے، ایک سریانی ترجمے کا ترجمہ ہے۔ اصل سریانی ترجمہ اب نابود ہو چکا ہے اور اس کے مترجم کا نام بھی کسی کو معلوم نہیں۔ پروفیسر مارگولیتھ نے عربی ترجمے کے کچھ حصوں کا لاطینی میں

ترجمہ کیا ہے جو ان کی *Analeca Orientalia* مطبوعہ ۱۸۸۷ء میں شامل ہے۔عزیز احمد نے بوطیقا کے متعدد تراجم کا تعارف کروایا ہے تاہم ان کی رائے میں بوطیقا کا پہلا مکمل ترجمہ ٹوائی ننگ (Twining) کا ہے جو لندن سے ۱۷۸۹ء میں شائع ہوا۔[۲۱] انھوں نے اپنا ترجمہ مختلف انگریزی ترجموں کی مدد سے تیار کیا ہے جہاں اختلاف تھا وہاں بچر (Butcher) کے ترجمے کو ترجیح دی ہے کیونکہ ان کی رائے میں یہ ترجمہ اس وقت تک کی جدید ترین تحقیقات کے بعد کا تھا اور ہر متنازعہ فیہ موقع پر عربی ترجمے سے استصواب کرتا ہے۔انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ''کتاب کے ابواب کی تقسیم کی حد تک اور بعض اصطلاحات کے ترجمے میں میں نے ٹوائی ننگ (Twining) کی پیروی کی ہے جس نے کتاب کو نفس مضمون کے اعتبار سے پانچ بڑے مفید حصوں میں تقسیم کیا ہے''[۲۲] عزیز احمد کا یہ ترجمہ بیسویں صدی کے نصف اول میں کیا گیا۔دیباچے کے اختتام پر''جامعہ عثمانیہ ۲۲ رجون ۱۹۴۱ء'' کی تاریخ درج ہے۔جالبی صاحب نے اسی صدی کے نصف آخر میں از سرنو بوطیقا کا ترجمہ کیا۔انھوں نے ایک انٹرویو میں بوطیقا کے نئے ترجمے کا یہ جواز پیش کیا تھا کہ ''عزیز احمد کا ترجمہ مجھے پسند نہیں رہا''[۲۳] لیکن اس ناپسندیدگی کی کوئی ٹھوس وجہ انھوں نے بیان نہیں کی تھی جیسی مثال کے طور پر یہ کہ عزیز احمد نے بعض اصطلاحوں کو ہندی متبادلات دیے ہیں مثلاً کورس کے لیے''سنگیت''،غنائی شاعری کو''بھجن''،لائر کو''چنگ''،وغیرہ جس سے مفہوم کے ابلاغ میں رکاوٹ پڑتی ہے[۲۴]

جالبی صاحب نے لکھا ہے کہ ۱۴۹۸ء میں جیورجیو ولا نے عربی سے اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا لیکن یونانی زبان کا اصل متن پہلی بار ۱۵۰۸ء میں شائع ہوا۔یورپ، یونانی تصانیف سے عربوں کے توسط ہی سے متعارف ہوا ورنہ تقریباً پونے دو ہزار سال تک یورپ یونانی تصانیف کی اہمیت سے لاعلم تھا۔بوطیقا کا پہلا تنقیدی ایڈیشن روبورٹیلی نے ۱۵۴۸ء میں مرتب و شائع کیا[۲۵] لیکن جالبی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ ترجمہ کرتے ہوئے انھوں نے کونسا متن اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ارسطو سے ایلیٹ تک ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی اس کے تیس برس بعد مقتدرہ قومی زبان نے دنیا کی عظیم کتب کے تراجم کا ایک سیٹ شائع کیا تو اس میں بوطیقا بھی شامل تھی۔اس سلسلے میں جالبی صاحب کا یہ ترجمہ الگ کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔یہ وہی ترجمہ ہے جو ارسطو سے ایلیٹ تک میں تھا سوائے اس سے کہ دوسرے باب کے عنوان کو''شاعرانہ نقل کی اشیا'' سے بدل کر''شاعرانہ نقل کے عوامل'' کردیا گیا ہے[۲۶]

دسویں باب کے عنوان میں ''سادے اور پیچیدہ پلاٹ'' کو ''سادہ اور پیچیدہ پلاٹ'' بنا دیا گیا ہے[27] یا پھر یہ کہ ارسطوسے ایلیٹ تک میں بوطیقا کا چھبیسواں باب بھی تھا جو اس اشاعت سے غائب ہے ۔اس اشاعت کے لیے جالبی صاحب نے بوطیقا کا ایک مفصل تعارف تحریر کیا۔ جون ۱۹۹۶ء میں لکھے گئے چودہ صفحات پر مشتمل اس تعارف میں انھوں نے بوطیقا کے موضوعات اوراہمیت پر بحث کی ہے متن کے مسائل پر نہیں ۔ یہ غنیمت ہے کہ اس تعارف کی آخری تین سطروں میں انھوں نے اپنے ترجمے کے ماٰخذ کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''بوطیقا کا یہ ترجمہ ٹی ایس ڈورش (TS Dorsch) کے اس جدید تر ترجمے سے کیا گیا ہے جسے ان گرام بائی واٹر (INGRAM BYWATER) کے آکسفورڈ کلاسیکل متن سے انگریزی میں کیا اور جو ۱۹۶۵ء میں پہلی بار شائع ہوا[28]

کسی پرانے ترجمے کی موجودگی کے باوصف جب نیا ترجمہ کیا جاتا ہے تو امید کی جاتی ہے کہ نیا ترجمہ متقدم ترجمے سے بہتر اور زیادہ جامع ہوگا لیکن نظر بہ ظاہر ایسا نہیں ہے۔ جالبی صاحب نے ہادی حسین کے تراجم پر یہ اعتراض کیا تھا کہ انھوں نے مضامین اور کتابوں کا خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔[29] یہ روش خود ان کے ہاں بھی دکھائی دیتی ہے۔ ایک تو انھوں نے اس کتاب میں عزیز احمد کے ترجمے کا ذکر نہیں کیا دوسرے ان کے ہاں مطالب کو مختصر کرنے کا رجحان غالب ہے۔ بعض ابواب کا ترجمہ چھوڑ دینے کا اظہار کیا گیا ہے لیکن متن کے بیچ میں درآنے والے پیچیدہ مطالب کے چھوٹ جانے کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ بوطیقا کے جن ابواب کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے وہ بیسویں اور اکیسویں باب ہیں کہ ان دو مختصر ابواب میں ارسطو نے خالص فنی بحثیں کی ہیں جن کا تعلق یونانی فن لغت اور گرامر سے ہے اس لیے فاضل مترجم کہتے ہیں کہ ''ان کا ترجمہ نہیں کیا گیا''[30] یہ صورت حال ارسطوسے ایلیٹ تک میں تھی ۔ جب یہ ترجمہ کتابی صورت میں شائع ہوا تو اس وقت تک شمس الرحمٰن فاروقی کا ترجمہ بھی سامنے آچکا تھا اور کسی کتاب کے جزو کی حیثیت سے شائع ہونے سے بڑھ کر الگ کتابی صورت میں شائع کیے جانے کے موقع پر توقع کی جاسکتی تھی کہ فاضل مترجم قاری کو پورے دستیاب متن سے روشناس کروائیں گے لیکن الگ کتابی اشاعت کی صورت میں یہ دونو ابواب ترجمے سے غائب ہی رہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے بوطیقا کا ترجمہ جالبی صاحب کے بعد کیا۔ انھوں نے مذکورہ دونو ابواب کا ترجمہ کیا ہے لیکن حاشیے میں ایک باب کے بارے میں ''سینٹسبری کا خیال پیش کیا ہے کہ یہ

شاید ارسطو کی تصنیف نہیں'،[۳۱] کسی باب کو ترک کرنے کا یہ ایک معقول جواز ہوسکتا تھا لیکن فاروقی نے اس کے باوجود اسے ترک نہیں کیا جب کہ جالبی صاحب نے متن کا یہ حصہ ترک کیا اور ترک کا سبب بھی کچھ اور بتایا۔ جہاں تک باقی متن کا تعلق ہے تو ترجمہ شدہ ابواب کے بیچ بیچ میں بھی مطالب چھوٹ گئے ہیں جس کے باعث بوطیقا کا یہ ترجمہ نا تمام رہ گیا ہے۔ صرف یہی نہیں جالبی صاحب کو جو اعتراض ہادی حسین کے تراجم پر تھا بوطیقا کا ترجمہ ان کے ہاں بھی اسی رنگ کا پرتو پیش کرتا ہے۔ جالبی صاحب نے عزیز احمد بلکہ ٹوائی ننگ کی طرح کتاب کو پانچ حصوں میں تقسیم نہیں کیا، انھوں نے اس کے متن کو چھوٹے چھوٹے چھبیس ابواب کی صورت دی ہے، الگ کتابی صورت میں شائع کرتے ہوئے پچیس ابواب رہ گئے ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا ترجمہ جالبی صاحب کے ترجمے کے پانچ برس بعد سامنے آیا۔انھوں نے یہ ترجمہ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی کی فرمائش پر کیا۔ بورڈ کی فرمائش تھی کہ ایس۔ ایچ بچر (S.H. Butcher) کے متن کو بنیاد بنایا جائے ، بچر کا اوّلین ایڈیشن ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا تھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے وضاحت کی ہے کہ بوطیقا کا موجودہ متن یونانی نسخے پر مشتمل ہے جو غالباً گیارھویں صدی میں قسطنطنیہ میں دریافت ہوا اور پندرھویں صدی میں پیرس پہنچ گیا جہاں وہ اب بھی محفوظ ہے۔ قدیم ترین غیر یونانی نسخہ ابوبصر کا کیا ہوا عربی ترجمہ ہے جو کسی سریانی ترجمے کا ترجمہ ہے......عربی ترجمے سے لاطینی اور یونانی سے انگریزی میں پروفیسر مارگولیتھ نے منتقل کیا[۳۲] ۔فاروقی کہتے ہیں کہ انھوں نے حتی الامکان بچر کی عبارت کو ترجیح دی ہے لیکن چھ دوسرے تراجم کو بھی پیش نظر رکھا ہے جن کی تفصیل انھوں نے اپنے دیباچے میں بیان کردی ہے۔ اس دیباچے میں انھوں نے اپنے پیش روعزیز احمد کے ترجمے کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے دیباچے کو مفصل اور دلچسپ قرار دیتے ہوئے بعض حواشی کے کارآمد ہونے کا اعتراف کیا ہے[۳۳] تاہم ان کے ہاں متن، عزیز احمد یا ٹوائننگ کی طرح پانچ حصوں میں نہیں بلکہ جالبی صاحب کی طرح چھوٹے چھوٹے چھبیس ابواب میں تقسیم کیا ہے اگرچہ انھوں نے جمیل جالبی کے ترجمے کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔اپنے دیباچے کے آخر میں یہ ضرور کہا ہے کہ ''امید ہے یہ ترجمہ ایک بڑی کمی کو کسی حد تک پورا کر سکے گا''[۳۴]

راقم اس سوال سے پریشان رہا ہے کہ اہل علم کا کردار الا ماشاللہ قومی توقعات کے مطابق کیوں

نہیں ہوتا۔اس خیال سے کہ شاید یہ مظہر صرف عہد حاضر سے خاص ہو ماضی میں بھی جھانکتا رہا ہے۔ایک بار جالبی صاحب لاہور آئے اوران سے کئی ملاقاتوں کا موقع ملاتو اس حوالے سے کچھ اعتراضات و سوالات ان کے سامنے رکھے۔مثال کے طور پر میں نے ابن خلدون کا ذکر کیا جو ایک عبقری ذہن کا مالک اور فلسفہ تاریخ کا بانی مفکر تھا لیکن قومی حوالے سے اس کا کردار کوئی زیادہ اچھی مثال پیش نہیں کرتا۔جب ابن خلدون کی یہ کیفیت رہی تو آج کل کے اربابِ دانش کا حال معلوم۔انھوں نے کامن سینس کی مدد سے میرے سوالات کے جواب دیے اور مزید تفصیل کے لیے مجھے اپنے استفسارات خط کی صورت میں لکھ کر بھیجنے کا کہا۔میں نے انھیں خط لکھا کہ آپ کے ساتھ ملاقات میں اہلِ علم کے کردار کی مناسبت سے ابنِ خلدون کا ذکر ہوا تھا کہ منگولوں کے حملے کے وقت اس سے جس اجتماعی شعور کی توقع تھی وہ اس کا مظاہرہ نہ کر سکا اور ذاتی مفاد کے لیے حملہ آور کی خوشامد کرنے لگا،آپ نے فرمایا تھا کہ ممکن ہے اس کی خوشامد میں اجتماعی مفاد کا کوئی پہلو ہو۔اس کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ اس کا اخلاقی و دینی تصور بہت محدود تھا اور اس میں اخلاص، وفا اور دوسروں کی خیر سگالی کے جذبات نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ اس کی وفاداریاں زمانے کی گردشوں کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی تھیں۔دمشق کی مہم میں اسے ساتھ لینے کا مقصد یہ تھا کہ وہ تیمور سے اپنے ہم وطنوں کے لیے سفارش کرے گا اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کو اجتماعی مفاد کے لیے بروئے کار لائے گا لیکن اس کی تیمور سے ملاقات کا جو حال معلوم ہوتا ہے وہ ہماری توقعات کے مطابق نہیں۔میں نے آپ سے ابن خلدون پر محمد عبداللہ عنان مصری کی کتاب کا ذکر کیا تھا جو ابن خلدون کے چھ صد سالہ جشن کے موقع پر ۱۹۳۲ء میں لکھی گئی۔اس نے اس موقع کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، میں اس کا ایک اقتباس نقل کرتا ہوں پھر آپ اس کے طرزِ عمل کے جواز یا عدم جواز کے بارے میں اپنی رائے دیجیے گا۔

He was afraid that the city would fall into the hands of the invader when he would be killed or tortured. He resorted to audacity and decided to abandon the hesitant commandars and go to the invaders camp to ask him to spare his life and ensure his fortune ۳۵

اس نے خود التعریف میں جو لکھا ہے اس کا ترجمہ:

I entered the tent where he was sitting, inclining

on his elbow, while the dishes were being carried before him to excite the appetite of the Mongol troops sitting in circles before his tent. When I entered I bowed and made signs of submission. He raised his head and extended his hand which I kissed. ۳۶

جالبی صاحب کی خدمت میں یہ خط ۲۰۰۴ء میں ارسال کیا گیا۔ اپریل ۲۰۰۶ء میں ان سے پھر ملاقات کا موقع ملا تو میں نے انھیں اپنا استفسار اور اس حوالے سے لکھا جانے والا خط یاد دلائے۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ اپنا وہ سوال دوبارہ بھیج دیجیے۔ دوبارہ یہی سوال ان کی خدمت میں بھیجا گیا لیکن ان کی جانب سے اس کا کوئی جواب نہیں ملا۔ ابن خلدون کے کردار میں ذاتی مفاد کو اجتماعی مفاد پر ترجیح دینے کا جو رجحان تھا اس کا اظہار اس کے معاصرین اور تذکرہ نگاروں نے کھل کر کیا ہے۔ انسانی کردار کا یہ پہلو بلاشبہ منفی ہے لیکن سرمایہ دارانہ نظام کے قائلین آج بھی اس کے حق میں دلائل پیش کریں گے، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ سلطان مغرب کی جانشینی کے قضیے میں مخالف گروہ نے ابن خلدون کے کپڑے تک اتروا لیے تھے اور وہ بلا لباس ہی بھاگنے پر مجبور ہوا تھا۔ دو روز کی برہنگی کے بعد اسے لباس میسر ہوا تھا گویا اس مرحلے پر اس کا علم و فضل اس کے کچھ کام نہیں آیا۔

جالبی صاحب کے کاموں میں ایک اہم کارنامہ مثنوی نظامی دکنی المعروف بہ کدم راو پدم راو کی تدوین بھی شامل ہے۔ یہ ان کا تیسرا تدوینی کام تھا، اس سے پہلے وہ دیوان حسن شوقی اور دیوان نصرتی بھی مرتب کر چکے تھے۔ یہ دونوں متون تاریخ ادب اردو کی گم شدہ کڑیوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ مثنوی نظامی کا متن ایک ہزار بتیس اشعار پر مشتمل ہے یہ مثنوی ۸۲۵ھ/ ۱۴۲۱ء اور ۸۳۹ھ/ ۱۴۳۵ء کے درمیان لکھی گئی، مصنف کا نام فخر دین اور تخلص نظامی ہے۔ اس تاریخی متن کی دریافت کا سہرا بابائے اردو مولوی عبدالحق کے سر ہے۔ اس خطی نسخے کے بارے میں مولوی صاحب کے ۴/ مارچ ۱۹۶۱ء کے مکتوبہ ایک غیر مطبوعہ خط میں یہ عبارت ملتی ہے:

''شاعر کا نام فخر الدین (کذا، فخر دین) اور تخلص نظامی ہے۔ اس کا ذکر نہ کسی تذکرے میں ہے نہ کسی اور کتاب میں۔ یہ نام اور تخلص بھی اس کی مثنوی ہی سے معلوم ہوا۔ سلطان علاء الدین بہمنی کے زمانے میں تھا جس کی مدح اُس نے اس مثنوی میں کی ہے۔ سلطان علاء الدین بن احمد شاہ ۸۳۸ء میں تخت نشین ہوا اور ۸۶۳ء میں وفات پا گیا۔'' ۳۷ مولوی صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ اس متن کو مرتب

کیا جائے انھوں نے اس مقصد کے لیے قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی، سید ہاشمی فرید آبادی اور نصیر الدین ہاشمی جیسے علما سے اس متن کی تدوین کی امیدیں وابستہ کی تھیں جو کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکیں۔ نصیر الدین ہاشمی کو تو خاص اس متن کی تدوین کے لیے پاکستان آنے اور یہاں کی شہریت دینے کی پیش کش بھی کی گئی لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی۔ جالبی صاحب اس متن سے ۱۹۶۷ء میں متعارف ہوئے۔ ڈیڑھ برس کی کوششوں کے بعد اس متن کو پڑھا جا سکا اور تدوین متن میں پانچ برس سے زیادہ کا عرصہ لگا۔ مثنوی کی اشاعت یوں کی گئی ہے کہ دائیں جانب مخطوطے کا عکس اور بائیں جانب اس کی خواندگی دی گئی ہے۔ آخر میں فرہنگ، سلاطین بہمنی کا تعارف اور مثنوی میں مذکور شخصیات پر تعارفی نوٹ دیے گئے ہیں، جن سے کتاب کی معنویت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ بات باعث تعجب ہے کہ شخصیات اور مآخذ کی فہرست میں الفبائی یا زمانی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اس مخطوطے کو پڑھ لینے کی منزل سر کر کے انھیں وہی خوشی حاصل ہوئی جو سر ایڈمنڈ ہلاری کو دنیا کی سب سے بڑی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے سے ہوئی تھی اور درحقیقت یہی کسی فن کار کی محنت کا سب سے بڑا ثمر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب مرحوم نے اس کتاب پر اپنے تبصرے میں ایک سے زائد مقامات پر یہ مشورہ دیا ہے کہ کسی لیبارٹری میں آسانی کے ساتھ کاغذ اور روشنائی کا زمانہ قطعی طور پر متعین ہو سکتا تھا۔ اگر برٹش میوزیم کی لیبارٹری سے استفادہ کر لیا جاتا تو یہ مسئلہ حل ہو جاتا۔ [38] یہ مشورہ تو کسی بھی مدوّنِ متن کو دیا جا سکتا ہے، خود ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کو بھی، جنھوں نے پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں محفوظ خطی نسخے [39] کی مدد سے دیوان جہاندار مرتب کیا۔ یہ خطی نسخہ بہ ظاہر معاصر معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا صحیح زمانہ معلوم نہیں۔ پہلے صفحے پر مہر ہے جو کتاب کے کسی سابقہ مالک نے خراب کر کے اوپر کاغذ کی چیپی لگا دی ہے، چیپی اتارنے پر بھی نقوش خوانا نہیں۔ اس کے متصل ۱۲/ ماہ ربیع الاول ۱۸۲۳ء درج ہے جو نسخے کے کاتب کی تحریر سے الگ ہے۔ [40] اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خطی نسخہ درحقیقت کب لکھا گیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اگر برٹش میوزیم کی لیبارٹری سے استفادہ کر لیا جاتا تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ کیا ہمارے زمینی حقائق عملاً اس کی اجازت دیتے ہیں؟ خاص طور سے جب کہ مثنوی نظامی دکنی کے ناشر جمیل الدین عالی صاحب کے بہ قول، جنھوں نے اس مخطوطے کی تدوین کو تاریخ ادب اردو کا ایک لازوال کام قرار دیا ہے، اس کتاب کی تدوین کے ''سلسلے میں انجمن نے ڈاکٹر جمیل جالبی کو کوئی مالی امداد بہم نہیں پہنچائی، انھیں ریسرچ اسسٹنٹ نہیں دیے، سفری

الاؤنس نہیں دیا،کسی قسم کا اعزاز یہ کوئی اورامداد یہ کچھ پیش نہیں کیا جاسکا نہ انجمن اب انھیں کوئی انعام دینے کی سکت رکھتی ہے......انھوں نے بابائے اردو کی ایک بہت ہی دشوار اور اہم وصیت پوری کر دی ہے‘‘۔[۴۱]

اس متن کی تدوین واشاعت بلاشبہ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی ایک بڑی خواہش تھی۔وہ اس متن کی تدوین واشاعت کے لیے کوشاں رہے اوراس کے سلسلے میں اہل علم،اپنے مداحوں،اردو دوستوں، محققین اساتذہ اورطالب علموں کو متوجہ کرتے رہے اس لیے کہ یہ متن اردو کی ادبی تاریخ کی عمر میں دوسو برس کا اضافہ کردینے کا باعث ہے۔جالبی صاحب نے یہ کام کر کے جہاں دنیا کواردو زبان کی پہلی تصنیف سے آشنا کیا اوراردوادب کی تاریخ میں دوسو برس کا اضافہ کیا وہاں انھوں نے بابائے اردو کی خواہش بھی پوری کردی۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس متن کے دریافت کنندہ کی حیثیت سے بابائے اردو کے نام کتاب کا انتساب کرتے ہوئے ’’حق بحق دار رسید‘‘ کے کلمات سے بجا طور پران کا اعتراف کیا ہے۔ہماری قومی تاریخ کے افسوس ناک المیوں میں انجمن ترقی اردو کا وہ المیہ بھی شامل ہے جسے بابائے اردو کے قلم نے زبان دی ہے ۔راقم نے ایک بار جالبی صاحب سے پوچھا کہ بابائے اردو کی غیر معمولی خدمات کے باوصف بعض لوگ انھیں ’’بائے بائے اردو‘‘ کہتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے......؟اس پر جالبی صاحب کا جواب تھا؛اس لیے کہ انھوں نے اردو کونقصان پہنچایا۔میں یہ سن کر بھونچکا ہی تو رہ گیا۔وہ کیسے......؟ میں نے پوچھا۔’’زبان کے مسئلے کو Politicise کر کے‘‘ جالبی صاحب نے جواب دیا۔

جالبی صاحب کے کاموں میں نصرتی (م:۱۰۸۵ھ) کے دیوان کی ترتیب وتدوین بھی شامل ہے۔اردو دنیا کونصرتی سے مولوی عبدالحق نے متعارف کروایا۔انھوں نے ملک الشعرائے بیجاپور کی حیثیت سے اس پر پوری ایک کتاب لکھی۔[۴۲] جالبی صاحب کو پہلی بار نصرتی کا دیوان مرتب کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔وہ جب تاریخ ادب اردو پر تن تنہا کام کرتے ہوئے سیکڑوں بیاضوں اورمخطوطات کے جنگل سے گزرے تو انھیں ملانصرتی کا کلام ملتا رہا، جسے وہ جمع کرتے رہے۔اس دیوان میں نصرتی کی مثنوی، قصائد،مخمسات،ہجو،غزلیات،قطعات اور رباعیات شامل ہیں۔اگر چہ مدوّن کی یہ ذمے داری نہیں کہ وہ زیر تدوین شاعری کی تنقید کا فریضہ بھی انجام دے۔بعض حضرات کی رائے میں تو ایسا کرنا نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں بلکہ ’’اخلاقی جرم‘‘[۴۳] بھی ہے لیکن جالبی صاحب نے اپنی تنقیدی بصیرت کو کام میں لا کر یہ ذمہ داری بھی اپنے سر لی ہے۔انھوں نے نصرتی اور حسن شوقی کے متون مرتب کرتے ہوئے مفصل

مقدمے تحریر کیے ہیں(دیوان نصرتی کا مقدمہ سولہ صفحات اور دیوان حسن شوقی کا مقدمہ ۶۸ صفحات پر مشتمل ہے)ان مقدموں سے اردو شعر کی تاریخ کے بعض نئے پہلو سامنے آئے ہیں۔ کہا جاتا تھا کہ ولی اردو شاعری کا باوا آدم ہے، جالبی صاحب نے حسن شوقی کا کلام متعارف کروایا تو ان کے مقدمے سے معلوم ہوا کہ ولی کی غزل جس فراز پر کھڑی ہے،اس کی اساس حسن شوقی کے ہاں ملتی ہے جس کی غزلیں اس روایت کا ایک حصہ ہیں [۴۴] اس امر کا اعتراف خود ولی نے بھی کیا ہے جو کہتا ہے ۔

برجا ہے اگر جگ میں ولی پھر کے دجے بار
رکھ شوق مرے شعر کا شوقی حسن آوے

[۴۵]

میر کا یہ کہنا کہ ''معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا'' یا قائم کا ریختہ کو غزل آشنا کرتے ہوئے ماضی میں اسے ''اک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی'' قرار دینا روایت کے تخلیقی سوتوں کی نشان دہی کرتا ہے، وہ روایت جس پر بہ قول ڈاکٹر جمیل جالبی ''حسن شوقی ایک ایسے درمیانی پل کی حیثیت رکھتا ہے جس پر سے گزرے بغیر ولی کی روایت تک نہیں پہنچا جا سکتا'' [۴۶] جالبی صاحب نے صرف یہی نہیں کہ مستقبل کی غزل پر حسن شوقی کے اثرات سے ہمیں آگاہ کیا ہے انھوں نے خود حسن شوقی کی غزل پر جن شعرا کے اثرات ہیں ان سے بھی ہمیں متعارف کروایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شوقی کی غزل میں مشتاق، لطفی، محمود، فیروز اور خیالی کے اثرات ایک نئے روپ میں ڈھلتے ہیں اور پھر یہ نیا روپ شاہی، نصرتی، ہاشمی، اشرف، سالک، یوسف، تائب، قریشی اور ایسے بہت سے دوسرے نامعلوم و گم نام شعرا کے ہاں سے ہوتا ولی کی غزل میں رنگ جماتا ہے'' [۴۷] ولی کا تعلق گیارھویں صدی ہجری سے تھا حسن شوقی دسویں صدی ہجری کا شاعر ہے اس طرح جالبی صاحب نے اپنی اس تحقیق کے ذریعے اردو غزل کی عمر میں اضافہ کیا۔

دیوان نصرتی کے مقدمے میں انھوں نے نصرتی کے کلام پر تفصیل سے تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور اس کے تصورِ عشق کو سطحی قرار دیا ہے اور اس کے ہاں جسمانی لذت کی ہوس کے عناصر تلاش کیے ہیں ......ان کے نزدیک '' نصرتی کی غزلوں میں جسم کو چھونے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی حسرت ہے ،اس کی غزلوں میں ندیدے پن اور عورت کو دیکھ کر رال ٹپکنے کا احساس ہوتا ہے...... '' [۴۸] بجا لیکن آخر میں انھوں نے ایک ایسی فارسی غزل بھی نصرتی سے منسوب کی ہے جس کا فنی معیار اور فکری رجحان نصرتی سے

مناسبت نہیں رکھتا،غزل یہ ہے:

از پنجۂ من چاکِ گریبان گلہ دارد وز گریہء من گوشہء دامان گلہ دارد

ازبسکہ بہ زندانِ غمت دیر بماندم زنجیر بہ تنگ آمدہ، زندان گلہ دارد

دامانِ نگہ تنگ،گل حسنِ تو بسیار گلچینِ بہار تو زدامان گلہ دارد

گہ بت شکنم ،گاہ بمسجد زنم آتش کز مذہبِ من گبروملمان گلہ دارد

دربزمِ وصالِ تو بہ ہنگامِ تماشا نظارہ زجنبیدنِ مژگان گلہ دارد

سنبل بہ چمن مشک فشان نافہ ء تاتار از غربتِ من زلفِ پریشان گلہ دارد

گہ گریم و گہ خندم وگہ آہِ جگر سوز

ای نصرتی از وضعِ تو جانان گلہ دارد [۴۹]

جالبی صاحب نے حاشیے میں روز روشن اورفرہنگ سخنوران وغیرہ کے حوالوں سے اس غزل کی مختلف نسبتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس غزل کا تیسرا اور پانچواں شعر غالب نے قدسی (مشہدی) سے منسوب کیا ہے، موجودہ تحقیق کی روشنی میں یہ صحیح نہیں ہے'' جالبی صاحب نے جدید تحقیق کے دلائل پیش کیے ہیں نہ یہ بتایا ہے کہ غالب نے کہاں پر ان اشعار کو قدسی سے منسوب کیا ہے؟ جدید تحقیق سے ان کی مراد غالبًا ان کی اپنی تحقیق ہے لیکن ان کی اپنی تحقیق وتنقید، نصرتی کی شاعری کے جس رنگ ڈھنگ کو دریافت کرتی ہے وہ اس غزل سے لگا نہیں کھاتا۔ اس غزل کو اگر کسی رنگ خاص سے مشابہ قرار دیا جاسکتا ہے تو وہ سبک ہندی کے اساتذہ کا رنگ ہے۔

راقم نے ایک بار سید نفیس الحسینی صاحب سے دریافت کیا تھا کہ شعر (دامان نگہ تنگ ......الخ) کس کا ہے؟ نفیس شاہ صاحب مرحوم کلاسیکی ادب کا نہایت عمدہ ذوق اور مطالعہ رکھتے تھے۔ انھوں نے بے ساختہ قدسی مشہدی کا نام لیا تھا۔ قدسی کا پورا نام حاجی محمد جان قدسی ہے۔ ان کا تعلق جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مشہد سے تھا۔ تذکرہ نگار انھیں ''سرحلقہ ء ناظمان جواہر فصاحت وسرآمد جوہریان بازار بلاغت'' قرار دیتے ہیں۔ ۱۰۴۱ھ میں لاہور آئے [۵۰] شاہ جہاں نے انھیں ملک الشعرائی کا خطاب دیا، اپنے تخت پر بٹھایا اور روایت کے مطابق سونے میں تلوا کر سارا سونا ان کی نذر کر دیا......قدسی کا ایک بیٹا جوان مرگ ہو جانے پر وہ دل شکستہ ہو گئے اور وطن واپسی کا خیال ترک کر دیا۔ لاہور ہی میں ''۱۰۵۶ھ

میں عالم قدس کو روانہ ہوئے'' [51] یہیں سپرد خاک ہوئے لیکن بعدازاں انھیں مشہد منتقل کردیا گیا۔ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ کشمیر چلے گئے تھے اور وہیں مقبرہ شعرا میں مدفون ہیں۔محولہ بالا شعر کے حوالے سے بعدازاں خطوط غالب دیکھے تو ان سے کچھ مزید معلومات حاصل ہوئیں۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خوانندگان کرام کو بھی ان میں شریک کیا جائے۔غالب نے اپنے ایک خط بنام نواب امین الدین احمد خان میں لکھا ہے:

''مغربی،عرفا میں سے ہے بیشتر اس کے کلام میں مضامین حقیقت آگیں ہیں لیکن 'دامان گلہ دارد' گریبان گلہ دارد'اس زمین میں میں نے اس کی غزل نہیں دیکھی۔حاجی محمد جان قدسی کی غزل اس زمین میں ہے ؎

در بزم وصال تو بہ ہنگام تماشا

نظارہ زجنبیدن مژگان گلہ دارد [52]

ایک اور خط میں یہی شعر نقل کر کے لکھا ہے''یہ زمین قدسی رحمۃ اللہ علیہ کے حصے میں آگئی ہے ،میں اس میں کیوں کر تخم ریزی کروں گا اور اگر بے حیائی سے کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤں تو اس شعر کا جواب کہاں سے لاؤں'' [53] نواب امین الدین خان نے غالب سے استفسار کیا ہوگا کہ یہ غزل مغربی کی ہے یا کسی اور کی؟جس پر غالب نے یہ جواب لکھا۔مغربی(م:۸۸۹ھ/۱۴۸۴ء)تبریز کے صوفی شاعر تھے جن کا پورا نام محمد شیرین تھا۔اپنے وطن سے شام گئے اور شیخ ابن عربی سے بیعت کر کے عرفا میں شامل ہوگئے۔گویا اس غزل کا انتساب مغربی سے بھی کیا جاتا رہا ہے۔ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب نے اسے حیرتی تونی کی قرار دیا ہے [54] بعض مصادر میں اس غزل کو عشرتی سے منسوب کیا گیا ہے۔

اس غزل میں معیار کی جو دورنگی پائی جاتی ہے وہ غالب کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔اس جانب توجہ کرتے ہوئے غالب نے لکھا ہے کہ''مغربی،قدما میں اور عرفا میں ہے جیسا عراقی۔ان کا کلام دقائق و حقائق تصوف سے لبریز۔قدسی،شاہجہانی شعرا میں صائب و کلیم کا ہم عصر اور ہم چشم۔ان کا کلام شورانگیز۔ان بزرگوں کی روش میں زمین آسمان کا فرق'' [55] غالب کی غزل ...... پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے......الخ میں کسی دوسرے شاعر کے اشعار شامل ہوگئے تھے۔غالب نے اس کا حوالہ دے کر لکھا؛

''اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مطلع اور
اُس بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کر کے، غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ
گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اُلو کے۔ جب شاعر
کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ شاعر
متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو۔ مقطع بے شک مولانا مغربی کا ہے
اور وہ شعر جو میں نے تم کو لکھا ہے اور یہ شعر جواب لکھتا ہوں ؎

داماں نگہ تنگ وگلِ حسنِ تو بسیار گلچینِ بہارِ تو زداماں گلہ دارد

یہ دونو شعر قدسی کے ہیں......'' [۵۶]

ماخذ مذکورہ میں مصرعہ اولیٰ کے درمیان واو کا اضافہ ہے۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ قدسی کا دیوان ایران سے شائع ہو چکا ہے۔ راقم نے اس سے رجوع کیا تو بہرۂ غزلیات میں اس غزل کو موجود نہیں پایا۔ [۵۷]

جالبی صاحب کی تاریخ فرد واحد کا کیا ہوا ایک ایسا کام ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں جس کی کوئی دوسری نظیر پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس کام کو مختلف زاویوں سے دیکھا گیا ہے۔ ایک زاویہ وہ ہے جس کا اظہار اس کتاب پر رشید حسن خان کے مضمون سے ہوتا ہے جن کا کہنا یہ ہے کہ جالبی صاحب نے اس کتاب کی تصنیف کے دوران میں اہم، کم اہم اور غیر اہم ماخذ میں امتیاز نہیں کیا ہے۔ جس کے باعث اس کتاب میں کمیاں رہ گئی ہیں۔ [۵۸]

دوسرا زاویہ نظر وہ ہے جس کا اظہار اس کتاب پر مشفق خواجہ کے مضمون سے ہوتا ہے۔ مشفق خواجہ مرحوم تنقید میں خاصے بے باک واقع ہوئے ہیں لیکن انھوں نے تاریخ ادب اردو کی خاصی مدح سرائی کی ہے اور اسے اردو ادب کی پہلی تاریخ قرار دیا ہے [۵۹] ایک بار راقم نے جالبی صاحب سے کہا کہ آپ نے تاریخ ادب اردو کی دوسری جلد میں میر سوز کے تلمیذ سودا ہونے کی رائے سے اتفاق کیا ہے اور اس کی دلیل میں میر سوز ہی کا ایک شعر پیش کیا ہے۔ [۶۰] راقم کا خیال ہے کہ سوز کسی کے شاگرد نہیں تھے جیسا کہ مولانا حسرت موہانی کے بنائے ہوئے شاعروں کے سلسلۂ تلمذ کے شجروں سے ظاہر ہے جنھوں نے سوز کو کسی سلسلۂ سخن میں محسوب کرنے کی بجائے اس کا اپنا سلسلۂ سخن قائم کیا ہے [۶۱] یہ ایک خارجی شہادت ہے۔ اگر داخلی شہادت کی ضرورت ہو تو وہ بھی موجود ہیں اور ایک سے زیادہ۔ سوز کے متعدد اشعار سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ شعر میں وہ کسی کے تلمیذ نہیں تھے ؎

یوں تو ہوں خوشہ چین سبھوں کا پہ سچ کہوں
یہ سوزِ دل ازل سے جو استاد ہے سو ہے

کون ایسا سوختہ ہے جس کو کہیے میر سوز
کون ہے ایسا کہ اپنا آپ ہی استاد ہو

سودا سے مشورۂ سخن کے سلسلے میں جالبی صاحب کی واحد دلیل سوز کا ایک شعر ہے ۔

ورنہ اس منہ پہ شاعری توبہ
یہ بھی مرزا رفیع کی ہے دولت

راقم کا کہنا تھا کہ شعر کا یہ متن محکم نہیں کیونکہ راقم کے پاس موجود ایک دوسرا اور کامل تر متن مصرعہ ثانی کی زیادہ بہتر شکل پیش کر رہا ہے جس میں رفیع کی ''ع'' گرنے کا عیب بھی نہیں ہے......

ورنہ اس منہ پہ شاعری توبہ
یہ بھی سب صاحبوں کی ہے دولت [۶۲]

سوز اور سودا میں باہمی تعلق کے جو شواہد ملتے ہیں وہ تلمذ پر نہیں دوستی پر دلالت کرتے ہیں ۔ سودا نے ایک سے زیادہ مقامات پر شعر میں سوز کی بڑائی کا اعتراف کیا ہے۔ جالبی صاحب نے میری معروضات کو غور سے سنا اور ان کے جواب میں فرمایا کہ میں دیکھ کر جواب دوں گا لیکن اس کی کبھی نوبت نہیں آسکی۔

جالبی صاحب سے ملاقاتوں کی آخری یادیں راقم کے مصر جانے سے پہلے کی ہیں۔ جالبی صاحب جہاں بھی ہوتے صدر ہر جا کہ نشیند صدر است کے مصداق، صدرِ محفل دکھائی دیتے تھے۔ وطنِ عزیز کے صدر مملکت، اقبالیات پر لکھی جانے والی بہترین کتابوں پر سالانہ اوارڈ دیا کرتے ہیں۔ اقبال اکیڈمی کی اس کمیٹی میں جالبی صاحب اور دوسرے معزز منصفین کے ساتھ یہ خاکسار راقم سطور بھی شامل تھا۔ منصفین کے جس اجلاس میں جالبی صاحب آتے وہی اجلاس کی صدارت کیا کرتے اور ان کے وجود سے کرسی صدارت سج جایا کرتی تھی۔ ان کے انداز تکلم وصدارت میں سیکھنے کا بہت سا سامان ہوتا تھا اور یوں لگتا تھا کہ اس کرسی پر ان کے علاوہ کسی اور کا بیٹھنا زیبا نہیں۔ اس کے علاوہ ایک بار یوں

ہوا کہ لاہور یونی ورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز کے بورڈ آف گورنرز نے لمز میں اردو کی تدریس کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے راقم سے رابطہ کیا۔ ابتدائی ملاقاتوں کے بعد رسمی گفت وشنید کے لیے کراچی سے جالبی صاحب اور اسلام آباد سے فتح محمد ملک صاحب کو بلا کر ہر دو اصحاب سے چائے پر ملوایا گیا۔ مدعا یہ تھا کہ ممکنہ تقرر کے لیے ان حضرات کی رائے لی جائے۔ دونو بزرگوں نے راقم کے حق میں کلمہ خیر کہا لیکن انھی دنوں حکومت پاکستان کی جانب سے میرا تقرر جامعہ الازہر قاہرہ میں مسند اردو و مطالعہ پاکستان پر ہو گیا۔ اب دونو ہی صورتیں مثبت اور اردو کے حوالے سے مفید تھیں۔ میں نے جالبی صاحب کو صورت حال سے آگاہ کر دیا اور ان سے مشورے کا خواہاں ہوا۔ جالبی صاحب نے کہا کہ لمز میں اردو کی تدریس کا آغاز کرنا ایک بڑی خدمت اور اعزاز ہے لیکن قاہرہ جا کر آپ اس سے بھی زیادہ بڑے پیانے پر ملک و قوم کی خدمت انجام دے سکیں گے یوں انھوں نے قاہرہ کے حق میں مشورہ دیا۔ رفتہ رفتہ راقم کا رجحان بھی قاہرہ کی جانب ہو گیا۔ یوں لمز سے معذرت کرنا پڑی اور میں قاہرہ روانہ ہو گیا۔ اتفاق سے اس ملاقات کی یاد بھی ایک تصویر کی صورت میں موجود ہے۔ اس کے بعد اگر چہ جالبی صاحب طویل عرصہ تک حیات رہے لیکن کراچی اور لاہور کا فاصلہ ملاقات کی راہ میں حایل رہا۔ یہاں تک کہ ہمارے اور ان کے درمیان وہ فاصلہ آ پڑا جس کے بعد ملاقات اس روز ہو گی جس روز کے ہول سے سر سفید ہو چکے ہوں گے اور جب ''نہ مجھ کو تاب سوال ہو گی نہ اس کو اذنِ جواب ہوگا'' ...... جالبی صاحب بلا کے محنتی تھے۔ صبح فجر کے وقت بیدار ہوتے، ٹہلتے، نماز فجر ادا کرتے (اور وہ یہی ایک نماز ادا کرتے تھے) نو بجے تک گھر پر کام کرتے۔ اس کے بعد دفتر جاتے۔ دفتر میں ادب اور ادبی دنیا میں دفتر کو داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ دوپہر کا قیلولہ اور شام کو بیدار ہو کر غسل، چائے اور واک ان کے معمولات میں شامل رہے۔ رات کو وہ ڈیڑھ دو بجے تک جاگتے۔ گویا ان کی رات کی نیند چار گھنٹے سے زائد نہیں رہی۔ جب انسان صبح فجر سے نو بجے تک کام کر کے دفتر آتا ہے تو اس کے شانوں پر دن بھر کوئی بوجھ نہیں رہتا۔ وہ ویسی ہی خوش مزاجی کا مظاہرہ کر سکتا ہے جیسا کہ جالبی صاحب اپنے ملاقاتیوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ان کا آغاز اسکول کی مدرّسی سے ہوا تھا لیکن وہ اپنی محنت سے بڑے بڑے مناصب تک پہنچے اور انھوں نے ایک خوش حال زندگی گزاری۔ ایسی زندگیاں عام طور سے عیش و عشرت کے بعض ناپسندیدہ عناصر سے آلودہ ہو جایا کرتی ہیں لیکن جالبی صاحب کسی آلائش کا شکار نہیں ہوئے۔ کوئی نشہ کجا وہ سگریٹ تک نہیں پیتے تھے۔ پان کھانا

ان کا ایک شوق تھا جس سے ان کی شخصیت کے وقار میں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ خاص طریقے سے پکایا ہوا کتھا، دہی ملایا ہوا چونا، تلاش کر کے حاصل کی گئی پرانی چھالیا، الائچی، زردہ اور قوام ان کے پان کی خصوصیات تھیں۔ نفاست اور دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ بازار سے پان خریدنے کی بجائے انھوں نے پان کی بیل بھی اپنے گھر ہی میں لگا لی تھی۔ گو آخر کار ڈاکٹروں نے ان سے یہ سب کچھ چھین لیا لیکن عمر بھر ان کا پان سے ناتا رہا۔ سعودی عرب کے زمانہ قیام میں جب انھیں پان نہ ملے تو انھوں نے سگریٹ پینے کی کوشش کی مگر انھیں اس میں کامیابی نہ ہوئی۔

وہ ایک تہذیب کے نمائندہ تھے اور ان کی آنکھوں میں بہ قول جوش ملیح آبادی ''ذہانت کی چمک اور لہجے میں شرافت کی گمک پائی جاتی'' [۶۳] تھی۔ انھوں نے ایک کامیاب زندگی گزاری۔ عمر بھر جو جی چاہا وہ کیا اور جیسے جی چاہا کیا۔ ان کے لیے سوچنا، پڑھنا اور لکھنا زندگی کی سب سے بڑی سرگرمی رہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا اسی کیف اور فکر و احساس کے ساتھ لکھا جس سے ''ایک ناول نگار ناول لکھتا ہے یا شاعر شعر کہتا ہے یا مصور تصویر بناتا ہے یا مفکر اظہار خیال کرتا ہے'' انھیں یقین تھا کہ ''کام تو خود خوشبو ہے جو نہ صرف باقی رہتی ہے بلکہ جب آتی ہے تو سارے وجود کو تازہ دم کر جاتی ہے'' [۶۴] وہ اسی خوشبو پر یقین رکھنے والے مصنف تھے۔ وہ ہمارے درمیان سے رخصت ہو گئے لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کے کاموں کی خوشبو سے مستقبل کا ادبی منظر نامہ بھی مہکتا رہے گا۔ نظیری

از خردہ ای کہ دارد گل در قبا نگنجد
ہر جا کہ ہست ذوقی می گردد آشکارا

☆☆☆

﴿1﴾
صدر نشین

ڈاکٹر جمیل جالبی

تاریخ: ۵/اگست ۱۹۸۹ء

ذ......۱۲۴۰

محترمی زاہد منیر عامر صاحب، السلام علیکم

آپ کی دو کتابیں......لمحوں کا قرض [۶۵] اور اپنی دنیا آپ پیدا کر [۶۶] کا ایک ایک نسخہ موصول ہوا جن کے لیے شکر گزار ہوں۔ان دونوں کتابوں سے اندازہ ہوا کہ آپ ایک سوچنے والے ذہن کے مالک ہیں اور فلسفہ اور فکر کو عہد حاضر کے حوالے سے ادب کا حصہ بنانے میں مصروف ہیں۔ یہ ایک قابل تعریف رجحان ہے۔ان کتابوں کی اشاعت پر میری طرف سے دلی مبارک باد قبول کیجیے۔

بخدمت گرامی:　　　　آپ کا مخلص

جناب زاہد منیر عامر صاحب　　　　(دستخط) جمیل جالبی

دانشکدہ ۹۲۔اسلام پورہ سرگودھا۔　　　　(ڈاکٹر جمیل جالبی)

﴿2﴾

صدر نشین

ڈاکٹر جمیل جالبی

تاریخ: ۲۲/اکتوبر ۱۹۹۱ء　　　　ذ۔۱۶۸۲

عزیزم! السلام علیکم

آپ کا خط مورخہ ۱۷/اکتوبر ۱۹۹۱ء ملا۔حسبِ وعدہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں میں نے میر سوز والی بیاض/مخطوطہ دیکھا۔ [۶۷] مخطوطے کا نمبر یہ ہے ۳۶۹۹/SUI VII نمبر ۶۷۷۔ یہ بیاض متوسط تقطیع پر لکھی ہوئی ہے۔کاغذ موٹا، قلم جلی، خط معمولی اور بیاض کرم خوردہ ہے۔اس کے ابتدائی دو صفحے یعنی ایک ورق موجود نہیں ہے۔شروع میں دیوان نیاز (اردو) صفحہ ۳ سے صفحہ ۳۶ تک لکھا ہوا ہے اور اس پر نوشتہ ۱۲۷۳ ہجری درج ہے۔صفحوں کے نمبر بائیں جانب سے شروع کیے گئے ہیں۔ ہر شاعر کے کلام کے بعد نیا صفحہ نمبر شروع ہوتا ہے۔صفحہ ۱ سے ۹۷ تک دیوان نیاز فارسی لکھا گیا ہے۔صفحہ ۹۷ پر ایک شعر اردو کا

درج ہے۔صفحہ ۸۰ تمام اردو ہے۔صفحہ ۸۱ خالی ہے اور صفحہ ۸۲ پر پھر اردو اشعار دیے گئے ہیں۔دیوان مرزا سودا صفحہ ا سے ۲۹۳ تک لکھا گیا ہے۔صفحہ ۲۹۱ پر مومن کی اردو غزل لکھی ہوئی ہے۔صفحہ ۲۹۲ پر قدسی کی فارسی غزل درج ہے اور آخر میں لکھا ہے نوشتہ ۱۲۷۳ھ۔صفحہ ۲۹۴ پر ''کبت'' درج ہے۔صفحہ ۲۹۵ پر امیر خسرو کا فارسی کلام درج ہے۔صفحہ ا سے ۳۶ تک دیوان سوز (اردو) لکھا گیا ہے۔جیسا کہ میں نے کہا ہر شاعر کے کلام کے بعد صفحے کا نمبر نیا شروع کیا گیا ہے۔دیوان سوز بھی ۱۲۷۳ ہجری کا لکھا ہوا ہے مگر صفحہ ۲۶ کو توجہ سے دیکھا جائے تو اس پر تاریخ کتابت'' ۲۹۔شہر صفر المظفر ۱۲۷۳ھ بمقام کوتوالی، راجگڑھ لکھا ہوا ہے۔ ایک صفحے پر محمد عالمگیر بیگ کی مہر ۱۲۷۶ھ لگی ہوئی ہے۔اسی صفحے پر ۲۶ صفر المظفر ۱۲۷۳ھ بھی درج ہے اور اسی صفحے پر از قلم حقیر فقیر شہاب بیگ لکھا ہے۔اس سے پتا چلا کہ یہ بیاض شہاب بیگ کی لکھی ہوئی ہے۔ اسی کی ملکیت ہے۔بعد میں یہ محمد عالمگیر بیگ کے پاس آئی جس نے اس پر اپنی مہر ثبت کردی۔یہ ہیں وہ تفصیلات جو ایک گھنٹہ مخطوطے کو دیکھ کر اس سے حاصل کی گئی ہیں۔اب آپ کے سوالوں کا جواب:-

۱۔ اس کا کاتب شہاب بیگ ہے۔

۲۔ یہ بیاض ۲۹۔شہر صفر المظفر ۱۲۷۳ھ بمقام کوتوالی ،راجگڑھ میں مکمل ہوئی۔یہ ایک بیاض ہے اور باقاعدہ بیاض ہے جس میں صاحب بیاض نے دیوان نیاز اردو و فارسی، دیوان مرزا سودا، دیوان سوز، کبت وغیرہ اپنے ہاتھ سے نقل کیے ہیں۔

یہ بات تقابلی مطالعے سے معلوم ہوسکتی ہے کہ آیا یہ انتخاب ہے یا پورا دیوان نقل کیا گیا ہے۔[۶۸] لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ منتشر اوراق نہیں ہیں بلکہ باقاعدہ بیاض ہے۔

۳۔ یہ بات بغیر تقابلی مطالعے کے نہیں کہی جاسکتی کہ یہ مکمل دیوان سوز ہے یا دیوان سوز کا انتخاب ہے۔[۶۹] البتہ الف تا ی، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، بہ اعتبار حروف تہجی غزلیات نقل کی گئی ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ انتخاب/ دیوان کسی مخطوطے سے نقل کیا گیا ہے یا پھر اس سے انتخاب کیا گیا ہے۔میر سوز کے انتخاب مختلف اوقات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔مثلاً حسرت موہانی نے انتخاب میر سوز شائع کیا۔[۷۰] مولانا مبین چریا کوٹی نے

جواہر سخن میں میر سوز کا انتخاب دیا ہے۔[اے] اس بات کا جواب کہ اس انتخاب کا کیا "امتیاز" ہے بغیر تقابلی مطالعے کے نہیں دیا جا سکتا۔

جو باتیں میں نے مخطوطہ دیکھ کر نوٹ کی ہیں وہ اس خط کے ابتدائی حصے میں لکھ دی ہیں۔امید ہے کہ یہ معلومات آپ کے لیے مفید اور تحقیق میں معاون ہوں گی۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

بخدمت گرامی:	دعا گو
جناب زاہد منیر عامر صاحب	(دستخط) جمیل جالبی
شعبۂ اردو اورینٹل کالج	(ڈاکٹر جمیل جالبی)
پنجاب یونیورسٹی لاہور ۵۴۰۰۰	

﴿3﴾

صدر نشین

ڈاکٹر جمیل جالبی

تاریخ:۲؍دسمبر ۱۹۹۱ء

ذ۔۱۷۴۸

عزیزم، السلام علیکم

آپ کا خط ملا جس سے یہ معلوم ہوا کہ میرا بھیجا ہوا خط جس میں میں نے جامعہ پنجاب کی بیاض [۲ے] کے بارے میں تفصیلات فراہم کی تھیں، آپ کو مل گیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ امتحانات کی [۳ے] وجہ سے آپ میرے خط کی رسید نہیں دے سکے تھے۔

پچھلے دنوں میں کراچی گیا تھا اور دیوان میر سوز کو دیکھنے کے لیے ذرا سی دیر کے لیے اردو لغت بورڈ کراچی بھی گیا تھا۔ وہاں دیوان میر سوز کے دو نسخے ہیں۔ایک انڈیا آفس کے مخطوطے کی عکسی نقل ہے اور دوسرا دیوان میر سوز قلمی ہے۔جس کے کتاب سید میر ہیں اور تاریخ کتابت شہر جمادی الثانی روز سہ شنبہ ۴۵ ہجری درج ہے۔[۴ے]

امید ہے آپ بخیر وعافیت ہوں گے۔

بخدمت گرامی: آپ کا مخلص

جناب زاہد منیر عامر صاحب (دستخط) جمیل جالبی

شعبۂ اردو اورینٹل کالج (ڈاکٹر جمیل جالبی)

پنجاب یونیورسٹی لاہور ۵۴۰۰۰

﴿4﴾

صدر نشین

ڈاکٹر جمیل جالبی

تاریخ: ۱۶؍دسمبر ۱۹۹۱ء

ذ۔۶۳ ۱۷

عزیزم، السلام علیکم

ابھی ابھی آپ کا خط ملا۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ میں اسلام آباد میں ہوں [۵] اور یہ دونوں مخطوطے عکسی و قلمی اردو لغت بورڈ کراچی میں ہیں۔ دوسرا قلمی نسخہ جس کا ذکر میں نے اپنے خط میں کیا تھا وہ میر سوز کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ اگر اس سلسلے میں آپ کو مزید معلومات کی ضرورت ہو تو میرے حوالے سے لائبریرین اردو لغت بورڈ، ایس ٹی ۱۸۔اے، گلشن اقبال بلاک نمبر ۵، آف یونیورسٹی روڈ کراچی ۷۵۳۰۰ کو خط لکھ دیجیے۔ وہ جواب دیں گے۔ [۶] یہ لکھ دیجیے گا کہ میں نے کہا ہے۔ دیوان سوز کے بہت سے نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ان کی تفصیل مختلف کتب خانوں کی فہرستوں سے مل سکتی ہے۔ آج کل میں بہت مصروف ہوں اور کل رات ہی ماریشس سے واپس آیا ہوں۔ اس لیے مزید کچھ نہیں کہہ سکوں گا۔

امید ہے آپ بخیر وعافیت ہوں گے۔ خدا آپ کو اپنے کام میں کامیاب کرے۔

بخدمت گرامی: آپ کا مخلص

جناب زاہد منیر عامر صاحب (دستخط) جمیل جالبی

شعبۂ اردو، اورینٹل کالج (ڈاکٹر جمیل جالبی)

پنجاب یونیورسٹی لاہور ۵۴۰۰۰

﴿5﴾

۲۰
......
۹
......
۱۹۹۹ء

برادر عزیز۔ السلام علیکم

آپ کا خط ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ

یہ خبر پڑھ کر کہ آپ نے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کر لی ہے۔[۷] مجھے انتہائی خوشی ہوئی ۔میری طرف سے دلی اور بہت بہت مبارکباد قبول کیجیے۔ خدا کرے کہ آپ علم وادب کی دنیا میں اپنے کام سے جھنڈے گاڑ دیں۔

جولائی ۱۹۹۹ء کا قومی ڈائجسٹ مجھے نہیں ملا۔ آپ اپنے مضمون کی ایک نقل مجھے بھجوا دیجیے۔[۸] میں پڑھ لوں گا۔ کاپی صاف ہو تو آسانی ہوگی۔ آج کل کیا کام کر رہے ہیں؟

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

مخلص

جمیل جالبی

﴿6﴾

۸
......
۱۰
......
۱۹۹۹ء

محترمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا اور ''چار موسم ایچی سن کالج میں'' کی تینوں قسطیں بھی۔ دونوں کے لیے شکر گزار ہوں۔

میں نے یہ قسطیں دیکھ لی ہیں۔ یہ ایسی مربوط ہیں کہ ان میں کسی قسم کے اضافے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے تحقیق کو تخلیق سے ملا کر ایک اچھا کام کیا ہے۔ میری طرف سے دلی مبارک۔ دعا ہے کہ آپ زندگی میں خوب خوب ترقی کریں اور اپنے کاموں سے علم و ادب کو مالا مال کریں۔ بس کام میں لگے رہیے اور اچھے اچھے کام کرتے رہیے۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

مخلص

جمیل جالبی

مکرر

اسے کتابی صورت میں جلد شائع کرا دیجیے۔ یہ تحریر تو ایچی سن کالج والوں کے لیے بھی باعثِ افتخار ہوگی۔ [۷۹]

﴾7﴿

۸
......
۹
......
۲۰۰۱ء

محترمی ڈاکٹر زاہد منیر عامر صاحب۔ سلام مسنون

گرامی نامہ ملا اور ساتھ ہی لمحے کی روشنی [۸۰] کا ایک نسخہ بھی۔ دونوں کے لیے شکر گزار ہوں۔

ماضی کو یاد کرنا، یاد رکھنا یا محفوظ کرنا اچھی بات ہے مگر ابھی آپ کا ماضی اتنا قریب ہے کہ لمحۂ موجود/ امروز میں رہنا مفید ہوگا۔ آپ کی تحریر میں دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ اسے بھی دلچسپی سے پڑھا۔

میر سوز کی سوانح اور شخصیت کی رسید کتاب پڑھ کر آپ کو دی تھی اور اورینٹل کالج کے پتے پر خط بھیجا تھا۔ معلوم ہوا کہ میرا خط گلے کی بھیڑ کی طرح شیر اُچک کر لے گیا [۸۱] کتاب مجھے مل گئی ہے۔ ضائع نہیں ہوئی۔ ضائع جو چیز ہوئی وہ آپ کے نام میرا خط تھا۔ خدا کرے یہ خط آپ کو مل جائے مگر پتا کیسے چلے۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

مخلص

جمیل جالبی

﴿8﴾

۱۶
......
۹
......
۲۰۰۲ء

برادر عزیز۔ سلام مسنون

میر سوز سوانح اور شخصیت کا ایک نسخہ کل ڈاک سے ملا جس کے لیے شکر گزار ہوں۔ [۸۲] ان شاء اللہ جلد اس سے لطف اندوز ہوں گا۔

یہ خط رسید کے طور پر لکھ رہا ہوں تا کہ معلوم ہو جائے کہ کتاب مل گئی ہے۔ آپ سے بڑی امیدیں ہیں۔ کام میں لگے رہیے۔ ان شاء اللہ کامیاب ہوں گے۔

دعاؤں کے ساتھ

مخلص

جمیل جالبی

﴿9﴾

۲۷
......
۱
......
۲۰۰۳ء

عزیز محترم۔ السلام علیکم

آپ کی بھیجی ہوئی دو کتابیں: ترا عکس آئنوں میں [۸۳] اور جہات [۸۴] ملیں۔ ارمغان شیرانی [۸۵] مجھے ہاشمی صاحب نے دے دی تھی۔ میر سوز والی کتاب اس سے پہلے آپ نے بھجوائی تھی۔

اس خط کے ساتھ آپ کا تعارفی خاکہ اور نظموں کا مجموعہ (مسودہ) بھی ملا۔ میں آپ کی نظمیں دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں۔ اوراب یہ مطبوعہ مجموعہ ملا ہے تو اس سے بھی لطف اندوز ہوں گا۔

آپ کی خواہش ہے کہ میں آپ کے نئے مجموعے پر پیش لفظ لکھوں۔ میں ضرور لکھوں گا لیکن آپ کو خاصا انتظار کرنا پڑے گا۔ وجہ یہ ہے کہ میں گزشتہ آٹھ سال سے تاریخ ادب اردو کی تیسری جلد میں دھنسا ہوا ہوں [۸۶] اور فوری طور سے پیش لفظ لکھنا مشکل ہوگا۔ آپ خود صاحبِ قلم ہیں اس ذہن کا اندازہ کر سکتے ہیں جو تاریخ میں پوری طرح دھنسا ہوا ہو۔ بہر حال جیسا آپ فرمائیں۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

مخلص

جمیل جالبی

ڈاکٹر زاہد منیر عامر صاحب

﴿10﴾

۲۲رجولائی ۲۰۰۳ء

محترم زاہد منیر عامر صاحب السلام علیکم

گرامی نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ ایک خط میں جو ہوسٹل کے پتے پر بھیجا گیا تھا [۸۷] میں نے ساری صورت حال سے آپ کو مطلع کر دیا تھا اور وہ خط بول کر لکھوایا تھا [۸۸] جنوری سے میں بیمار ہوں ۔ دل کی سرجری ہوئی تھی اب آہستہ آہستہ ٹھیک ہو رہا ہوں۔ دماغ حاضر نہیں ہے۔ اس کے سفر واپسی میں کچھ وقت لگے گا۔ یہ مجموعۂ کلام تو بغیر مقدمہ ہی کے شائع کر دیجیے۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے اور مجھے بھی۔ ان شاء اللہ اگلے مجموعے پر یہ تحریر آ جائے گی۔ یار زندہ صحبت باقی

دعاؤں کے ساتھ

مخلص

جمیل جالبی

﴿11﴾

۱۵
......

۱۰
......
۲۰۰۴ء

محترمی زاہد منیر عامر صاحب۔السلام علیکم

گرامی نامہ ملا اور ساتھ ہی چار موسم ایچی سن کالج میں کا ایک نسخہ بھی۔دونوں کے لیے شکر گزار ہوں۔[89] خوب صورت بیان اور واقعیت کا امتزاج اس کتاب کی نمایاں خصوصیت ہے۔دعا ہے کہ علم و ادب کے میدان میں آپ خوب خوب ترقی کریں۔

میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔حال ہی میں واپس آیا ہوں۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

مخلص

جمیل جالبی

﴿12﴾

۱۵
......
۱۲
......
۲۰۰۴ء

برادر عزیز ڈاکٹر زاہد منیر عامر صاحب! السلام علیکم

گرامی نامہ ملا۔یاد فرمائی کا شکریہ

میں نے چار موسم ایچی سن کالج میں کی رسید مختصر تاثرات کے ساتھ آپ کو ہوسٹل والے پتے پر جو خط پر درج تھا بھجوایا تھا۔ایک خط آپ کے کسی خط کے جواب میں اورینٹل کالج کے پتے پر بھجوایا تھا۔اب آپ سب سے پہلے مجھے یہ بتائیے کہ میں آپ کو خط کس پتے پر لکھوں۔وہ پتا براہ کرم مجھے جلد بھجوا دیجیے تا کہ مجھے اطمینان ہو کہ خط آپ کو مل گیا ہے۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

مخلص جمیل جالبی

﴿13﴾

تقریش

ڈاکٹر زاہد منیر عامر کو میں برسوں سے جانتا ہوں، جب بھی اُن سے ملاقات ہوئی محسوس ہوا کہ وہ ہر لمحہ علم وادب کی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ دل لگا کر لگن سے کام کرتے ہیں اور جو کام کرتے ہیں اُس سے ان کی ذہانت ومحنت کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ ان کا سارا تعلیمی ریکارڈ ''درجہ اول'' سے بھرا ہوا ہے۔ ایم۔اے میں وہ فرسٹ کلاس فرسٹ آئے، پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے میر سوز کا کلیات مرتب کیا تو تجربہ کار محققوں نے بھی داد دی۔ طلائی تمغوں سے ان کا سینہ بھرا ہوا ہے۔ اب وہ پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں[۹۰] اور معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ کی کامیابیاں ان کی منتظر ہیں، وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کے متعدد تحقیقی وتنقیدی مقالے معیاری علمی وادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں ۔جہات کے نام سے ان کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے اس میں ان کے تنقیدی، فکری اور تحقیقی مضامین شامل ہیں، ان کی فکر روشن اور قلم شگفتہ ہے۔

تحقیق وتنقید کے ساتھ وہ قابلِ توجہ شاعر بھی ہیں۔ نوجوان ہیں، اس لیے محبت کی شعاعیں ان کی زندگی کو منور رکھتی ہیں۔ وہ غزل سے زیادہ نظم کے شاعر ہیں، تراعکس آئنوں میں کے نام سے ان کی نظموں کا ایک مجموعہ آج سے چار پانچ سال پہلے شائع ہو چکا ہے جس میں دس بارہ غزلیں ہیں اور باقی سارا مجموعہ نظموں پر مشتمل ہے۔ جیسا میں نے کہا ''محبت'' ان کا بنیادی جذبہ ہے جو عام طور پر سماجی عوامل سے جڑا ہوا نہیں ہے۔ ان کی نظموں میں ایک آڑا تر چھا احساس ایک تخلیقی زاویے کو جنم دیتا ہے جس سے نظم روشن ہو جاتی ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ جوان کا دوسرا مجموعہ ہے،[۹۱] صرف اور صرف نظموں پر مشتمل ہے ،ساری نظمیں پہلے مجموعے کی نظموں کی طرح ،آزاد نظمیں ہیں ۔اس مجموعے میں ان کی قوتِ اظہار نے ایک اور منزل سر کی ہے جس سے ان کے شعری ارتقا کا نیا روپ سامنے آتا ہے۔ یہاں بھی ''زندہ محبت'' ان کی نظموں میں تازگی کو جنم دیتی ہے اور اسے خوشبو میں بدل دیتی ہے۔ زاہد منیر عامر کی شاعری جذبہ واحساس کی شاعری ہے جس میں خلوص اور معصومیت نے اثر وتاثیر کو جنم دیا ہے۔ اب خیر سے وہ چالیس سال کے ہونے والے ہیں، مجھے یقین ہے کہ اب ان کی شاعری ایک اور کروٹ بدلے گی اور محبت میں ''فکر'' کا عنصر شامل ہو کر گہرائی کو جنم دے گا اور ان کا قلم رُک رُک کر شاعری کرے گا۔ ان کی بعض نظمیں پڑھ کر گاہ گاہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خواب کی حالت میں ہیں۔ وہ خواب جو لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں سے شعور کی سطح پر آ کر ان کی شاعری میں رنگ گھولتے ہیں۔ یہی خواب زندگی ہیں اور یہی زندگی تخلیق کا ثمر ہے۔

اس نئے مجموعے کی اشاعت پر میں زاہد منیر عامر کو مبارک باد دیتا ہوں۔

بملاحظہ ڈاکٹر جمیل جالبی

ڈاکٹر زاہد منیر عامر ۲۸/اگست ۲۰۰۵ء

لاہور

ملنے پر رسید ضرور دیجیے، فوراً

جمیل جالبی

﴿14﴾

۸

......

۹

......

۲۰۰۵ء

محترمی زاہد منیر عامر صاحب۔السلام علیکم

آپ کا خط ملا جس کے لیے شکر گزار ہوں۔آپ نے جو کاغذات مجموعۂ کلام کے ساتھ بھیجے تھے ان میں آپ نے اپنا عہدہ اسسٹنٹ پروفیسر ہی لکھا تھا اور وہی میں نے لکھ دیا۔ ایسوسی ایٹ پروفیسر ہونے کی خوش خبری آپ نے آج سنائی ہے۔سو مبارک باد۔آپ [اسے] اپنے قلم سے درست کر دیجیے۔لفظ تقریش میں نے وضع کیا ہے جس سے مراد وہ پیش لفظ ہے جس میں تقریظ کا پہلو نمایاں ہو۔[۹۲] اگر آپ کو پسند ہے تو اسے برقرار رکھیے ورنہ کاٹ کر پیش لفظ لکھ دیجیے۔

تاریخ جامعہ پنجاب کا کوئی نسخہ مجھے نہیں ملا حالانکہ میں اسے پڑھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میری طرف سے وی سی صاحب سے گزارش کر دیکھیے۔امید ہے وہ اجازت دے دیں گے[۹۳] آپ مجھے عزیز ہیں اور میں آپ کو علم و ادب کی دنیا میں روشن ستارہ بن کر چمکتا ہوا دیکھنے کا خواہش مند ہوں۔خدا آپ کو صحت مند و سلامت رکھے۔

دعاؤں کے ساتھ

دعا گو

جمیل جالبی

حواشی

۱ ممتاز مفتی او کھے اولڑے لاہور: فیروزسنز ۱۹۹۵ء ص ۱۵۷

۲ ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادب اردو لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۸۷ء جلددوم (اٹھارویں صدی) صص ۹۵۔ ۹۷

۳ زاہد منیر عامر مولانا ظفر علی خان ...... کتابیات اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۹۳ء

۴ ڈاکٹر جمیل جالبی اردو تحقیق کی روایت ایک مصاحبہ ادبی تحقیق، لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۹۴ء ص ۳۸

۵ ڈاکٹر جمیل جالبی پاکستانی کلچر۔ قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ کراچی: الیٹ پبلشرز لمیٹڈ ۱۹۷۳ء (پہلی اشاعت ۱۹۶۴ء)

۶ ۱۹۸۴ء و ۱۹۸۶ء

۷ پروفیسر عزیز احمد برصغیر میں اسلامی کلچر ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ ۱۹۹۰ء

۸ پاکستانی کلچر۔ قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ ص ۱۴

۹ ۱۹۸۹ء

۱۰ ڈاکٹر جمیل جالبی برصغیر میں اسلامی کلچر لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ ۲۰۰۵ء ص ۱،۲

۱۱ جامعہ کراچی کے شعبہ علوم ابلاغیات کے سابق سربراہ اور راقم کے دوست پروفیسر ڈاکٹر طاہر مسعود جالبی صاحب کے پبلک ریلشنز آفیسر بھی رہے، انھوں نے تحریر فرمایا ہے:

''...... مجھے انھوں نے ہدایت کی کہ پریس کانفرنس میں پڑھنے کے لیے ان کی تقریر تیار کردوں (جالبی صاحب ہمیشہ لکھی ہوئی تقریر پڑھنے کے عادی رہے بہت بعد میں وہ تقریر پڑھنے کے بعد تھوڑی بہت گفتگو زبانی کرلیا کرتے تھے)

اوراق ناخواندہ کراچی: ہما پبلشنگ ہاؤس ۲۰۱۶ء ص ۸۵

۱۲ نوشابہ صدیقی چشم حیراں کراچی: اکادمی بازیافت ۲۰۱۹ء ص ۱۹
۱۳ ڈاکٹر جمیل جالبی پیش لفظ فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ جلد اوّل، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۹۱ء صفحہ ج، د
۱۴ ڈاکٹر جمیل جالبی پاکستان میں ذریعہ ء تعلیم کا مسئلہ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ـ ۱۹۹۳ء ص ۱۴
۱۵ ایضاً ص ۱۴
۱۶ ایضاً ص ۵
۱۷ ایضاً ص ۷
۱۸ ایضاً ص ۱۶
۱۹ ایضاً ص ۱۲
۲۰ ارسطو بوطیقا مترجمہ عزیز احمد کراچی: انجمن ترقی اردو ۱۹۸۶ء ص ۲۶
۲۱ ایضاً ص ۲۹
۲۲ ایضاً ص ۳۶
۲۳ ڈاکٹر طاہر مسعود یہ صورت گر کچھ خوابوں کے کراچی: ہما پبلشنگ ہاؤس ۲۰۱۷ء ص ۴۵۸
۲۴ ڈاکٹر عطش درانی در بوطیقا ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۹۸ء ص ۶
۲۵ ڈاکٹر جمیل جالبی ارسطو سے ایلیٹ تک اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن ۱۹۸۸ء (یہ کتاب پہلی بار ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی) ص ۸۴
۲۶ ارسطو بوطیقا ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۹۸ء ص ۲۹
۲۷ ایضاً ص ۴۸
۲۸ ایضاً ص ۲۲
۲۹ یہ صورت گر کچھ خوابوں کے ص ۴۵۸
۳۰ ارسطو سے ایلیٹ تک ص ۱۱۸
۳۱ ارسطو شعریات مترجمہ شمس الرحمٰن فاروقی دہلی: ترقی اردو بیورو ۱۹۸۰ء ص ۸۱

۳۲ *The Poetics of Aristotle;* translated from Greek into English and from Arabic into Latin. Hodder and Stoughton, 1911

۳۳ شعریات دیباچہ ص ۷

۳۴ شعریات ص ۸

۳۵ M.A Enan *Ibn Khaldun His life and work* Islamabad: Services Book Club1986 Page 67

۳۶ *Op- Cit*

۳۷ مولوی صاحب کا یہ خط سیّد ہاشمی فرید آبادی کے نام ہے اور ہنوز کہیں شائع نہیں ہوا ہے۔ راقم کی اس خط تک رسائی ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کی عنایت سے اس مضمون کی صورت میں ہوئی جو انھوں نے شعبہ اردو پنجاب یونی ورسٹی کے تحقیقی مجلّے باز یافت میں اشاعت کے لیے ارسال فرمایا ہے۔

۳۸ ڈاکٹر وحید قریشی مقالات تحقیق لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۱۹۸۸ء ص ۳۳ و ۳۵

۳۹ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں اس خطی نسخے کا نمبر ۸۷۰۸ /۱۳-۸۹۱ ج ۸۷۱ د

۴۰ ڈاکٹر وحید قریشی (مرتب) دیوان جہاندار لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۶۶ء ص ۳

۴۱ فخر دین نظامی مثنوی نظامی دکنی مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی کراچی: انجمن ترقی اردو صفحہ ز تا ح

۴۲ عبدالحق نصرتی کراچی: انجمن ترقی اردو طبع ثانی ۱۹۶۱ء

۴۳ عابد رضا بیدار تدوین متن کے مسائل خدابخش سیمینار پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری ۱۹۸۲ء ص ۳ موصوف کی پوری عبارت ملاحظہ ہو: ''مقدمہ میں متن کے مرتب کی طرف سے تدوین شدہ نسخے اور اس کے مصنف کے بارے میں ضروری اور ناگزیر نکات کے سوا کچھ بھی پیش کرنا علمی غیر دیانت داری کے ساتھ ساتھ اخلاقی جرم بھی ہے۔ مقدمہ نگار کو ہر نکتہ پیش کرتے وقت یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ اس مخصوص نکتے کی ایسی اہمیت ہے جو بن لکھا رہ گیا تو اس میں تدوین کی تفہیم و تحسین کا حق ادا نہیں ہو پائے گا۔ مقدمہ کو to the point اور مختصر ہونا چاہیے''

۴۴ ڈاکٹر جمیل جالبی دیوان حسن شوقی کراچی: انجمن ترقی اردو ۱۹۷۱ء ص ۳۰

۴۵ ایضاً ص ۴۸

۴۶؎ ایضاً ص۲

۴۷؎ ایضاً ص۴۸

۴۸؎ جمیل جالبی مقدمہ،دیوان نصرتی لاہور:قوسین ۱۹۷۲ءص۱۴

۴۹؎ دیوان نصرتی ص ۷۹،۸۰

۵۰؎ لچھمی نرائن شفیق شـــام غــریبـــان مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی،کراچی:انجمن ترقی اردو۱۹۷۷ء ص۲۱۶

۵۱؎ شام غریبان ص۲۱۷

۵۲؎ غالب،خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر مکتوب۲۱لاہور:مجلس یادگار غالب،پنجاب یونی ورسٹی ۱۹۶۹ءجلداول ص۲۷۳

۵۳؎ ایضاً ص۲۷۵

۵۴؎ ڈاکٹرعبدالستارصدیقی

خطوط غالب مرتبہ منشی مہیش پرشادحاشیہ ص۳۴۳بحوالہ خطوط غالب مرتبہ مہرمحولہ بالا ص۲۷۳

۵۵؎ خطوط غالب جائے مذکور

۵۶؎ خطوط غالب جلداول ص۲۷۷

۵۷؎ محمدقہرمان مقدمہ تصحیح وتعلیقات،دیوان حاجی محمد جان قدسی مشہدی مشہد:انتشارات دانشگاہ فردوسی،مشہد۱۳۷۵

۵۸؎ رشیدحسن خان ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ لاہور:الفیصل ناشران ۱۹۸۹ء صص ۲۸۹۔۔۳۵۰

۵۹؎ مشفق خواجہ اردوادب کی پہلی تاریخ در ڈاکٹرجمیل جالبی -- بڑی مشکل سے ہوتاہے چمن میں دیدہ ورپیدا مرتب ڈاکٹرمحمدخاورجمیل کراچی:ایلیٹ پبلشرز۲۰۱۶ء صص ۵۶۷۔۔۵۸۱

۶۰؎ ڈاکٹرجمیل جالبی تاریخ ادب اردو،لاہور:مجلس ترقی ادب ۱۹۸۷ء ج۲،ص۹۴۷

۶۱؎ حسرت موہانی ارباب سخن،اوّل ودوم لکھنو:اترپردیش اردواکادمی۱۹۸۲ءص۴

۶۲؎ زاہدمنیرعامر کلیات میرسوز لاہور:مجلس ترقی ادب ۲۰۱۵ءجلددوم ص۲۹۳نیزاس حوالے سے راقم کانوٹ ص۴۶۲

۶۳۔ شاہد احمد دہلوی گنجینہ گوہر کراچی: مکتبہ اسلوب س۔ن ص ۲۱۰

۶۴۔ ارسطو سے ایلیٹ تک ،پیش لفظ

۶۵۔ نوجوان نسل کے فکری اور جذباتی مسائل پر راقم کی ایک کتاب جو نیشنل بک کونسل آف پاکستان کے تعاون سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔

۶۶۔ راقم کی ایک اور کتاب جو اسی زمانے میں شائع ہوئی۔لاہور: گلوب پبلشرز ۱۹۸۹ء

۶۷۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا راقم نے جالبی صاحب سے اس بیاض کے دیکھنے اور اس پر رائے دینے کی فرمائش کی تھی۔ وہ ازرہ کرم اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں تشریف لے گئے اور اس بیاض کو ملاحظہ فرما کر اس کے بارے میں اپنے مشاہدات اس خط کی صورت میں ارقام فرمائے۔

۶۸۔ پورا دیوان نہیں یہ محض انتخاب ہے۔

۶۹۔ ایضاً مکمل دیوان نہیں حسب دستور تمام ردیفوں سے انتخاب کیا گیا ہے۔

۷۰۔ **دیوان سوز** مرتبہ سیّد فضل الحسن حسرت موہانی بی اے، ایڈیٹر **اردوئے معلّٰی** علی گڑھ۔اس کتابچے میں صفحہ ایک سے آٹھ تک مرتب کا مقدمہ ہے۔اس کے بعد: ''میر سوز کا حال'' درج ہے اور پھر ردیف وار انتخاب غزلیات ،آخر میں متفرقات۔قطعات سوز پر وضاحت کی گئی ہے؛ ماخوذ از **تذکرۂ جلوۂ خضر** مؤلّفہ

صفیر بلگرامی۔غزلیات متفرق از **چمنِ بے نظیر** مطبوعہ بمبئی۔غزلیات سوز ماخوذ از ضمیمہ اخبار **قدیم کارنامہ** لکھنؤ از مخمسات مرزا خانی نوازش۔غزلیاتِ سوز از **مجمع الاشعار** (دو غزلیں) تعداد صفحات: ۳۲۔یہی انتخاب حسرت موہانی کی **انتخاب سخن** (لکھنو: اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۳ء) جلد چہارم صفحہ ۱۸۳ تا ۲۱۰ پر شامل ہے۔فرق یہ ہے کہ کتابچے میں ہر حصے کے محوّلہ بالا ماخذ بھی درج ہیں جبکہ **انتخاب سخن** میں انھیں حذف کر دیا گیا ہے۔دیکھیے **کلیات میر سوز** لاہور: مجلس ترقی ادب ۲۰۰۷ء جلد اول ص ص ۳۹۔۴۰

۷۱۔ محمد مبین کیفی چریا کوٹی جواہر سخن الہ آباد: ہندوستانی اکیڈمی ۱۹۳۵ء جلد دوم

۷۲۔ شہاب بیگ کی محولہ بالا بیاض ۔

۷۳۔ ان دنوں راقم ایم اے اردو کے حتمی امتحانات میں مصروف تھا۔

۷۴۔ انڈیا آفس کے مخطوطے کی نقل مجھے مل گئی تھی۔اردو لغت بورڈ میں موجود خطی نسخے کی نقل بھی

بعد میں حاصل کر لی گئی جس کا تعارف راقم کی کتاب کلیات میر سوز جلد اول (طبع لاہور ۲۰۰۷ء) میں مندرج ہے۔ دیکھیے صفحہ ۳۲

۷۵۔ ہندوستان سے آنے کے بعد جالبی صاحب کا قیام کراچی میں رہا سوائے اس زمانے کے جب وہ بہ سلسلہ ملازمت لاہور یا اسلام آباد میں مقیم ہوئے۔

۷۶۔ اردو لغت بورڈ میں جالبی صاحب کے حوالے سے خط لکھا گیا جہاں سے مندرجہ ذیل جواب موصول ہوا

۱۲ر جنوری ۱۹۹۲ء

مکرمی! السلام علیکم۔ آپ کا گرامی نامہ دیوان میر سوز کے عکسی نسخہ کے بارے میں موصول ہوا۔ اس سلسلے میں جو معلومات آپ کو درکار ہیں وہ بہت ٹیکنیکل ہیں اور خطی نسخہ کا پڑھا بھی آسان نہیں ہے۔ اس لیے آپ کی مطلوبہ معلومات فراہم نہ کر سکنے پر شرمندہ ہوں۔ ویسے جب کبھی آپ کراچی آئیں تو بورڈ کے کتب خانے میں تشریف لا کر یہ نسخہ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ آپ کی مطلوبہ معلومات فراہم نہ کر سکنے پر ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں۔ والسلام۔ فاطمہ قدسیہ نقوی (لائبریرین)

۷۷۔ پی ایچ ڈی کی تکمیل ۱۹۹۸ء میں ہوئی اور باقاعدہ آرڈرز ۳ر ستمبر ۱۹۹۹ء کو جاری ہوئے۔

۷۸۔ راقم کی کتاب چار موسم ایچی سن کالج میں کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے قسط وار ماہ نامہ قومی ڈائجسٹ میں شائع ہوتی رہی۔ یہ انھی اقساط کا ذکر ہے جو جالبی صاحب کی خدمت میں ارسال کی گئیں۔

۷۹۔ یہ اقساط مرتب ہو کر ۲۰۰۴ء میں عنوان بالا کے تحت کتابی صورت میں شائع ہو گئیں۔ ناشر ملک اینڈ کمپنی لاہور

۸۰۔ مطبوعہ لاہور: اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی سنہ ۲۰۰۰ء

۸۱۔ شیر کا خط تھا شیر ہی لے جا سکتا تھا

۸۲۔ پچھلے خط مرقومہ ۸ر ستمبر ۲۰۰۱ء میں بھی اس کتاب کے ملنے کا ذکر ہے؟ دیکھیے مکتوب نمبر ۷

۸۳۔ راقم کے دوسرے شعری مجموعے کا نام ہے، شائع کردہ خزینہ علم و ادب لاہور ۲۰۰۰ء

۸۴۔ راقم کے مقالات کا مجموعہ جو پنجاب یونی ورسٹی نے شائع کیا۔ لاہور: کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ پنجاب یونی ورسٹی ۲۰۰۰ء

۸۵۔ نام ور محقق حافظ محمود خان شیرانی کی یاد میں راقم اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کا مرتب

کردہ ارمغان علمی جسے شعبہ اردو پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے ۲۰۰۱ء میں شائع کیا گیا۔ صفحات ۳۲۸

۸۶۔ تاریخ ادب اردو کی یہ جلد بیسویں صدی کے نصف اول تک کے دور کا احاطہ کرتی ہے اور بحمد اللہ پایہ تکمیل کو پہنچ کر جون ۲۰۰۶ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہو گئی۔

۸۷۔ یعنی پنجاب یونی ورسٹی نیو کیمپس کا ہاسٹل نمبر سات جہاں اس وقت راقم الحروف سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے مقیم تھا۔

۸۸۔ غالباً یہ خط مجھے نہیں ملا کیونکہ میرے پاس جو خطوط موجود ہیں وہ جالبی صاحب کے اپنے دست و قلم کا نتیجہ ہیں۔

۸۹۔ دیکھیے حوالہ نمبر ۳۶،۳۵

۹۰۔ جیسا کہ اگلے خط سے وضاحت ہوگی جالبی صاحب نے یہاں اسسٹنٹ پروفیسر لکھ دیا تھا جسے ان کی ہدایت پر درست کیا گیا۔ راقم ۲۳ اپریل ۲۰۰۵ء سے ایسوسی ایٹ پروفیسر ہو چکا تھا۔

۹۱۔ دراصل یہ راقم کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ ۱۹۸۹ء میں پہلی سحر کے رنگ کی عنوان سے شائع ہوا تھا دوسرا تراعکس آئنوں میں ۲۰۰۰ میں شائع ہوا، جالبی صاحب نے تیسرے مجموعے کے لیے یہ تحریر لکھی، دیکھیے: نظم مجھ سے کلام کرتی ہے (لاہور: تناظر مطبوعات ۲۰۰۶ء)۔

۹۲۔ راقم نے جالبی صاحب کے دیے ہوئے اس اختیار کو استعمال نہیں کیا ان کے قلم نے جو لکھا تھا اسی کو برقرار رکھا کہ یہ جالبی صاحب کا ایک انداز تھا وہ بعض اوقات خود سے لفظ گھڑ لیا کرتے تھے جیسے انھوں نے میر کے نکات الشعرا کے لیے ''تحقیدی تذکرہ'' کی ترکیب استعمال کی جو انھوں نے تحقیق اور تنقید کو ملا کر بنائی تھی۔ اسی طرح یہاں تقریظ اور پیش لفظ کو ملا کر تقریش بنا ڈالا۔ راقم اس حوالے سے اپنے ایک مضمون میں اظہار خیال کر چکا ہے۔ فہو ھذا:

......اس مرحلے پر ندیم صاحب نے احقر کے مسودے میں موجود محترم ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے دیباچے کے عنوان کی بابت استفسار کیا......محترم جالبی صاحب نے اپنے دیباچے کا عنوان ''تقریش'' درج کیا تھا جب ان کا دیباچہ موصول ہوا تو احقر نے اس لفظ کا مطلب جاننے کے لیے لغات سے رجوع کیا لیکن کہیں اس لفظ کا اندراج نہ پا کر جالبی صاحب کی خدمت میں راہ نمائی کی درخواست کی گئی۔ انھوں نے فرمایا کہ میں نے تقریظ اور پیش لفظ کو ملا کر یہ نیا لفظ وضع کیا ہے......ندیم صاحب کے استفسار پر، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انھوں نے احقر کی نظموں کے مسودے کو غور سے پڑھا ہے، جالبی

صاحب کا جواب عرض کیا گیا، جس پر ندیم صاحب نے فرمایا کہ اس سے پہلے بھی جالبی صاحب نے ایک ایسا ہی لفظ گھڑا تھا جس پر مجھے ہندوستان سے فون آیا کہ جالبی صاحب سے کہیے کہ یہ لفظ درست نہیں ہے......احقر نے وضاحت کی کہ وہ لفظ ''تحقید'' تھا جو جالبی صاحب نے اپنی کتاب ادبی تحقیق میں میر کے تذکرے نکات الشعرا کے لیے استعمال کیا ہے اور یہ لفظ انھوں نے تحقیق اور تنقید کو ملا کر وضع کیا ہے، وہ کتاب مجلس ترقی ادب ہی سے شائع ہوئی ہے، خود ندیم صاحب کے ردِعمل سے ان الفاظ کے لیے پسندیدگی ظاہر نہیں ہو رہی تھی، احقر نے اس موقع پر مزید کچھ کہنے سے گریز کیا۔ ویسے عربی قاعدے کی رو سے یہ الفاظ باب تفعیل میں جاتے ہیں اور وہاں تقریش کا معنی قریشی بنانا اور تحقید کا معنی نفاق پیدا کرنا ہو جاتا ہے۔ ندیم نما، احمد ندیم قاسمی کے خطوط در تخلیقی ادب، اسلام آباد: نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگوایجز، ۲۰۰۷ء شمارہ ۴

۹۴ تاریخ جامعہ پنجاب کی طباعت اور اس کے بعد اشاعت کی ایک طویل کہانی ہے اس کے بعض کردار اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔ یہ کہانی کسی مناسب موقعے پر نذر قارئین کی جائے گی۔

☆☆☆☆☆

ضمیمہ: جالبی صاحب کے نام راقم کے دو خط مربوط بہ مکاتیب دوم و چہارم

....

لاہور

۲۰/۱۱/۹۱ء

مخدوم گرامی! السلام علیکم

آپ کا شفقت نامہ، جس میں آپ نے شہاب بیگ کی بیاض سے متعلق معلومات اور اپنی رائے سے مطلع فرمایا تھا جن دنوں ملا میں امتحانات میں الجھا ہوا تھا پھر چند در چند اسفار پیش آ گئے۔ اب میں لاہور میں آ کر قیام کے قابل ہوا ہوں تو یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ تاخیر کی معذرت چاہتا ہوں۔

آپ نے عندالملاقات سوز کے دیوان کے اس مخطوطے کا ذکر فرمایا تھا جو آپ کے ارشاد کے مطابق ''آصف جاہ'' کے کتب خانہ کے لیے خریدے جانے والے مخطوطوں میں شامل تھا۔ میں آج کل میر سوز کے جس مخطوطے پر کام کر رہا ہوں وہ برٹش میوزیم لندن میں ہے۔ اس کی مائیکرو فلم پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔ میری تحقیق کی بنیاد یہی فلم ہے میں نے اپنی سی کاوش کے بعد اس کے

اوّلین دو صفحات پر مندرج جو معلومات نوٹ کی ہیں ان کے مطابق یہ مخطوطہ (جس کی فلم پیش نظر ہے) ۱۲۶۲ھ میں لکھا گیا۔ کتابت کی تاریخ کا اسلوب یہ اشتباہ پیدا کرتا ہے کہ اس سنہ میں اس پر غالباً نظر ثانی کی گئی ملاحظہ ہو

''بتاریخ نہم ربیع الاول ۱۲۶۲ ہجری بجائزہ رسید''

دیوان میر سوز ۱۷۵ ورق

تین مہروں میں سے ایک مہر پڑھی جا سکی ہے جس کی عبارت کچھ یوں ہے:

خوش است مہر کتب خانہ سلیمان جاہ

[بہر] کتاب مزین چو نقش بسم اللہ (؟) نمبر ۳۱۶

ایک دستخط بھی ثبت ہیں جو بہت شکستہ ہیں ''منشی محمد'' .... اور ''عفی عنہ'' پڑھا جاتا ہے بیچ کا حصہ غالباً ''شفیع'' یا ''علی'' ہے۔

ایک مہر برٹش میوزیم لندن کی ہے، برٹش میوزیم کے اندراجات میں Place & Date of Origin کا خانہ خالی چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس نسخے کا خط نہایت عمدہ ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نالائق ہے اور اسے وزن کا بالکل شعور نہیں ہے۔

یہ تفصیلات اس لیے تحریر کی ہیں کہ آپ ان کی روشنی میں مجھے بتا سکیں گے کہ آپ کے ارشاد فرمودہ نسخے اور اس نسخے میں کیا تطابق یا تخالف ہے؟ اور یہ کہ اگر یہ نسخہ آپ کے علم میں ہے تو اس کی بابت کوئی اور تفصیل جو آپ بتانا پسند کریں، اس سے مجھے ضرور آگاہ فرما دیں۔ نوازش ہوگی۔ چڑیا کوٹی کا انتخاب تلاش کر رہا ہوں۔ غلام حسین صاحب نے بھی میر سوز کا ایک انتخاب کیا ہے جو اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو سے سنہ ۸۳ء میں شائع ہوا۔ کسی وقت اسے بھی دیکھ لیتا ہوں۔

کیا اردو لغت بورڈ کراچی میں موجود میر سوز، کے دیوان کے مخطوطے کی فوٹو کے حصول میں آپ کچھ مدد فرما سکیں گے؟

زحمت دینے کی معذرت چاہتا ہوں۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

نیاز مند

زاہد منیر عامر

....

لاہور

۷؍دسمبر۹۱ء

مخدوم گرامی! السلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ آج ہی موصول ہوا۔ممنون ہوں کہ آپ نے کراچی جا کر میری گزارش کو یاد رکھا اور لغت بورڈ میں مخطوطات ملاحظہ فرمائے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزا

بلوم ہالٹ کی فہرست میں دیوان میر سوز کے جس مخطوطے کا ذکر ہے اس کی تاریخ کتابت ۱۴؍ جمادی الثانی ۱۲۱۶ھ ہے جب کہ میرے زیر تحقیق مائیکروفلم والے مخطوطہ پر نہم ربیع الاول۱۲۶۲ھ کی تاریخ درج ہے(اس تاریخ سے متعلق،گزشتہ خط میں میرا سوال آپ کی توجہ سے محروم رہا ہے جب کہ اس فلم پر برٹش میوزیم کی مہر موجود ہے اور وہاں اس کا اندراج نمبر DR380 ہے Order P.S.O/4111

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انڈیا آفس/ برٹش میوزیم میں میر سوز کے دیوان کے دو مخطوطے موجود ہیں۔آپ نے اپنے گرامی نامہ میں لکھا ہے کہ لغت بورڈ میں ''انڈیا آفس کے مخطوطے کی عکسی نقل ہے''براہ کرم مطلع فرمائیں کہ یہ کسی نسخے کی نقل ہے اور یہ عکسی نقل فوٹوسٹیٹ ہے یا مائیکروفلم؟ دوسرا قلمی نسخہ جس کا آپ نے ذکر فرمایا ہے، کیا میر سوز کا لکھا ہوا ہے؟ کیونکہ میرے علم میں ایک ایسا نسخہ بھی آیا ہے جو میر سوز کا انتخاب کردہ ہے اس کے آغاز میں ''المحر رّہ سید محمد میر سوز'' لکھا ہوا ہے،اس نسخے کی پہچان اس کا نہایت خوش خط ہونا ہے کیونکہ میر سوز نستعلیق اور شفیعا میں کمال دسترس رکھتے تھے۔کیا یہ وہی نسخہ تو نہیں ہے؟اس ضمن میں ایک اور گزارش یہ ہے کہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے فورٹ ولیم کالج کی، سوسائٹی کے کتب خانہ میں موجود مطبوعات کی، جو فہرست شائع کی تھی ان میں، دیوان سوز کا بھی ذکر ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ دیوان (انتخاب) فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں بھی شامل رہا۔لیکن اس فہرست سمیت کسی ذریعے سے نہ تو اس کے مرتب و مدون کا نام پتہ چلتا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی نسخہ کہیں دستیاب ہو رہا ہے۔خیال تھا کہ نیشنل آرکائیوز انڈیا کے ذخیرہ مطبوعات فورٹ ولیم کالج میں اس کا کوئی نسخہ موجود ہوگا لیکن وہاں بھی نہیں ہے۔اگر آپ کے علم میں اس کا کوئی نسخہ ہو، یا آپ اس کی دیگر تفصیلات سے آگاہ ہوں تو ازراہ کرم ضرور مطلع فرمائیں۔(جائزہ مخطوطات اردو میں

مندرجہ تفاصیل میرے علم میں ہیں)

۳۔ قاضی عبدالودود صاحب کے ایک ذاتی (غیر مطبوعہ) نوٹ سے دیوان سوز کے ایک نسخہ اعلی حیدر کی اطلاع ملی ہے لیکن اس نوٹ سمیت کسی اور ذریعے سے اس نسخے کی کوئی تفصیل بہم نہیں پہنچ رہی۔ اگر اس سلسلہ میں بھی آپ کے علم میں کوئی تفصیل ہو تو مطلع فرما دیجیے۔ مجھے احساس ہے کہ میری یہ طول کلامی آپ کی مصروفیات کے حوالے سے مطلوب اختصار سے متجاوز ہے لیکن امید ہے کہ آپ اسے محسوس نہیں فرمائیں گے اور اپنی شفقت وتعاون سے نوازیں گے۔ امید ہے آپ بعافیت ہوں گے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

☆☆☆

اکیسویں صدی، روشن آنکھیں اور جمیل جالبی

ڈاکٹر ذکیہ رانی،
اسسٹنٹ پروفیسر،شعبۂ اردو جامعہ،
کراچی، پاکستان

ڈاکٹر جمیل جالبی اٹھارہ برس کی عمر میں ۱۳/اگست ۱۹۴۷ءکو میرٹھ سے پاکستان ہجرت کر آئے تھے۔(۱)سن ۱۹۴۷ء ہی وہ سال ہے جس میں جالبی پاکستانی اور مصنف قرار پائے۔بالحاظِ ذہانت وفطانت وہ نوعمری ہی سے یونانیوں کی فکر جیسے جرثومے رکھتے ہوں گے اگر ہندوستان میں خورشیدالاسلام جیسا یونانی ہوسکتا ہے تو پھر یونانیوں سے تدبر کا حامل نوجوان بھی ہوسکتا ہے۔مختصر یہ کہ جالبی صاحب میں ان کی اٹھان ہی سے فکری بصیرت کی جستجو پائی جاتی تھی۔ابتداء ہی سے جالبی صاحب پڑھاکو مشہور تھے۔یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اس وقت کراچی کے جید دانشور ادیبوں کے نا صرف منظورِ نظر ہوگئے بلکہ ادب اور سماج کے رشتوں کو بھی باہم کرنے کی آرزو میں مبتلا ہوگئے۔پاکستان آنے کے بعد مطالعہ اور تعلیم کا سفر جاری رہا۔۱۹۴۹ء میں انھوں نے ایم۔اے انگریزی،۱۹۵۰ء میں ایم۔اے اردو پھر ایل۔ایل۔بی کیا۔۱۹۵۳ء میں سول سروس کا امتحان پاس کیا اور انکم ٹیکس کے محکمہ سے منسلک ہوئے بعدازاں ۱۹۷۱ء میں پی ایچ۔ڈی اردو ہوگئے۔۱۹۷۶ء میں ڈی۔لٹ کیا اور ۱۹۸۸ء میں ڈی۔ایس۔سی کی اعزازی سند پائی۔(۲)عموماً بیوروکریسی اختیار کا حامل بنادیتی ہے اور علم وفضل سے دور کردیتی ہے۔جالبی صاحب کے ساتھ اس اختیار نے عجب روپ دھارا کہ نوعمری کی ادبی وعلمی نوعیت نے ایسی چھب دکھلائی کہ جس سے تاحال ادبی دنیا منوّر رہے۔

جمیل جالبی کے ڈاکٹر ہونے تک یہ طے ہوچکا تھا کہ موصوف کا خاص میدان تحقیق ہے۔ڈاکٹر صاحب یکم ستمبر ۱۹۸۳ء کو وائس چانسلر،جامعہ کراچی کی ذمہ داریوں سے بہرہ مند

ہوئے۔(۳)اس وقت جالبی صاحب چوّن برس کے تھے۔سنِ شعور سے اس عمر تک علم وادب ان کا اوڑھنا بچھونا رہا۔شیخ الجامعہ کی ذمہ داریوں کے بعد لکھنے پڑھنے میں کوئی فرق آتا بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوا۔اسی دوران انھوں نے اردو تنقید کا منشور تحریر کیا۔کاش اس منشور پر تمام حلقہ علم وادب میں مکالمہ کیا جاتا اور اس نئی تنقید کے حامل منشور پر اس انداز سے عمل کیا جاتا کہ ادب پاکستانی معاشرے کو ایسی اکائی میں بدل دیتا کہ جو ہر سطح پر مثالی قرار پاتی۔جالبی صاحب نے جب یہ منشور تجویز کیا تھا اس وقت ادبی گروہ بندی کا احوال پچاس ساٹھ گروہوں سے تعبیر کیا جاسکتا تھا لیکن آج ہزارہا گروہ اس انداز سے کام کررہے ہیں کہ ہر فرد ایک گروہ ہو چکا ہے۔موجودہ دنیا بالخصوص پاکستانی معاشرے کو آج 'نـئـی تـنـقـیـد' کے منشور کی زیادہ ضرورت ہے۔کہ کسی طور بکھری ہوئی اکائی یکجا ہونے کے آثار پیدا ہوں۔اس درجہ اہمیت کی حامل نئی تنقید کے حوالے سے جالبی صاحب کا نقطۂ نظر ملاحظہ ہو۔:

> ''ادب زندگی کی روح کا اظہار ہے۔زندگی ہی ادب کا خام مواد ہے۔اس لیے ان رجحانات کی نفی کرنا اور ان کے بجائے مثبت رجحانات اور رویوں کو آگے بڑھانا بھی آج تنقید کا کام ہے۔گویا اس پیغمبری وقت میں تنقید کا ایک کام تو یہ ہے:
>
> (۱) کہ وہ ان بیماریوں کو سامنے لائے جو غلط اقدار کو اختیار کرنے سے ہماری اجتماعی زندگی میں پیدا ہوگئی ہیں۔
>
> (۲)دوسرے ان بیماریوں کی الگ الگ تشخیص کر کے ان کا علاج دریافت کرنا بھی تنقید کا کام ہے۔
>
> (۳) تیسرے اپنی تاریخ ،اپنی روایت کے حوالے سے ان بنیادوں کو تلاش کرنا بھی تنقید

کا کام ہے جن پر نئے نظامِ خیال کی عمارت تعمیر کی
جاسکتی ہے۔
گویا نئی تنقید کو اس وقت دو سطحوں پر کام
کرنا ہے۔ایک ''فکر'' کی سطح پر اور دوسرے ''ادب''
کی سطح پر۔''(۴)

ڈاکٹر جمیل جالبی تنقید کے ذریعے سماج کی تطہیر کرنا چاہتے تھے۔ان کے اس منشور میں معاصر ادبی منظر نامہ دکھائی دیتا ہے ۔ جب تخلیق اور تنقید کا تعلق منقطع ہوا تو ادب اور سماج کا رشتہ براہِ راست متاثر ہوا۔اس کے اسباب

مطالعہ کی کمی اور مغربی علوم کے تراجم جو ادبی شعور میں پختگی پیدا کرنے کے پیروی کا سبب بن رہے تھے۔مغربی علوم کی اندھی تقلید نے ادب کو سماج کا آئینہ بننے سے روک دیا۔اسی ضمن میں انھوں نے فکری اور ادبی سطح پر نئی تنقید کا لائحہ عمل سترہ نکات میں پیش کیا۔ملاحظہ کیجیے۔

(۱) نئی تنقید کے دائرے کو صرف ادب
تک محدود نہ کیا جائے بلکہ اسے پوری زندگی پر پھیلایا
جائے تاکہ تجزیے،مطالعے اور غور وفکر کے
بعد فکر واحساس کی جڑیں صحیح قسم کی زندگی میں تلاش کی
جاسکیں۔صحیح قسم کی زندگی سے مراد وہ نظام اقدار
ومعیار ہے جس کے حوالے سے معاشرے کی اجتماعی
زندگی میں ایسی روح پھونکی جاسکے کہ تخلیقی جوہر زندگی
کے ہر شعبے میں نشوونما پانے لگے۔تخلیقی جوہر
ہر معاشرے کی حقیقی زندگی کے لیے وہی کام کرتا ہے
جو جسم میں روح کرتی ہے۔
(۲) تنقید ہر طرح کے سوالات
اٹھائے،سوال اٹھانا بذاتِ خود اتنا ہی اہم ہے جتنا

ان کا جواب تلاش کرنا۔سوال ہی سے فکر کی سمت
اور جواب کی تلاش کا عمل شروع ہوتا ہے۔
(۳)فرد اور معاشرے میں تنقیدی
روح کو بیدار رکھنا اور تحمّل سے دوسروں کے نقطۂ نظر کو
سننا،اس پر غور کرنا اور ذہنی دیانتداری کے ساتھ اس
کا جواب دینا تاکہ زندگی کی روح پھیل سکے۔سقراط
نے کہا تھا کہ ''بے تنقید زندگی گزارنا کتنا دشوار کام
ہے؟'' تنقید کا کام اپنے دور کی روح کو دریافت
کرنا اور اس میں نئے معنی شامل کرنا ہے۔
(۴)معاشرتی زندگی کو ہر قسم کے
جبر و سفّا کی سے پاک کرنا تاکہ بات کہنے کا خوف
دل میں باقی نہ رہے۔
(۵)قومی تشخص کی دریافت کے لیے
قومی ورثے کی جڑوں کو اجتماعی ،قومی وملّی تاریخ میں
تلاش کرنا اوران جڑوں کے رشتوں کو اپنے
معاشرے کے فکر و احساس سے جوڑنا۔لوک ورثہ
اور سینہ بہ سینہ پہنچنے والی روایات بھی اس سلسلے میں
اہمیت رکھتی ہیں۔اپنے ماضی کو اپنی نسل کے لیے
دریافت کرنا اور اسے تخلیقی قوتوں کی نشو ونما میں شامل
کرنا۔ماضی کو رد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ قوم نے
اپنا حافظہ کھو دیا ہے۔
(۶)ان منفی اقدار کے خلاف علمِ جہاد
بلند کرنا جو اجتماعی زندگی میں ناسور بن گئی ہیں اور جن

میں زبردستی ،معاشی ومعاشرتی عدم مساوات ،ناانصافیاں ،جبر اورآزادیِ اظہار پر بے جا بندشیں شامل ہیں۔

(۷)اپنے معاشرے کے مرکزی وبنیادی مسائل کومتعین کرنااورمعروضی وحقیقت پسندانہ انداز سے ان کا جائزہ لے کران میں ربط وسمت پیدا کرنا۔

(۸)معاشرے کےمختلف طبقوں کے درمیان ثنویت کے وجوہ تلاش کرنااوراس تضاد و ثنویت کودورکرنے کے لیےایساتعلیمی ومعاشی نظام دریافت کرناجوطبقاتی فرق اورعدم مساوات کوختم کرکےزندگی میں سب کے لیے یکساں مواقع فراہم کردے۔تعلیم ومعاش دونوں اساسی اہمیت رکھتے ہیں۔ہماری نئی نسل جواحساسِ محرومی کاشکارہے ،اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم اور ہمارانظامِ معاش ایک دوسرےکوردکررہے ہیں۔

(۹)جدیدسائنس نے کائنات میں انسان کے مقام کوایک نیارخ اورنیارنگ دیا ہے۔ صنعت وٹیکنولوجی کی کامیابیوں نے یہ واضح کردیاہے کہ سائنس کوپابہ زنجیرنہیں کیاجاسکتا۔کیاہم سائنس کوکسی ایسے تصورِحقیقت اورنظامِ خیال کے تحت لاسکتے ہیں کہ سائنس وٹیکنولوجی نظامِ اخلاق کی پابندہوکرانسان کوتباہی سے بچاسکے۔؟

(۱۰)ادب اور فکر کا رشتہ پورے طور پر زندگی سے جوڑنا اور اسے واضح کرنا۔ بند معاشرے کے دروازوں کو کھول کر جدید دنیا سے اس کے معنوی رشتے دریافت کرنا تاکہ تازہ ہوا کے جھونکوں سے جامد زندگی متحرک ہو کر آگے بڑھ سکے۔

(۱۱)تنقید کا کام یہ بھی ہے کہ وہ ادب پاروں کا تجزیہ ،مطالعہ اور تشریح کرے۔مثبت رجحانات کو اُبھارے۔ادب پاروں کے اسالیب،ساخت،تکنیک، جمالیاتی احساس اور تجربوں پر روشنی ڈالے۔انفرادیت کو جو ادب کی بنیادی خصوصیت ہے نمایاں کرے۔ تقابلی مطالعے سے ادب پاروں کا درجہ متعین کرے۔معاصر ادب کے منفی رجحانات کو رد کرے اور مثبت رجحانات کو منطقی ترتیب سے ایک جہت دے۔معاصر ادب سے نئی تنقید کا گہرا اور براہ راست رشتہ قائم رہنا چاہیے تا کہ تخلیقی قوتوں کو سرگرمِ عمل رکھا جا سکے۔اس کے لیے سارے تخلیقی ادب کو پڑھنے ،سمجھنے اور تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱۲) نئی تنقید کا ایک بنیادی کام یہ ہے کہ وہ دنیا کے دوسرے ادبیات کی اہم تخلیقات کو اپنی زبان میں منتقل کرے تا کہ نئی امتزاجی قوت سے تخلیقی توانائی کی مسلسل نشوونما ہوتی رہے اور معاصر ادب

کلیشوں (CLICHES) کے قبرستان میں دفن
ہوکر نہ رہ جائے۔

(۱۳)قدیم ادب کا پہلے اس کے اپنے
دوراور پھر معاصر دور کے حوالے سے مطالعہ کرنا تاکہ
اس کی قدر و قیمت اور صحیح اہمیت متعین کی جا سکے۔ان
اثرات کی تاریخ کا مطالعہ جو قدیم ادب سے ہمارے
معاصرادب میں شامل ہوئے ہیں۔ادب کی نئی
بصیرت حاصل کرنے کے لیے غیرادبی مآخذ
اورمختلف علوم سے استفادہ بھی ضروری ہے۔

(۱۴)اب تک ہمارے نقاد،تحقیق
اورادب کے مربوط مطالعے کے بغیر ایسی کلیّہ سازی
اور تعیم کرتے آئے ہیں جو فی الحقیقت بے
بنیاد ہیں۔نئی تنقید کو تحقیق پر اپنی عمارت کھڑی کرنی
ہے۔ایزرا پاؤنڈ کا ''اسکالر کریٹک'' ہی نئی تنقید
کا منصب پورا کرسکتا ہے۔

(۱۵)اب تک ہمارے نقاد سنی سنائی
بات، کسی دوسرے مصنف کے جملے یا کسی کتاب میں
پڑھے ہوئے فقروں کو اصل الفاظ کے ساتھ اقتباس
کیے بغیر ہی اپنے لفظوں میں لکھ دیتے ہیں اور پھر اس
پر اپنی بات کی دیوار اٹھادیتے ہیں۔نئی تنقید کے
نزدیک یہ عمل ذہنی غیر دیانتداری کے مترادف
ہے۔جس مصنف کا جملہ یا قول نقل کیا جائے اس
کے الفاظ کو وواین میں لکھا جائے اور یہ بھی بتایا جائے

کہ یہ جملہ کس کتاب میں کس صفحہ پر آیا ہے۔

(۱۶)اچھی نثر تخلیقی عمل ہے اور تنقید کی اچھی اور صاف نثر میں لکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔نئی تنقید کو اسالیبِ نثر،جملوں کی ساخت اور لہجوں کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے۔اسالیب کو نہ صرف ادب پاروں میں بلکہ دوسرے علوم کی کتابوں میں بھی تلاش کرنا چاہیے تاکہ اچھی نثر لکھنے کی روایت قائم کی جا سکے۔نثری تخلیقات مثلاً ناول،افسانہ،ڈرامہ وغیرہ کے تنقیدی مطالعے کو بھی وہی اہمیت دی جائے جو اَب تک شاعری کو دی جاتی رہی ہے۔شاعری میں بھی غزل کے مطالعے تو ہمارے ہاں ہوئے ہیں لیکن اب طویل نظموں اور شاعری کی دوسری اصناف کو بھی یکساں اہمیت دینی چاہیے۔ادب اورادیبوں کا مطالعہ،اصناف ومسائل کا تجزیہ،مختلف تخلیقاتِ نظم ونثر کی تشریح تنقید کاایک کام ہے اور یہ مسلسل کیا جانا چاہیے۔

(۱۷)نئی تنقید چونکہ امتزاجی مزاج کی حامل ہوگی اس لیے اس سطح کو بھی اسے تلاش ودریافت کرنا ہے جس پر یہ امتزاج ممکن ہو سکے۔

نئی تنقید کے اس خاکے کو،جسے جدید وبین الاقوامی اصطلاح میں 'مینی فیسٹو' کہہ سکتے ہیں، پورے طور پر بروئے کار لانا یقیناً کسی ایک فرد کی ذہنی وجسمانی قوت سے باہر ہے۔لیکن کام کا

آغاز ہی اس کا انجام ہے۔ آیئے ہم سب مل کر اس
کام کا آغاز کریں۔ ''(۵)

مینی فیسٹو یا منشور کے مذکورہ سترہ نکات جالبی صاحب کی ناقدانہ بصیرت پر دلالت کرتے ہیں۔ احسن فاروقی نے اپنے مضمون میں مولانا محمد حسین آزاد کو نقل کیا ہے کہ نقاد کی دونوں آنکھیں روشن ہونی چاہئیں۔(٦) اس حوالے سے بنیادی بات یہ طے کردی کہ تنقید نگار کو یک رُخا نہیں ہونا چاہیے۔ مشرق اور مغرب دونوں ہی سرچشموں سے کسبِ فیض کا حامل صحیح معنوں میں تنقید نگار کہلانے کا مستحق ہے۔ جالبی صاحب کی دونوں آنکھیں روشن تھیں۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے بیسویں صدی کے ربع آخر میں سترہ نکات کی صورت وہ سوالات اٹھائے کہ جن سے تنقید نگار کی منصبی ذمہ داریاں پوری ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جب کسی معاشرے میں ادب غیر موٴثر ہوجائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ معاشرہ اپنے کلچر سے دور کہیں سانس لے رہا ہے۔ جالبی صاحب نے مذکورہ سترہ نکات میں ایک ایسی مثلث کو تشکیل کیا ہے کہ جس کے بغیر مثالی معاشرے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس مثلث میں ادب کو زاویہ قائمہ بناتے ہوئے وتر کو فکر سے نسبت دی جاتی ہے جبکہ قائمہ کا انحصار کلچر پر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ادب کسی نہ کسی کلچر کا نمائندہ اور فکر کا ترجمان ہوتا ہے اور یہ ترجمانی کسی نہ کسی مکان یا اسپیس کی حامل ہوتی ہے اور یہ سب زمان (Time) کے ذریعے جانا اور سمجھا جاتا ہے۔ یہاں جالبی صاحب ادب اور فکر کو عصر یا زمان سے جوڑ دیتے ہیں جبکہ اس سارے عمل کی بنیاد کلچر بنتی ہے۔ کلچر کے دھارے براہِ راست تہذیب سے جڑ جاتے ہیں۔ اسی لیے بآسانی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فن کے پیچھے تہذیبی اقدار کا ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ اگر کوئی اظہار ان اقدار سے عاری ہوجائے تو یقیناً یہ اظہار معاشرے پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ سینتیس برس قبل ترتیب دیئے گئے یہ نکات دراصل پاکستانی معاشرے کی بازیافت سے جڑے ہوئے ہیں۔ مجموعی اعتبار سے نئی تنقید تہذیبی تشخص کو ادب اور فکر میں تلاش کرنے کا نام ہے۔ اکیسویں صدی میں جالبی صاحب کی روشن آنکھیں اطراف واکناف میں تہذیبی تشخص کی جستجو میں تاحال مبتلا ہیں اور ہم ایک آنکھ سے دیکھنے والے انگریزی (۷) کے بغیر تنقید کو لاحاصل سمجھ رہے ہیں۔

☆☆☆

ماخذ ومصادر:

(۱)نقش،فیصل احمد،ڈاکٹر جمیل جالبی زندگی نامہ اورتصانیف ،مشمولہ،ماہنامہ قومی زبان،کراچی۔انجمن ترقی اردو پاکستان، اکتوبر۲۰۱۹ء،جلد۹۱۔شمارہ:۱۰،اشاعتِ خاص:جمیل جالبی۔ص۴۳

(۲)نسیم فاطمہ،ڈاکٹر،ڈاکٹر جمیل جالبی:سوانحی کتابیات (اضافے وترامیم،سعید احمد)(لاہور:الفیصل ناشران وتاجران کتب،طبع دوم۱۹۹۶ء)ص،۳۱

(۳)ایضاً

(۴)جمیل جالبی،ڈاکٹر،نئی تنقید(مرتبہ،خاور جمیل)(کراچی:رائل بک کمپنی،۱۹۸۵ء،طبع اوّل) ص۱۹ تا ۲۰

(۵)محولہ بالا ایضاً ص۲۰تا۲۴

(٦)محمد احسن فاروقی،داکٹر،جمیل جالبی کی تنقید نگاری،مشمولہ،ڈاکٹر جمیل جالبی:بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا،مؤلف،ڈاکٹر خاور جمیل،کراچی:الیٹ پبلشرز،۲۰۱٦ء،ص۴۳۷

(۷)اکرم نقاش۔انٹرویو بعنوان روبرو،مشمولہ سہ ماہی اثبات (ممبئی،شمارہ۔۱۵۔۱۴،اکتوبر۔دسمبر۲۰۱۲ء،جنوری تا مارچ ۲۰۱۳ء۔مدیر اشعر نجمی)ص۳٦۵

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید کے فکری زاویے

ڈاکٹر محمد امجد عابد
شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن،
لاہور، پاکستان

Abstract:

Dr. Jamil Jalbi is well reputed as a very important critic, researcher and translator. His criticism is fundamentally concerned with sociological and social matters. He puts a critic eye on social life of the modern era. He introduced impartiality and originality with a daring expression in Urdu Criticism. He stresses on contextual realities in his criticism. The purpose of this article is to highlight the impartialism, modern trends and different angles of the criticism of Dr. Jamil Jalbi.

ڈاکٹر جمیل جالبی (۱۹۲۹ء) اُردو تنقید کا ایک اہم نام ہے جس نے گزشتہ نصف صدی کے عرصے میں اُردو تنقید پر گہرے اثرات مرتسم کیے ہیں۔ ان کے تنقیدی نظریات میں گہرائی، وسعت اور

ایک فکری رچاؤ نظر آتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے تحقیق اور ترجمے کے باب میں بھی قابل قدر کام سرانجام دیا ہے۔لیکن ان کی اصل پہچان تنقید ہی ہے۔اپنی تنقید کو وہ تخلیق کا درجہ دیتے ہیں اور تنقید ان کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو ایک تخلیق کار کے لیے اس کی تخلیق رکھتی ہے۔اس حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ:

> ''تنقید میرے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو شاعر کے لیے شاعری، ناول نگار کے لیے ناول یا ڈرامہ نویس کے لیے ڈرامہ رکھتا ہے۔میں تخلیق اور تنقید کو الگ الگ خانوں میں نہیں رکھتا بلکہ دونوں کے ''امتزاج'' کو ضروری سمجھتا ہوں۔''۱

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید کا اہم موضوع کلچر اور اس کے مسائل ہیں۔ان کی پہلی تنقیدی کتاب ''پاکستانی کلچر۔قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ'' کے نام سے ۱۹۶۴ء میں منظر عام پر آئی۔فکری سطح پر ان کا زاویہ نگاہ ایک طرف تاریخ اور فلسفے کے ساتھ مربوط ہے تو دوسری طرف کلچر کے ساتھ۔ان کا خیال یہ ہے کہ ''ہمارے ادب کے موجودہ بحران کا سبب یہ ہے کہ ہم اپنے کلچر اور تہذیبی روح کو فراموش کر کے مغربی پیمانوں سے اپنے ادب بلکہ پوری زندگی کو ناپتے ہیں۔چنانچہ اس بحران سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہم اپنی تہذیبی روح کی بازیافت سے اپنی تخلیقی اور فکری قوتوں کے لیے راہ ہموار کریں۔اس دریافت نو سے ہی ایک نئے اور بڑے تخلیقی و تہذیبی دور کا آغاز ہوسکتا ہے۔''۲

''پاکستانی کلچر''(۱۹۶۴ء) کے بعد ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقیدی کتاب ''تنقید اور تجربہ'' (۱۹۶۷ء)منظر عام پر آئی۔اس کتاب کے فلیپ پر درج رشید احمد صدیقی کی رائے سے اس کے مضامین کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے:

> ''اُن (جمیل جالبی) کی تحریر میں نہ صرف عصری، تہذیبی اور ادبی رجحانات کی معتبر عکاسی بلکہ ان کی فکرانگیز تعبیر و توضیح بھی ملتی ہے......اپنے فکر و نظر، ادبی ذوق اور سلیس و شگفتہ انداز بیان کی بنا پر جدید اردو تنقید نگاروں میں جالبی صاحب ایک ممتاز و منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔''۳

اس کتاب میں شامل مضامین کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ یہ

مضامین اُن کے اس ماضی سے تعلق رکھتے ہیں جس نے ان کی تربیت وتشکیل کی ہے اور جوان کے اندر زندہ ہے۔

> ''یہ مضامین وقت کی پگ ڈنڈی پر پڑے ہوئے
> میرے قدموں کے وہ دُھندلے اور واضح نشان ہیں جن پر گزشتہ
> پندرہ سولہ سال چل کر میں یہاں تک پہنچا ہوں۔ یہ نشان میرے ذہنی
> سفر کو ظاہر کرتے ہیں۔''۴

ڈاکٹر جمیل جالبی کے یہ مضامین ان کی تنقید کا نقطہ آغاز ہیں۔ بقول سلیم احمد: ''یہ صرف ادبی اور تنقیدی مضامین نہیں ہیں بلکہ انھیں زندگی سے ربط دینے کی کوشش کی گئی ہے اور اس دَور میں جب ادب ادبیت زدہ ہو کر ایک سڑے ہوئے پانی کے تالاب کی طرح بُو دے رہا ہے اس میں زندگی کے آبِ تازہ کی ایک رَو داخل کرنے کی یہ کوشش ہر لحاظ سے مستحسن اور قابلِ تعریف ہے۔''۵ اس کتاب کے مقدمے میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے جدید تنقید کا لائحہ عمل تجویز کرتے ہوئے چار نکات پیش کیے ہیں۔ یہ نکات تنقید کے حوالے سے ہمہ گیر معنویت کے حامل ہیں۔

۱۔ کسی کلچر کا زوال اس کے فن کے انحطاط میں ظاہر ہوتا ہے۔ چناں چہ ادب کا موجودہ انحطاط اس بات کی علامت ہے کہ ہمارا نظام خیال سسک سسک کر دم توڑ رہا ہے۔ تخلیقی سرگرمیوں کے لیے ضروری ہے کہ زندہ نظام خیال کی قوت سے اسے دوبارہ قائم کیا جائے۔

۲۔ ادب خلا میں، تہذیبی تعطل میں، منجمد نظام خیال کے بوسیدہ دائرے میں تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ تہذیبی قوت کے شدید ضعف کے باعث آج ہمارا ادب معاشرے کے لیے ایک روحانی تجربہ نہیں رہا۔

۳۔ ہمارے تہذیبی تعطل اور بے معنویت کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا کلچر اور اس کے تہذیبی سانچے مغرب کے کلچر کے ہاتھوں اپنی مکمل فنا پر راضی نہیں ہو رہے جس کی وجہ سے ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن'' والی صورت حال درپیش ہے اور سارا سماج انتشار، تضاد، کش مکش، تصادم اور عدم توازن کا شکار ہے۔

۴۔ اس وقت تاریخ کی نئی تعبیر اور نئے تاریخی شعور کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ

ہم ایک دائرے کی تشکیل کر سکتے ہیں جس کا سنگم مغرب اور اپنے کلچر کے گہرے اور وسیع ادراک پر قائم ہو۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید میں ادبی روایت کی پاس داری اور تخلیق کے ذریعے ذات، فرد اور معاشرے میں در آنے والے اثرات کا گہرا عرفانی مطالعہ اور مشاہدہ جھلکتا ہے۔ ان کے نزدیک ادب، انسانی، معاشرتی، تہذیبی اور مادی زندگی کا اہم اور منفرد اظہار ہے اور اسکا تعلق پوری زندگی کے تجربوں اور خود زندگی کی روح کے اظہار سے ہے۔ ان کے نزدیک ادب کے مرنے یا ختم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ادب کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیب اور اس کی روح بھی مر رہی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ہر تخلیقی سرگرمی کے پھول جس میں ادب بھی ایک اہم ترین ذریعہ اظہار ہے، اسکی تہذیب کے درخت میں ہی کھلتے ہیں اور اس کے رنگ و بو، اس کی شکل صورت، اس کی وضع اور ڈھنگ، اس تہذیب کی روح اور اس کا طرز احساس مل کر متعین کرتے ہیں۔ اب اگر تہذیب مر رہی ہے تو تہذیب کے سارے سانچے، ساری تخلیقی سرگرمیاں، موسیقی، سائنس، تعمیر، مصوری، کھیل کود، ادب، فلسفہ، ریاضی سب منجمد ہو کر بے جان ہونے لگیں گے۔''٦

عصری آگہی کے بغیر بڑا ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ اپنا زمانہ اور اس کی روح، ماضی کا ورثہ، یعنی روایت اور آنے والے زمانے کی روح کے شعور سے ہی تخلیق کی روح بیدار ہوتی ہے۔ عصری آگہی سے مراد وہ طرزِ احساس ہے جو معاشرتی اور سماجی تغیرات کے نتیجے میں تخلیق کار کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے اور بالواسطہ طور پر نقاد کے زیر بحث آتا ہے۔ عہدِ حاضر کے اپنے شدید اور فوری تقاضے ہوتے ہیں جن کو سمجھے بغیر یا ان سے لاتعلق رہ کر ادیب ادب کی پرورش نہیں کر سکتا۔ جمیل جالبی کے ہاں بھی عصری آگہی کی جھلکیاں اُن کی تنقیدات کے آئینے میں اتنی نمایاں ہیں کہ ہم ان کی بے لاگ اور غیر جانبدارانہ تنقید کی کاٹ دار دھار کی شدّت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بلاشبہ ان کی تنقید ادب اور اس کی موجود صورت حال اور اس کے تناظر میں ادبی روایت کے تسلسل اور مستقبل میں اس کے اثرات تک جاتی ہے اور ہمیں یہ باور کراتی ہے کہ اگر ادب اور اس کی تخلیقات اور تنقیدات میں عصری آگہی کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر نہ رکھا جائے گا تو ادب اور تخلیقات کا مستقبل مخدوش ہے۔ اپنے مضمون ''نیا ادب اور تہذیبی اکائی''

میں وہ اس حوالے سے بڑی دلسوزی سے رقم کرتے ہیں:

''جب میں عہد حاضر کے اردو ادب اور ادیبوں کا خیال کرتا ہوں تو معاً مجھے اس بڑے سے غبارے کا دھیان آتا ہے جس کی ہوا نکل گئی ہو اور وہ میلی کچیلی دھجی کی مانند کسی بچے کے ہاتھ میں لٹک رہا ہو۔ اب اس غبارے کا استعمال یہ ہے کہ بچے اپنے منہ سے چھوٹے چھوٹے غبارے بنائیں اور ہاتھ پہ رکھ کر پٹاخے سے پھوڑیں تا کہ گھر والے چونک جائیں اور بچے مزا لیں۔ گزشتہ چار پانچ سال سے اردو ادب کے ادیب یہی کھیل کھیل رہے ہیں۔ اردو ادب کو دیکھیے تو فقرے بازی کی ہوا سے ننھے ننھے غبارے بنا کر پٹاخ پٹاخ کی آوازوں سے سنسنی پھیلائی جا رہی ہے اور اس عمل کو نئے ادب کا نام دیا جا رہا ہے۔ ادب سے سنجیدگی غائب ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے اردو ادیبوں کے سامنے فکر و عمل کا کوئی سنجیدہ مسئلہ باقی نہیں رہا۔''

ے

عصرِ حاضر کی معروضی صورت حال کے تناظر میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی یہ تنقید ان کے بھرپور عصری شعور کی آئینہ دار دکھائی دیتی ہے۔ تخلیقات کے ادبی مقام کے تعین اور ان کے مستقبل کے بارے میں ان کی بے لاگ تنقید نے ادب اور اس کے مسائل کے بارے میں ان کے نقطہ نظر کا جس انداز میں اظہار کیا ہے آج بھی ہم اس کے آئینے میں اس عصری شعور کی کارفرمائی کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔

ادب زندگی کا اظہار ہے۔ ادب معاشرے کی ظاہر و باطن کا آئینہ ہے جو کچھ معاشرے میں ہو رہا ہے، جو کچھ معاشرے پر گذر رہی ہے ادیب کی تحریر اس کا احاطہ کرتی ہے۔ جہاں معاشرہ آنکھ اور کان بند کیے برسوں بعد شعر کی منزل پہ پہنچتا ہے وہاں اس معاشرے کا ادب بہت پہلے اس احساس کا اظہار کرنے لگتا ہے اس لیے وہ معاشرہ جو اپنے مفکر ادیبوں کی تحریریں پڑھتا رہتا ہے زندہ اور بیدار رہتا ہے ۔ڈاکٹر جمیل جالبی اسی باعث ادب کو وہ واحد وسیلہ گردانتے ہیں جس کے ذریعے کوئی بھی معاشرہ حقیقی روح کی دریافت اور بازیافت کرتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقیدی کتاب ''نئی تنقید'' ۱۹۸۵ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں نئی تنقید کے حوالے سے ان کا موقف یہ ہے کہ تنقید کا ایک کام تو یہ ہے کہ وہ فکر کی تشکیل نو کرے اور اُسے پوری زندگی پر پھیلا دیا جائے تا کہ تجزیے، مطالعے اور غور وفکر کے بعد فکر واحساس کی جڑیں صحیح قسم کی زندگی میں تلاش کی جاسکیں۔ صحیح قسم کی زندگی سے مراد وہ نظام اقدار و معیار ہے جس کے حوالے سے معاشرے کی اجتماعی زندگی میں ایسی روح پھونکی جا سکے کہ تخلیقی جو ہر زندگی کے ہر شعبے میں نشو ونما پانے لگے۔ تخلیقی جو ہر ہر معاشرے کی حقیقی زندگی کے لیے وہی کام کرتا ہے جو جسم میں روح کرتی ہے۔۸ اس تناظر میں ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے عہد کی تخلیقات اور تنقید سے سخت مایوس ہیں۔ تخلیقات کے بارے میں تو ان کا کہنا ہے کہ آج ادبی تخلیق کے نام پر کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگ گیا ہے۔ ہر شاعر، افسانہ و ناول نگار کے سر پر عظمت کا بھوت سوار ہے اور وہ بزعم خود خود کو عظیم اور عظیم تر تصور کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تنقید اپنے منصب کو فراموش کر چکی ہے۔ تنقید کے لیے تخلیقی جوہر کا وجود اتنا ہی ضروری ہے جتنا تخلیقی عمل کے لیے تنقیدی شعور ضروری ہے۔ عصرِ حاضر میں تنقید کے منصب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''۱۔ وہ (تنقید) ان بیماریوں کو سامنے لائے جو غلط اقدار کو اختیار کرنے سے ہماری اجتماعی زندگی میں پیدا ہوگئی ہیں۔
> ۲۔ دوسرے ان بیماریوں کی الگ الگ تشخیص کر کے ان کا علاج دریافت کرنا بھی تنقید کا کام ہے۔
> ۳۔ تیسرے اپنی تاریخ، اپنی روایت کے حوالے سے ان بنیادوں کو تلاش کرنا بھی تنقید کا کام ہے جن پر نئے نظامِ خیال کی عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے۔''۹

ڈاکٹر صاحب کے خیال میں ہمارا تخلیق کار اس گہرے تنقیدی شعور سے عاری ہو چکا ہے۔ اس طرح ہمارا نقاد بھی ادبی روایت اور ادبی فکر کو سوائے دہرانے اور چبائے ہوئے لقموں کو چبانے کے علاوہ کچھ نہیں کر رہا۔ ان کے خیال میں ادب کی بحرانی کیفیت اور تخلیق کی بے جہتی اور بے سمتی کی وجہ یہی ہے کہ ہماری تنقید اپنے دور کے ادب کو جہت اور بنیاد فراہم کرنے میں نا کام رہی ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہم بغیر سمت اور بغیر مقصد کے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمارا ادب، ہماری فکر، ہمارا فن،

ہماری سیاست، ہماری معاشرتی وتہذیبی زندگی سب بے جہت اور بے مقصد ہو گیے ہیں۔ان کے خیال میں صحت مند معاشرے صرف حصولِ زر سے نیک نام نہیں ہوتے بلکہ ان اقدار ومعیار سے نیک نام ہوتے ہیں جنھیں حاصل کرنے کی جد و جہد میں وہ مصروف ہوتے ہیں اور جن کا اظہار ان کا ادب وفن کرتا ہے۔اس عمل سے زندگی میں ہر دَم نئے معنی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ادب زندگی کی روح کا اظہار ہے۔ زندگی ہی ادب کا خام مواد ہے۔ اس لیے غلط رجحانات کی نفی کرنا اور ان کے بجائے مثبت رجحانات اور رویّوں کو آگے بڑھانا بھی آج کی تنقید کا کام ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اسے نئی تنقید کا نام دیتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے نئی تنقید کے حدود اور فکر ومعنی کی سطح پر اس کے نئے دائرہ کار کا تعین کرنے کے بعد ایک الگ مضمون میں تنقید کا منصب بیان کیا ہے۔نئی تنقید کے منصب کی تلاش میں وہ مختلف علوم و نظریات کے زیر اثر تنقید کی مختلف صورتوں کا مطالعہ کرتے اور یہ دیکھتے ہیں کہ اِن سے ادب کے مطالعے میں کیا مدد ملی ہے؟ مثلاً تنقید کی مختلف صورتوں، یعنی محض سماجی حوالے سے یا محض نفسیاتی حوالے سے یا محض جمالیاتی، تاثراتی یا سوانحی حوالے سے کسی ادب پارے کا مطالعہ محدود اور یک رُخا ہوتا ہے۔ اِسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ ایک ادب پارے کو ہر رُخ سے دیکھا جائے۔ اُن کے خیال میں ایسے نقاد ادب کے مطالعے کو غلط راستے پر ڈال دیتے ہیں جو یک رخی تنقید کو اپنی انفرادیت اور پہچان بنا لیتے ہیں۔ ایسا کر کے وہ کسی ایک پہلو میں تخصیص تو حاصل کر لیتے ہیں اور سماجی یا نفسیاتی نقاد کے طور پر مشہور تو ہو جاتے ہیں لیکن اس سے مطالعہ ادب کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے۔ یہاں ڈاکٹر جمیل جالبی اس نکتے کو بیان کرتے ہیں جو نئی تنقید کے منصب کی وضاحت کر دیتا ہے۔ان کے خیال میں:

> ''اس وقت تنقید کو ایک ایسے ''فطری امتزاج'' کی ضرورت ہے جو تنقید میں بیک وقت نئی سطحوں کو جذب کر کے اسے ایک وسیع تر متوازن صورت عطا کر دے۔''یہی امتزاج'' نئی تنقید کا منصب ہے۔'' ۱۰

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ امتزاج ،فکر وفلسفہ، ادبی تاریخ اور کلچر کی سطح پر ممکن ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک فکر وفلسفہ کا ادب اور ادبی تنقید سے وہی تعلق ہے جو روح کا جسم سے ہوتا ہے۔ چناں چہ کوئی ادیب فکری اساس، تاریخی شعور اور زندگی سے براہِ راست وابستہ ہوئے بغیر تخلیقی توانائی کا اظہار نہیں

کر سکتا۔ اس لیے نئی تنقید کو عہدِ حاضر کے تعلق سے اس فکری اساس کو تلاش کرنا ہے۔ اس طرح ادبی تاریخ قدیم اور جدید ادب کو نہ صرف یکساں اہمیت دیتی ہے بلکہ اپنے دَور کے حوالے سے انھیں نئے معنی بھی دیتی ہے۔ اور یہ سارا کام وہ اس طرح انجام دیتی ہے جس سے ادب کی ایک واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ نئی تنقید کا حقیقی امتزاج اسی طرح پر ہوسکتا ہے۔ یہاں ہر رُخ، ہر پہلو، ہر زاویہ اور علم، فکر کلچر، لسانیات، تحقیق، سماجی و جمالیاتی زاویے سب مل کر ایک وحدت کی صورت اختیار کر جاتے ہیں اور ادب کی حقیقی روح سامنے آجاتی ہے۔ ''امتزاج'' کی تیسری سطح کلچر کی سطح ہے۔ اگر تنقید کلچر کی سطح پر امتزاج کے عمل سے گزرے تو اس کے اندر بھی وسعت اور کلچر کی طرح تہ داری پیدا ہوسکے گی اور یوں تنقید اس یک رُخے پن سے محفوظ رہ سکے گی جس کا وہ اب تک شکار رہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیال میں کلچر ہی ایک ایسی سطح ہے جس پر تنقید میں بیک وقت سماجی، نفسیاتی، جمالیاتی، روایتی، فکری اور تخلیقی اقدار کا امتزاج ہوتا ہے۔ کلچر پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے اور بڑا ادب بھی ساری زندگی کی روح کا اظہار کرتا ہے۔ اس لیے اسی سطح پر تنقید سنجیدہ، تہ دار اور دانش ورانہ سرگرمی بن کر معاشرے کی تخلیقی قوتوں کی نشو و نما اور راہ نمائی کرنے لگتی ہے۔ یہی تنقید کی تخلیقی سطح ہے اور یہی نئی تنقید کا منصب ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جدیدیت کے اہم موضوع کو بھی اپنے دائرۂ تنقید میں شامل کیا ہے۔ جدیدیت پر بہت سے نقادوں نے لکھا ہے اور اس پر طویل بحثیں کی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا موقف یہ ہے کہ جدیدیت ایک اضافی چیز ہے اور اس کا تعلق کسی لمحہ کسی خاص زمانے یا دَور سے ہوتا ہے۔ آج کی جدیدیت کل پرانی ہو جائے گی جو آج جدید ہے وہ کل قدیم ہو جائے گا۔ ان ہی معنی میں ہر جدید میں قدیم شریک رہتا ہے۔ جدیدیت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہر نسل کے ایسے معیاروں اور پیمانوں کو، جن سے وہ اپنے دور اور ماضی کو دیکھتی اور ناپتی ہے، ہم جدیدیت کا نام دے سکتے ہیں۔ ان معیاروں میں نظام خیال بھی، جس پر معاشرے کا ڈھانچہ اور روح قائم ہے شامل ہے۔ اور اس نسل کے رویے، اندازِ فکر اور طرزِ احساس بھی۔''[11]

ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیال میں سائنسی اندازِ فکر کو اپنے شعور اور طرزِ احساس کا

حصہ بنا کر ہم جدیدیت کی تلاش کر سکتے ہیں۔ ان کے خیال میں جدیدیت صنعتی معاشرے کے ہر دم بدلنے والے مزاج کا منطقی نتیجہ ہے۔ یہ اضافی چیز تو ہے لیکن کوئی ہوائی عمل نہیں ہے بلکہ یہ ایک مخصوص نظام کی قبولیت سے وجود میں آیا ہے۔ یہ مخصوص نظام مغرب سے درآمدہ ہے جسے قبول کیے بغیر ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ ادب میں بھی جب کوئی جدیدیت کی آواز اٹھاتا ہے تو مغرب ہی سے رجوع کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب، اس بات پر آزردہ نظر آتے ہیں کہ ہماری جدیدیت ہمارے کلچر کے زوال کی علامت ہے اور کسی کلچر کا زوال قدرتی طور پر اس کے فن کے انحطاط میں ظاہر ہوتا ہے۔ ادب کا موجودہ انحطاط اور سماج کا تہذیبی تعطل وانتشار اس بات کی علامت ہے کہ ہمارا نظام خیال جاں کنی کی حالت میں سسک سسک کر دَم توڑ رہا ہے۔ پرانے تہذیبی سانچے اور طرزِ احساس اپنے معنی کھو رہے ہیں۔ معاشرے کی خواہشات اور تہذیبی اقدار، ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ سارے تہذیبی رشتے بکھر رہے ہیں۔ چناں چہ تخلیقی سرگرمیوں کے لیے ضروری ہے کہ زندہ نظام خیال کی قوت سے اسے دوبارہ قائم کیا جائے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقیدی کتاب ''معاصرِ ادب'' (۱۹۹۱ء) کے نام سے منظر عام پر آئی جوان کے ادبی، تنقیدی اور فکری مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں انھوں نے ادب کی صورتحال، صحیح ادبی رویہ، شاعری اور مسائل حیات، ادب اور جمہوریت اور مختلف شعرا کی شاعری اور نثر نگاروں کی نثر کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ادب کی موجودہ صورتحال کا بڑے تفکّر سے جائزہ لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آج ہم ذہنی وفکری سطح پر بے سمت اور بے جہت ہیں۔ اور ادب مہمل بے مقصدیت کا شکار ہے۔ وہ فرد اور معاشرے میں شعور پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ ایسا شعور جس سے فکری زندگی کا بیج پھوٹتا ہے۔ ادب اور ادیب کی صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حیرت کی بات یہ ہے کہ معاشرے میں انسانی و معاشرتی اقدار، صداقتوں کی تلاش اور زندگی کی معنویت دریافت کرنے کی کوشش بھی نظر نہیں آتی۔ ہمارا ادب اجتماعی رشتوں سے کٹ گیا ہے اور ادیب تخلیق کے کرب میں مبتلا رہنے کے بجائے آسائش کے لطف کی تلاش میں دن رات سرگرداں ہے۔ یہی مقصدِ اولیٰ ہے اور ادب اسی کے حصول کا ذریعہ ہے۔'' ۱۲

ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ ادب اپنا فرضِ منصبی ادا نہیں کر رہا۔ کیونکہ ادب تو زندگی کے دھارے پر بہتے ہوئے سچائیوں کے اظہار سے پیدا ہوتا ہے۔یعنی ادب زندگی اور اس کی سچائی کا اظہار کرتا ہے۔مگر ہمارے ادب میں یہ رویہ مفقود ہے۔ ہمارا ادیب تعلقات عامہ کے راستے پر چل پڑا ہے۔اس کا مطمع نظر فکر و خیال نہیں بلکہ زندگی کی آسائشیں اور معاشرتی رتبہ حاصل کرنا ہے۔ایسی صورت حال میں ایسا ہی ادب تخلیق ہوگا جیسا کہ ہو رہا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی ادب کو آزادی اظہار کا وسیلہ خیال کرتے ہیں اور ادب جبر و استحصال، جاگیردارانہ ذہنیت اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھا سکتا ہے۔اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس میں یقیناً کوئی نہ کوئی خامی ہے۔ بقول ان کے ''جمہوریت اور ادب ساتھ ساتھ چلتے اور ایک دوسرے کو مستحکم کرتے ہیں۔ ادب بغیر جمہوریت کے مرجھایا ہوا پھول ہے اور جمہوریت بغیر ادب کے ایک بنجر ریگ زار ہے۔'' ۱۳ یہاں جمہوریت سے ڈاکٹر صاحب کی مراد کوئی حکومت نہیں ہے بلکہ ان کی مراد ایک طرز حیات اور ایک اندازِ فکر ہے،جس میں ذات کو فنا کر کے اجتماعی روح کو اہمیت دی جاتی ہے۔جس میں تعصّبات سے بالاتر ہو کر لوگوں کی باتوں کو تحمّل اور بردباری کے ساتھ سنا جاتا ہے۔اپنی طبقاتی یا علاقائی فکر کو دوسروں پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارا معاشرہ بنیادی طور پر جاگیردارانہ معاشرہ ہے اور آج تک اسی ذہنیت کا مالک ہے۔ایسے حالات میں ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرتی انسان جن جن چیرہ دستیوں اور جبر و استحصال کا شکار ہوا ہے ان دردناک کہانیوں کو ادب کا موضوع بنا کر ایک نئے شعور کو جنم دیا جائے جس سے نہ صرف جمہوریت پروان چڑھے بلکہ مزید مستحکم بھی ہو جائے۔ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> ''جمہوریت عوام کو ابھارتی، اٹھاتی اور ان کی پرورش کرتی ہے۔اور ادب عوام کے مسائل، ان کے جذبات واحساسات کا اظہار کرتا ہے اور یہی اظہار معاشرے میں اس شعور کو پیدا کرتا ہے جس سے خود جمہوریت جڑ پکڑتی اور ارتقاء کی منزل سے گزرتی ہے۔ ادب کا کام اپنے معاشرے کی جڑوں کو سیراب کرنا ہے...... اسی احساس سے وہ شعور پیدا ہوتا ہے جو ادب کا کام اور مقصد ہے اور جو جمہوریت کے لیے تازہ ہوا کا درجہ رکھتا ہے۔'' ۱۴

اس اقتباس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے جو ذہن انسان کو تبدیل کرے اور اسے عمل کی طرف رجوع کرے تا کہ ادب عوام اور جمہوریت کی روح کا ترجمان بن جائے۔ ادب اور ادیب کو عہدِ حاضر کے تعلق سے جمہوریت کو پروان چڑھانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقید جدید عہد میں ایک نئے تہذیبی ،فکری اور معاشرتی تناظر میں ادب کے نئے مفاہیم کی جانب اشارے دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب روایت کے خلاف نہیں بلکہ وہ جدید قدروں کے ظہور کے ساتھ ساتھ روایت کے رواجوں کو بھی ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ان کی تنقید کا اہم پہلو یہ ہے کہ انھوں نے ادب کے سماجی تناظر کو ہمیشہ نگاہ میں رکھا ہے۔ اور زمانے اور وقت کے ساتھ رونما ہونے والی تبدیلیوں کا احساس کر کے ادب کے دھارے کا رُخ بدلنے کی طرف توجہ بھی دلاتی ہے۔ ان کے یہاں عصری آگہی اور عصری شعور، دیگر ادیبوں اور نقادوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ انھوں نے زیادہ تر تنقید لکھی ہے یا تحقیق کی کوچہ گردی کی ہے۔ شاعری سے محض سننے اور پڑھنے تک تعلق رکھا ہے۔ وہ سنجیدہ نقادوں کے حلقے میں عزت اور احترام سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کے یہاں نظری تنقید نے پایہ اعتبار حاصل کیا اور ڈاکٹر جمیل جالبی کو ایسے نقادوں کی قطار میں لا کھڑا کیا جن کی کہی ہوئی ہر بات کا وزن ہوتا ہے اور وہ اہل فن کے نزدیک ثقہ ٹھہرتی ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، نئی تنقید، مرتبہ: خاور جمیل، کراچی، رائل بک کمپنی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۰

۲۔ ضیاء الحسن، ڈاکٹر، اُردو تنقید کا عمرانی دبستان، لاہور، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۲۰۰۶ء، ص ۴۰۲، ۴۰۱

۳۔ رشید احمد صدیقی، تنقید اور تجربہ، باراول، از ڈاکٹر جمیل جالبی، لاہور، یونیورسل بکس، ۱۹۶۷ء، فلیپ

۴۔ جمل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تجربہ، باردوم، لاہور، یونیورسل بکس، ۱۹۸۸ء، ص ۹

۵۔ سلیم احمد، فلیپ، تنقید اور تجربہ، از ڈاکٹر جمیل جالبی، لاہور، یونیورسل بکس، ۱۹۶۷ء، فلیپ

۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تجربہ، باردوم، ص ۱۸

۷۔ ایضاً، ص ۳۵

۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، نئی تنقید، ص ۲۸۴، ۲۸۳

۹۔ایضاً،ص۲۰،۱۹

۱۰۔ایضاً،ص۴۷

۱۱۔ایضاً،ص۸۰،۷۹

۱۲۔جمیل جالبی، ڈاکٹر، معاصر ادب، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص۱۶

۱۳۔ایضاً،ص۳۳

۱۴۔ایضاً،ص۳۵،۳۴

☆☆☆

اردو تاریخ نگاری اور جمیل جالبی

رمیشہ قمر

RS,Dept of Urdu and Persian

Gulbarga University

Gulbarga pin code :585106

karnataka

تاریخ نگاری ایک فن ہے جو تاریخی واقعات ،شخصیات اور تبدیلیوں کی معروضیت کو پیش کرتا ہے ۔تاریخ نگاری کو انیسویں صدی کے ابتداء میں فروغ حاصل ہوا ۔تاریخ کے مطالعے سے ہم عظیم شخصیات کے کارنامے' زندگی کے حالات' سماج میں ہونے والی تبدیلیوں وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کرتے ہیں ۔ایسے ہی ادب کی تاریخ بھی ہوتی ہے ۔ادبی تاریخ سے پہلے تاریخ کے ماخذ کے بارے میں جاننا ضروری ہے ۔انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں' تاریخ' کی تعریف ان الفاظ میں درج ہے۔

"study that traditionally has aimed at providing on aoverall explanation of the process of histroy ."(the incyclopedia britanica in vol .30

villiam denton publishers 1943.1973

page no:64)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گذرے ہوئے واقعات کو صحت اور محنت کے ساتھ بیان کرنا تاریخ کہلاتا ہے ۔تاریخ کے معنی و مفہوم کے متعلق پروفیسر نذیر احمد تشنہ لکھتے ہیں ۔

''یونانی زبان میں اس کے لئے لفظ
ہسٹوریا (Historia) کا استعمال کیا جاتا ہے جس

کے معنی ہیں سچائی کو بروئے کار لانے کا منصوبہ اور
انگریزی زبان کا لفظ (History) اس یونانی لفظ
(Historia) سے ماخوذ ہے جس سے مراد واقعے
کی ابتدائی تفتیش اور تحقیق کی بنیاد پر حاصل ہونے
والا علم ہے۔

(فلسفہ تاریخ: ایم نذیر احمد تشنہ ص ۱۷)

تاریخ کی تعریف مختلف ماہرین نے مختلف زبانوں میں مختلف الفاظ میں کی ہے جس کا اصل معنی یہی نکلتا ہے کہ جو واقعات ماضی کا حصہ بن جائیں اس تک پہنچنے کے لئے تحقیق اور تدقیق کا بیان تاریخ ہے۔صرف گزرے ہوئے واقعات کو بیان کرنا تاریخ نہیں کہلاتا ہے بلکہ ہر فن کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جنھیں ملحوظ خاطر رکھ کر تاریخ رقم کی جاتی ہے نامور مورخ ڈاکٹر مبارک علی تاریخ نویسی کی بابت لکھتے ہیں:

''تاریخ نویسی میں تین عناصر کی اہمیت
ہے اول واقعات' دوم ان واقعات کے بارے میں
مورخ کی تنقید' تفسیر یا تاویل کیونکہ محض واقعات کو
سن وار بیان کرنے سے تاریخ کی اہمیت واضح نہیں
ہوتی اور نہ ہی اس سے تاریخی شعور پیدا ہوتا ہے۔''

(اردو میں تاریخ نویسی: ڈاکٹر مبارک علی سہ ماہی تاریخ شمارہ ۱۲۳ تاریخ نویسی نمبر ص ۱۰۸)

ادبی تاریخ نویسی بھی تاریخ نگاری کا اہم جز ہے ادبی تاریخ نگاری میں زبان' تہذیب' سماجیات' معاشرتی تقاضے' انسانی فطرت' عہد بہ عہد ہوتی تبدیلیاں شامل ہوتی ہیں. ادب کو زندگی کا ترجمان کہا گیا ہے اور زندگی میں کوئی شئے ساکت و جامد نہیں ہے بلکہ اس میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اور ادب میں ہونے والی ان تبدیلیوں کا بیان کرنا اس کی تاریخ لکھنا از حد دشوار ہے۔جب تک علم اور شعور کی فراوانی نہ ہو تاریخ کے اس رخ کو واضح کرنا آسان نہیں ہوتا۔ادبی تاریخ ،ادب ،تنقید ،زبان و ادب کی ارتقائی صورت کا متوازن و متناسب اظہار ہے جس میں واقعات ،رجحانات ،تحریکات ،نظریات اور

اصولوں کوبھی شامل کیا جاتا ہے۔مختلف حالات کا بھی جائزہ جومشہور اور بڑی شخصیتوں کوجنم دیتے ہیں ان کا تذکرہ بھی شامل ہوتا ہے گیان چندجین کا یہ اقتباس میری اس بات کوثابت کرنے میں رہنمائی کرتا ہے لکھتے ہیں۔

''ادبی تاریخ ایک طرف تاریخ ہے
دوسری طرف ادب۔ یہ سوانح نگاری اور تنقید کے
امتزاج سے بنی ہے لیکن اسے تحریک ملی سیاسی تاریخ
سے۔جس کی مماثلت پر اس نے سوانحات کوترتیب
دیا۔بعد میں ادبی اصناف کی شعریات کا بھی اضافہ
کیا۔ادبی تاریخ اور سیاسی تاریخ میں ایک بڑا فرق
ہے سیاسی تاریخ کے واقعات ماضی کے پردہ عدم میں
مکتوم ہیں جبکہ ادبی تاریخ کی ماضی کی تخلیقات
ہمارے سامنے موجود ہیں۔''

(اردو کی ادبی تاریخیں:ڈاکٹر گیان چندجین ص ۲۲۔۲۱)

ادب ہمارے عہد کا ترجمان' معاشرتی زندگی اور سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔سماج میں ہونے والے واقعات' حالات' جذبات اوراحساسات کو بیان کرتا ہے۔اورادبی تاریخ حالات وکیفیات پر گہری نظر کے ساتھ ساتھ معاشرے کے تہذیبی وتمدنی عناصر پر بھی توجہ دیتا ہے اور ان کا حل تلاشنے میں بھی رہنمائی کرتا ہے ڈاکٹر علی جاوید کے بصیرت افروز خیالات ادبی تاریخ نگاری کو سمجھنے میں ہمارے لئے معاون ثابت ہوتے ہیں۔

''ادبی تاریخ کو نہ محض ادب پاروں کی
جمالیاتی کیفیات یا تنقید قرار دیا جاسکتا ہے نہ محض
بدلتے ہوئے مذاق سخن کی دستاویز بلکہ وہ زبان اور
ادب کے نشوونما کی داستان بھی بیان کرتی ہے اوران
کے پیچھے بدلتے ہوئے ادبی ذوق کی کہانی کہتی ہے

ادبی تاریخ ادب اور سماج دونوں کو مکمل اکائی کی شکل
میں دیکھتی ہے اور ادب کو سماج کی تخلیق اور ادب کے
سماج پر اثرات دونوں کے رابطے سے بحث کرتی
ہے۔''

(ادبی تاریخ نویسی اور تواریخ ادب اردو: سعد مسعود غنی ص ۷۔۶)

ادبی تاریخ نویسی میں تہذیب اور کلچر کو بھی تلاشا جاتا ہے۔تہذیب اور ادب کا رشتہ بڑا ہی گہرا ہے مشترک تہذیب کی جڑ دراصل ایک مشترک زبان ہوتی ہے اردو جو مشترک ہندوستانی تہذیب کے تاریخی تقاضوں سے وجود میں آئی اور ادبی تاریخ ان زبانوں، تہذیب، کلچر اور ثقافت جیسے پہلوؤں کو اپنے اندر سمو لیتی ہے آسیہ نورین کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''اردو ادب کا سرمایہ بے شمار وسعت کا
حامل ہے نظم ونثر کی متنوع اصناف و جہات ہیں جب
ان اصناف و جہات کا احاطہ کرنے کی ضرورت محسوس
ہوئی ادب کے بکھراؤ کو ایک جگہ سمیٹ دینے پر سوچا
گیا تو ادبی تواریخ لکھی گئیں۔ادبی تاریخ اپنے اندر
تہذیب' ثقافت' ورثہ اور ادبی پہچان رکھتی ہے بہت
سے مورخین نے ادب کے دریا کو کوزے میں سمویا
ہے اور ادبی تواریخ قلمبند کی ہیں۔''

(زبان وادب رسالہ شمارہ۲ ص۱۵۲)

ادبی تاریخ نویسی کا آغاز آب حیات سے ہوا۔اور یہ کارواں بہت سے ادوار سے گزرتا ہوا اپنا ارتقائی سفر طئے کرتا رہا۔اور ادبی تاریخ نویسی پر کئی کتابیں سامنے آئیں جیسے شعر الہند' تاریخ ادب اردو' داستان تاریخ اردو، تاریخ زبان اردو، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، اردو زبان کی قدیم تاریخ، مختصر اردو ادب وغیرہ۔اور ان کتابوں کے مصنفوں نے بحیثیت مورخ اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔جن میں حافظ محمود شیرانی، محی الدین قادری زور، نصیر الدین ہاشمی، عبدالسلام ندوی، حامد حسن قادری، رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر

مسعود حسین خان، مولوی عبدالحق، سیدہ جعفر، گیان چند جین اور جمیل جالبی وغیرہ۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ایک بلند پایہ نقاد، نامور محقق، ماہر دکنیات صاحب طرز ادیب ،لغت نگار اور مترجم ہیں۔تا حیات ادبی کاموں اور اردو کی خدمت میں مستغرق رہے۔کہتے ہیں حوصلے آگ کو گلزار بنا دیتے ہیں اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے حوصلوں نے بھی اردو زبان و ادب اور خاص کر ادبی تاریخ نویسی کی سنگلاخ زمینوں پر اپنی شناخت بنائی اور تنقید تحقیق' تاریخ و تفسیر میں نمایاں مقام پیدا کرلیا۔محشر بدایوانی کا یہ شعر جمیل جالبی کی ادبی خدمات کو خراج تحسین عطا کرتا ہے۔

ان کی خدمات ہیں شاہکار ادب
ان کے دم سے ہے قائم وقار ادب
دائمی نقش تاریخ ہے یہ سخن
جالبی آج ہیں افتخار ادب

میرا یہ مختصر سا مضمون جمیل جالبی جیسے دیو قامت ادیب کے مقام و مرتبہ کو متعین نہیں کرسکتا ۔بس ایک ادنیٰ سی کاوش ہے جو قلم کو جنبش دے رہی ہوں کہ صفحۂ قرطاس پر آپکی نگارشات، نادر تخلیقات اور قابل تعریف خدمات کو الفاظ کے نگینوں سے سجا سکوں۔

جمیل جالبی کا اصل نام محمد جمیل خاں ہے وہ اپنے نام کے ساتھ جالبی لکھنے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں۔

''محمد جمیل خان نے جب ادبی دنیا میں
قدم رکھا تو انکا آئیڈیل سید جالب دہلوی تھے اس
نے جالب کی رعایت سے انھوں نے اپنے نام کے
ساتھ جالبی لگالیا اور ادب میں ستارہ 'جمیل خان' کے
نام سے نہیں بلکہ ''جمیل جالبی'' کے نام سے چمکا۔''

(ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالبہ: گوہر نوشاہی ص ١٩)

آپ کو بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا اور یہ شوق انھیں ورثے میں ملا تھا آپکی اولین تخلیق 'سکندر اور ڈاکو' ڈرامہ ہے جو انھوں نے ١١ سال کی عمر میں لکھا تھا۔

آپ کی کئی کتابیں اردو کے خزانے میں گراں قدر اضافہ ہیں جیسے ارسطو سے ایلیٹ تک (۱۹۷۷)، دیوان حسن شوقی (۱۹۷۱ مرتب) دیوان نصرت (مرتب ۱۹۷۲) ایلیٹ کے مضامین (۱۹۷۵) بارہ کہانیاں (۲۰۱۳) بزم خوش نفساں (۱۹۸۵) فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ (۱۹۹۱) حیرت ناک کہانیاں (بچوں کا ادب ۲۰۱۳) ہند و پاک میں اسلامی جدیدیت (مترجم) کلیات میراجی (۱۹۸۸) مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (۱۹۷۹) میراں جی ایک مطالعہ (۱۹۹۷) معاصر ادب (تنقیدی مضامین ۱۹۶۶) محمد تقی میر (۱۹۸۱) نئی تنقید (۱۹۸۸) ن۔م۔راشد ایک مطالعہ (۱۹۸۶) پاکستانی کلچر (۱۹۶۴) قدیم اردو لغت (۱۹۷۳) قلندر بخش جرات (۱۹۹۰) قومی انگلش اردو ڈکشنری (جلد ا۔۱۹۹۳) تنقید اور تجزیہ (۱۹۶۷) تاریخ ادب اردو چار جلد اور ادبی تحقیق وغیرہ۔

انکے علاوہ بھی کتابیں، تنقیدی، تحقیقی مضامین اور تہذیبی اور سماجی موضوعات پر مقالے کتابوں پر لکھے گئے پیش لفظ اور تبصرے بھی کثیر تعداد میں ہیں آپکے تنقیدی مضامین کافی اہمیت کے حامل ہیں جن میں تنقید اور تجربہ، نئی تنقید، ادب کلچر اور مسائل، معاصر ادب وغیرہ شامل ہیں۔

لغت میں بھی اپنی انفرادیت قائم کی آپکی پہلی کتاب جو لغت سے متعلق ہے قدیم اردو ادب کی لغت ۱۹۷۳ء میں منظر عام پر آئی۔۔۱۹۹۱ میں آپکی ایک اور معرکتہ آلاراء لغت فرہنگ اصلاحات جامعہ عثمانیہ زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔قومی انگریزی اردو لغت ۱۹۹۲ میں شائع ہوئی جو دو لاکھ الفاظ اندراجات پر مشتمل ہے فرہنگ اصلاحات جامعہ عثمانیہ حصہ دوم ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی۔

اطفال ادب میں بھی اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں ادب اطفال بچوں کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے پیش نظر تحریر کیا جاتا ہے یوں تو اردو شعر و ادب میں ادب اطفال کی جھلکیاں شروع سے ہی ملتی ہیں لیکن آزادی کے بعد اس پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ بڑے ادیب بچوں کے ادب پر زیادہ زور نہیں دیتے مگر جمیل جالبی نے یہاں بھی اپنی خدمات انجام دی ہیں حیرت ناک کہانیاں اور فوجی جیسی کہانیاں اسکی عمدہ مثال ہیں۔

بحیثیت مترجم بھی خدمات انجام دیں مختلف زبانوں سے اردو میں ترجمہ کیا جن میں جارج آرول کا ناول انیمل فارم (اردو ترجمہ جانورستان) ارسطو سے ایلیٹ تک (ڈھائی ہزار سالہ مغربی فکر کے منتخب عہد آفریں شاہکار کا اردو ترجمہ) اسلامی جدیدیت اسلامک ماڈرن ازم کا ترجمہ ہے۔

آ پکی تصانیف وتالیف کی تعداد کثیر ہے۔نقاد، مورخ، محقق، ادیب، مترجم، ماہر ادب اطفال ،لغت نگار آ پکی شخصیت قوس وقزح کے رنگوں کی طرح مختلف پہلوؤں سے سجی ہوئی ہے جو ادب کے وسیع ترین کینوس کے شایان شان ہے۔

تاریخ ادب اردو جلد اول:

تاریخ ادب اردو آپکا لافانی کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔تاریخ ادب اردو کی پہلی جلد ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی جو ادبی تاریخ نویسی کے باب میں لائق صد ستائش ہے اس کتاب نے اردو ادب کی تاریخ کو آسمان ادب پر پہنچا دیا۔جس سے آپکے مطالعے کی وسعت ،سماجی علوم سے واقفیت قدیم وجدید ادبی تاریخ سے آگہی' ادبی تنقید کا شعور اور لسانیات پر گہری نظر مختلف علوم وفنون کی اہمیت ،سماجی ومعاشرتی واقعات اور حالات کی بدلتی صورتحال پر گہری نظر جیسے صفات سے آگہی ہوتی ہے ڈاکٹر احسن فاروقی کے الفاظ میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی شخصیت دیکھئے۔

''مجھے اردو کا کوئی نقاد دکھائی نہیں دیتا جو
اتنا وسیع علم رکھتا ہو ساتھ ہی واتھ اسکو جمع کر کے
مربوط کرنے ،اور انفرادی نظر کے ساتھ پیش کرنے کا
اہل ہو۔''

(ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ: گوہر نوشاہی ص ۳۱)

تاریخ ادب اردو کی پہلی جلد میں اردو زبان کے آغاز سے لے کر ۱۷۵۰ء تک کے ادب کا احاطہ کیا گیا ہے۔عہد ولی سے لے کر عہد میر' مرزا غالبؔ کے سماج اور شعور کی مختلف اور متنوع کیفیات کا بصیرت افروز اور عالمانہ تجزیہ صرف تاریخ ادب اردو میں موجود ہے۔جمیل جالبی تاریخ ادب اردو کی جلد اول کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

''میرا کام جسے میں نے تاریخ ادب
اردو کا نام دیا ہے چار جلدوں میں ہے اسکی پہلی جلد
آپ کے سامنے جو آغاز سے لے کر ۱۷۵۰ء تک
قدیم اردو زبان وادب کا احاطہ کرتی ہے یہ جلد اپنی

جگہ مکمل بھی ہے اور دوسری جلد سے مربوط و پیوستہ بھی
۔واضح رہے کہ یہ جدید انداز کی مربوط تاریخ ہے
متفرق مقالات کا مجموعہ یا تذکرہ نہیں ہے۔
(تاریخ ادب اردو جلد اول :جمیل جالبی ص ز)

تاریخ ادب اردو ایک جامع اور مستند تاریخ ہے مواد کی پیش کش کا انداز مدلل اور مبسوط ہے اشعار کا برمحل اور حسب ضرورت استعمال اور ہر شاعر کے کلام کا نمونہ بھی شامل ہے ۔ادبی شہ پارے کی صرفی ونحوی خصوصیات کا جائزہ بھی ملتا ہے۔

تاریخ نویسی بہت مشکل کام ہے کسی بھی تاریخ کو مرتب کرنے میں کئی مشکلات اور مسائل پیش آتے ہیں اور ان خاردار راہوں سے گزر کر اپنی منزل تک پہنچنا ڈاکٹر جمیل جالبی کے لئے بھی کوئی آسان بات نہیں تھی تحقیق کی پر خار راہوں پر چلتے ہوئے کئی دقتیں پیش آئیں جس کا اعتراف انھوں نے کچھ اس طرح کیا ہے۔

''تاریخ ادب ادارے لکھتے ہیں جن
کے پاس سرمایہ ہوتا ہے جنھیں ہر قسم کی سہولت میسر
ہوتی ہے جنکے پاس اپنا کتب خانہ ہوتا ہے اور
دسورے کتب خانوں سے وہ قلمی و مطبوعہ کتب
مستعار لے سکتے ہیں ۔مددگاروں کی ایک جماعت
اس کام میں انکا ہاتھ بٹاتی ہے وہاں صدر ہوتے ہیں
۔سکریٹری ہوتے ہیں مشاہیر علم وادب کام کرتے
ہیں اور کہیں برسوں میں جا کر یہ منصوبہ پورا ہوتا ہے
۔لیکن مجھے اس قسم کی سہولت میسر نہیں تھی دن بھر
گردش روزگار اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے
مختلف کتب خانوں کے چکر کاٹنے پڑتے ۔۔۔۔بہر
حال یہ کام، جیسا کچھ ہے ایک فرد کا کام ہے جس نے

اسے اپنی اپج سے کیا ہے۔۔۔میرے جنون اور علم
وادب کے عشق نے ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ
سے بے نیاز یہ جوئے شیر مجھ سے ہنسی خوشی کھدوائی
ہے۔

(تاریخ ادب اردو:جمیل جالبی ص ح)

۱اس محنت طلب کام کو کرنے کے لئے انھوں نے جی جان ایک کر دیا۔کتاب کی درجہ بندی زمانی اعتبار سے چھ فصلوں میں کی گئی ہے اور ہر فصل کو ابواب میں منقسم کیا گیا ہے مصنف کے دیباچے سے کتاب کے اغراض ومقاصد واضح ہوجاتے ہیں فصل اول سے پہلے مصنف نے تمہید کے عنوان سے اردو زبان وادب اور اس کے متعلقات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

فصل اول: شمالی ہند(تین ابواب پر مشتمل)
فصل دوم: گجری ادب اور اسکی روایت(۱۴ابواب)
فصل سوم: اردو بہمنی دور میں(دوابواب)
فصل چہارم: عادل شاہی دور(آٹھ ابواب)
فصل پنجم: قطب شاہی دور(۷ابواب)
فصل ششم: فارسی روایت کا نیا عروج:ریختہ(دوابواب)

ضمیمے کے عنوان سے پاکستان میں اردو ،پنجاب میں اردو ،لسانی اشتراک (اردو،پنجابی،سرائیکی،سندھی)سرحد میں اردو روایت،بلوچستان کی اردو روایت اور آخر میں اشاریہ بھی شامل ہے اس مختصر سے جائزے سے کتاب کے مندرجات کا اندازہ ہوتا ہے۔

تاریخ ادب اردو جلد دوم:

تاریخ ادب اردو جلد دوم کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔جمیل جالبی نے ادب کی تاریخ مرتب کرتے وقت سنی سنائی باتوں کے بجائے مختلف ماخذوں سے اپنی بات کو پیش کیا ہے جلد دوم کے حصہ اول میں لکھتے ہیں۔

''اس تاریخ میں کئی سطحیں

ملیں گی ۔تنقیدی وفکری سطح بھی اور تحقیقی وتہذیبی سطح
بھی روایت وتبدیلی کا سفر بھی اور شاعروں، مصنفوں
کا تجزیہ بھی اور لسانی تبدیلیوں کے مباحث بھی، ایسا
اسلوب جو آئینہ کی طرح صاف وشفاف ہو، رواں و
شگفتہ ہو، اور عام بول چال کی زبان سے قریب
ہوتے ہوئے بھی ادبی ہو،تاریخ ادب لکھتے ہوئے
میں نے رنگین شاعرانہ اسلوب سے حتی الوسیع دامن
بچایا ہے تا کہ اسلوب کی رنگینی ،تاریخ کو ماند نہ
کردے۔

(تاریخ ادب اردو جلد دوم: ڈاکٹر جمیل جالبی ص۱۲)

واقعات اور حقائق کی پیش کشی اس طرح مرتب کی ہے کہ پڑھنے والے کو ان حالات سے آگہی ہو اور ادب کی ارتقائی صورت بھی قاری کو سمجھ آجائے ۔دوسری جلد کی ضخامت ۱۲۴۱ صفحات پر مشتمل ہے اور اسی وجہ سے اس کو دو جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان دو جلدوں میں اٹھارویں صدی کا احاطہ کیا گیا ہے۔

جمیل جالبی نے ادوار کی زمانی تقسیم میں روایت کی تشکیل وتعمیر اور رد عمل اور تبدیلیوں کو بنیادی طور پر سامنے رکھا ہے اس تاریخ کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ انھوں نے سنہ ہجری کے ساتھ ساتھ سن عیسوی بھی درج کر دی ہے اور ہر باب کے اختتام پر حواشی بھی دیے ہیں۔

حصہ اول کتاب ۶۸۶ صفحات پر مشتمل ہے جس کو پانچ فصلوں میں بانٹا گیا ہے تمہید کے تحت دو باب ہیں پہلا باب اٹھارویں صدی سیاسی منظر،طرز فکر،تہذیبی ومعاشرتی رویئے اور دوسرا باب اردو شاعری کشمکش اثرات حرکات ومیلانات رکھا گیا ہے جہاں اردو شاعری کا جائزہ احسن طریقے سے لیا گیا ہے ڈاکٹر جمیل جالبی اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

''اردو شاعری رواج ،کشمکش،اثرات
،محرکات ومیلانات کے پس منظر میں ۔یہ بات زرا

دیر کو حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ عین اس دور انتشار
میں جب عظیم مغلیہ سلطنت کے در و دیوار گر رہے ہیں
اور معاشرہ زوال کی انتہائی پستیوں کو چھو رہا ہے اردو
ادب اور اسکی روایت ظہور میں کیسے آ گئی۔ اردو شمال
کے لئے کوئی اجنبی زبان نہیں تھی۔ یہ یہیں کی زبان
تھی اور صدیوں سے برعظیم میں ایک عام و مشترک
زبان کی حیثیت رائج تھی خود دکن میں ۱۵ ویں صدی
عیسوی کے اوائل سے اس میں باقاعدہ ادب کی
روایت کا آغاز ہو چکا تھا اور تین سو سال کے عرصے
میں وہاں اردو زبان و ادب کی کم و بیش وہی اہمیت
ہو گئی تھی جو شمال میں فارسی زبان و ادب کی تھی۔

(تاریخ ادب اردو جلد دوم: ڈاکٹر جمیل جالبی ص ۶)

جلد دوم میں ان دو ابواب کے علاوہ چھ اور فصلیں ہیں

پہلی فصل: شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدائی روایت (تین ابواب)

فصل دوم: فارسی کے زیر اثر اردو (دو ابواب)

فصل سوم: چار ابواب

فصل چہارم: ردعمل کی تحریک (چار ابواب)

فصل پنجم: ردعمل کی تحریک کی توسیع (آٹھ ابواب)

تاریخ ادب اردو جلد دوم اٹھارویں صدی کی ادبی کائنات کا منظر نامہ ہے اور اس ادبی منظر نامے میں اس عہد کے تمام بڑے چھوٹے شاعر اور نثر نگار کے کلام کا جائزہ لیا گیا ہے جمیل جالبی نے ان تمام ابواب میں تمام شاعروں اور نثر نگاروں کے سوانحی حالات اور دیگر متعلقات کو بھی تحقیق و تفتیش کے بعد قلمبند کیا ہے۔

تاریخ ادب اردو لکھ کر جمیل جالبی نے صرف اردو زبان کی تاریخ ہی رقم نہیں کی بلکہ اس عہد کا

فنی جائزہ بھی لیا ہے اور اس دور کے اسلوب بیان کو بھی موضوع بنایا اور آخر میں اشاریہ بھی موجود ہے۔
کتاب کا پیش لفظ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے وہ ادب کی تاریخ کی اہمیت و افادیت کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''اگر ادب زندگی کا آئینہ ہے تو ادب کی تاریخ' کو بھی ایسا ہی آئینہ ہونا چاہئے جس میں ساری زندگی کی روح کا عکس نظر آئے میں نے 'تاریخ ادب اردو' کو ایک ایسا ہی آئینہ بنانے کی کوشش کی ہے۔۔۔۔یہاں ادبی تاریخ کی سطح پر تحقیق' تنقید اور کلچر مل کر ایک ہو گئے ہیں۔تحقیق سے میں نے حقائق وہ واقعات کی صحت و درستی کا تعین کیا ہے تنقیدی شعور سے صحیح نتائج تک پہنچ کر تاریخی زاویہ دیا ہے اور کلچر سے ادب میں زندگی کے تنوع کو دریافت کر کے تفہیم ادب کو وسعت دینے کی کوشش کی ہے ۔۔یہی امتزاج ''تاریخ ادب اردو'' کا نمایاں پہلو اور اسکی انفرادیت ہے۔''

(تاریخ ادب اردو جمیل جالبی ص ۱۱۔۱۲)

تاریخ ادب اردو(جلد سوم):

تاریخ ادب اردو جلد سوم ۲۰۰۶ میں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی اور اس جلد میں انیسویں صدی کے نصف اول کے ادب کا احاطہ کیا گیا ہے۔۱۹ویں صدی میں اردو زبان کو بہت فروغ حاصل ہوا اور اس وقت تک اردو ہر طبقے کے عام بول چال کی زبان بن چکی تھی۔
جلد سوم کے پیش لفظ میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیالات ملاحظہ کیجئے۔

''تاریخ ادب اردو کی تیسری جلد اب

آپ کے سامنے ہے۔۔۔قارئین اکرام اس بات
سے ضرور واقف ہونگے کہ انیسویں صدی تخلیق
ادب اور رواج زبان کے اعتبار سے اردو کی سب
سے بڑی صدی ہے اس صدی میں اردو زبان کے
متعدد ادیب وشاعر داد تخلیق دے رہے ہیں اور اردو
زبان نہ صرف سارے ہندوستان کے گلی کوچوں میں
سمجھی اور بولی جارہی ہے بلکہ بادشاہ سے لے کر وزیر
تک اور امیر سے لے کر فقیر تک سب یہ زبان بول
رہے ہیں۔

(تاریخ ادب اردو: ڈاکٹر جمیل جالبی جلد سوم ص ۳)

اردو زبان کی وسعت میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے اس کے کینوس میں مختلف موضوعات شامل ہوتے جارہے تھے ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو جلد سوم کو پانچ فصلوں میں بانٹا ہے۔

فصل اول: اردو شاعری محرکات رجحانات اور روایت (چھے ابواب)
فصل دوم: اردو نثر کا جائزہ (پانچ ابواب)
فصل سوم: نوطرز مرصع اور فسانہ عجائب
فصل چہارم: مختلف شعراء کے فکر وفن کا حاطہ (۱۸/ابواب)
فصل پنجم: دو ابواب (واجد علی شاہ اور نظیر اکبر آبادی کے فن کا جائزہ)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو کی جلد سوم میں انیسویں صدی کے شعر وادب کا پر مغز اور جامہ خلاصہ جس انداز میں پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے اور اس کے مطالعے سے اردو شعر وادب کے ارتقائی رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔

تاریخ ادب اردو جلد چہارم:

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان چار جلدوں میں اردو زبان کے آغاز وارتقاء سے لے کر انیسویں

صدی کے اردو ادب کو موضوع بحث بنایا ہے اردو زبان کے آغاز وارتقاء سے انیسویں صدی کے نصف آخر کے ادب پر بحث کی گئی ہے۔جلد چہارم کو چار فصلوں میں تقسیم کیا ہے

فصل اول: ۱۲۱ابواب میں تقسیم کیا ہے

جس میں باب اول تا ہشتم غالب کے کلام کا جائزہ، سات تا باب اکیس دیگر شعراء ک ءفکر وفن کو موضوع بنایا گیا ہے۔

فصل دوم: اردو مرثیہ (تین ابواب)

فصل سوم: اردو نثر کا تنوع

فصل چہارم: اردو داستان اور دیگر ذیلی عنوانات

آخر میں اشاریہ دیا گیا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو میں جو اسلوب اختیار کیا ہے۔اردو زبان میں بہت کم لکھاریوں کو نصیب ہوتا ہے جو غیر ضروری آرائشوں سے مبرا ہے۔مشفق خواجہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ''میری مراد اس اسلوب سے ہے جو نہ
> تو اتنا مرصع اور پر کشش ہو کہ پڑھنے والا اسکے حسن
> میں کھو جائے اور مطالب کی حیثیت ثانوی رہ جائے
> اور یہ اتنا عالمانہ ہو کہ جو بات کہی جائے وہ لغت کے
> راستے ذہن تک پہنچے اور ایسا اسلوب بھی نہ ہو جو علمی
> مباحث کا مستعمل نہ ہو سکے۔مولوی عبدالحق اور
> پھر ڈاکٹر عابد حسین نے باوقار طریقے سے بات کہنے
> کا جو ڈھنگ نکالا تھا میرے نزدیک علمی تحریروں کے
> لئے اس سے بہتر اسلوب نہیں ہو سکتا جمیل جالبی نے
> اسی طرز سخن کو آگے بڑھایا۔''
>
> (اردو ادب کی تاریخ: ڈاکٹر مشفق خواجہ ص ۳۱۰)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے منفرد اسلوب بیان سے اردو زبان کی ادبی کائنات کا

وہ منظر نامہ پیش کیا ہے جس میں اس عہد کے تمام چھوٹے بڑے شاعر نثر نگار موجود ہیں ۔جمیل جالبی نے شعراء وادبا کے سوانحی حالات اوران کی کتابوں کے نام وسنین کا ذکر پوری تحقیق وتفتیش کے بعد قلمبند کیا ہے اس تاریخ کی ایک اہم خصوصیت ادوار کی سائنٹفک تقسیم ہے ۔تاریخ ادب اردو کا تحقیقی معیار بہت بلند ہے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اردو کی کسی دوسری کتاب میں ادبی تحقیق کا ایسا تنوع نہیں ملے گا۔جو دلائل اور دستاویزی حوالوں سے مزین ہے اور تاریخ ادب اردو ایک ایسی دستاویز بن گئی ہے جس میں شاعروں اور نثر نگاروں کے فن کو پرکھا جانچا اور انفرادی خصوصیات کو اجاگر کیا گیا ہے اردو زبان وادب کی تاریخ میں تاریخ ادب اردو ریڑھ کی ہڈی کی جیسی اہمیت رکھتی ہے ۔تاریخ ادب اردو لافانی کارنامہ ہے ۔جس میں بالخصوص شمالی ہند میں اردو زبان کے آغاز سے لے کر انیسویں صدی کے نصف آخر تک اردو زبان وادب کا احاطہ کیا گیا ہے ۔جس میں سماج اور شعور کی مختلف اور متنوع کیفیات کا بصیرت افروز اور عالمانہ تجزیہ موجود ہے آخر میں ڈاکٹر باقر رضوی کے الفاظ میں اپنی بات کو سمیٹتی ہوں ۔

> ''ڈاکٹر جمیل جالبی ایک طویل عرصے سے علمی انہماک اور ریاضت کے عمل سے گزر رہے ہیں وی یقیناً جدید تحقیق کا ایک روشن باب ہیں ۔ان کی محنت و ریاضت کا اعتراف ادب وتہذیب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے 'ناخن کے قرض' سے عبارت ہے۔
>
> جمیل جالبی صاحب ادب کو بنیادی طور پر ایک تہذیبی مظہر سمجھتے ہیں اور انھوں نے تاریخ ادب لکھتے ہوئے اس نکتے کو مسلسل پیش نظر رکھا ہے وہ ہر عہد کے ادبی رجحانات کو مختلف تہذیبی عوامل سے مربوط دیکھتے ہیں اس طور پر یہ تاریخ محض تاریخی واقعات وحقائق تک محدود نہیں رہتی بلکہ ایک فکری دستاویز بن جاتی ہے ایک مفصل تاریخ میں اپنے فکری

نقطہ نظر کو تسلسل کے ساتھ قائم رکھنا ایک
مشکل مرحلہ تھا جس سے جمیل جالبی صاحب نہایت
متوازن انداز میں عہدہ برآ ہوتے ہیں۔''

حوالہ جاتی کتب:

1۔ The encyclopedia of britanica vol :30 page no:64
2۔ فلسفہ تاریخ: ایک۔نذیر احمد تشنہ ص ١٧
3۔ اردو میں تاریخ نویسی: ڈاکٹر مبارک علی ص ١٠٨
4۔ اردو کی ادبی تاریخیں: ڈاکٹر گیان چند جین ص ٢٢۔٢١
5۔ ادبی تاریخ نویسی اور تواریخ ادب اردو: از: سعد مسعود غنی ص ٦۔٧
6۔ زبان و ادب: رسالہ شمارہ ٢٠، ص ١٥٢
7۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ: گوہر نوشاہی ص ١٩
8۔ ایضاً ص ٣١
9۔ تاریخ ادب اردو: ڈاکٹر جمیل جالبی ص ز
10۔ تاریخ ادب اردو جلد اول: ڈاکٹر جمیل جالبی ص ح
11۔ تاریخ ادب اردو جلد دوم (حصہ اول): ڈاکٹر جمیل جالبی ص ١٢
12۔ تاریخ ادب اردو جلد دوم (حصہ اول): ڈاکٹر جمیل جالبی ص ٢
13۔ تاریخ ادب اردو جلد دوم (حصہ اول): ڈاکٹر جمیل جالبی ص ١٢۔١١
14۔ تاریخ ادب اردو جلد سوم: ڈاکٹر جمیل جالبی ص ٣
15۔ اردو ادب کی تاریخ: ڈاکٹر مشفق خواجہ ص ٣١٠

☆☆☆

اردو ادب میں تاریخ نویسی اور ڈاکٹر جمیل جالبی

محمد امان اللہ خان
ریسرچ اسکالر، پی ایچ ڈی، اردو
وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون سائنس و ٹیکنالوجی اسلام آباد
khan.maliklalian@gmail.com
+923002594747

Abstract

Dr. Jamil Jalibi was a noted linguistic, Researcher, Critic, Translator, History writer , Master of Dacanay and scholar of Urdu literature and linguistics from Pakistan. He also was Vice Chancellor at the University of Karachi. Jamil Jalibi was born on 30 July 1929 in a Yusufzai family of Aligarh, British India. His early schooling was in Aligarh. He matriculated in Saharanpur and did his Bachelor of Arts from Meerut College. One day before the partition of India, on 13 August 1947, Jalibi migrated to Karachi, Pakistan, where he continued his education and literary activities. He received a Master of Arts degree, Bachelor of Laws degree and a Ph.D. from Sindh University. He then worked for the Income Tax Department of Pakistan until his retirement

In 1983, he became Vice-chancellor of Karachi University, where he served until 1987. Then he joined the Muqtadara Quami Zaban (National Language Authority) as its Chairman. He used to associate with Karrar Hussain, Sabzwari, Jalib Dehlvi and Ghayur Ahmed Ramzi. From 1950-54, he served as co-editor of an Urdu monthly by the name of Saqi and wrote a monthly column Baatein. He also started a quarterly magazine by the name of Naya Daur.He died on 18 April 2019 at the age of 89. The practice of history writing in the Urdu language began quite late, as Urdu prose itself was of a recent growth, which had acquired a refined literary complex in the Fort William College at the turn of the eighteenth century. The newly developed Urdu prose inherited the tradition of history writing in Persian. It borrowed heavily from them inasmuch as its form, expression, and approach were also fashioned by the medieval Persian chronicles. Initial Urdu works of Indian history, therefore, are marked largely by adaptations and translations of previous histories in Persian. The earliest examples of this kind are Araish-e mehfil of Mir Sher Ali Afsos of Fort William College (Calcutta, 1805)

Key Words:

Jamil Jalibi Critic Linguistic Translator

1۔جمیل جالبی 2۔نقاد 3۔لغت نویس 4۔مترجم
5۔تاریخ نویسی 6۔محقق 7۔دکن

اردو تاریخ نگاری:

اردو، جنوبی ایشیا کی ایک اہم اور بڑی زبان ہے۔ برصغیر ہند کی آزادی کے بعد سے اس زبان کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ہندوستان کی اٹھارہ (18) قومی زبانوں میں سے ایک ہے۔ یہ پاکستان کی سرکاری زبان ہے۔ اردو زبان پر مشتمل ادب "اردو ادب" کہلاتا ہے جو نثری اور شعری ادب پر مشتمل ہے۔ ادبی تاریخ نگاری ایک مشکل فن ہے جس فن کا آغاز بیسویں صدی میں ہوا۔ تاریخ نگاری یا انگریزی Historiography) نسبتاً ایک جدید فن ہے جس میں مؤرخ، انسانی سرگرمیوں کو قلم بند کرنے اور ان سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسانی تجربہ کے مطالعہ کو ایک ناگزیر اور فطری عمل قرار دینے اور تاریخ کو سائنٹفک نقطۂ نظر سے جانچنے کے تصور نے اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کی ابتدا میں فروغ پایا۔ اٹھارہویں صدی سے قبل کی بھی تہذیب میں تاریخ نگاری کو اہم مقام حاصل نہ تھا۔ وہ نہ تو باقاعدہ تعلیم کا جز و سمجھی بات تھی اور نہ بحیثیت مجموعی انسانی زندگی کی تشریح و تفسیر اس کا منشا تھا۔ یہ کام مذہب، فلسفہ، ڈراما اور شاعری کے حدود میں آتے تھے۔ ارسطو اپنی تصنیف ''شعریات'' میں تاریخ کو حقارتاً محض اس لیے ناقابل اعتنا قرار دیتا ہے کہ اس میں صرف مخصوص واقعات ہی کا ذکر ہوتا ہے اور ڈرامے کی طرح ایک مربوط پلاٹ کے ذریعہ کسی صداقت کا اظہار نہیں جاتا۔ رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو کا شمار ابتدائی تاریخوں میں ہوتا ہے۔ اب تک سب سے طویل تاریخ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھی، جس کی چار جلدیں تا حال شایع ہوئی ہیں، جو انیسویں صدی تک کے اردو ادب کا احاطہ کرتی ہے۔ ان کے علاوہ اردو ادب کی تاریخ از ڈاکٹر تبسم کاشمیری، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ از ڈاکٹر سلیم اختر، تاریخ ادب اردو از وہاب اشرفی، تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر ملک حسن اختر، تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند از وہاب اشرفی، تاریخ زبان و ادب اردو از صغیر احمد جان، تعارف تاریخ اردو از ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، اردو ادب کی مختصر تاریخ از ڈاکٹر انور سدید، تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر انور سدید،

داستان تاریخ اردو از حامد حسن قادری اور آب حیات از محمد حسین آزاد وغیرہ اہم ترین اردو ادبی تاریخ کی کتب شمار کی جاتی ہیں۔

ادبی تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے کریم الدین لکھتے ہیں:

''تاریخ اس کو کہتے ہیں جس میں
واقعات یا حالات زمانے کے اس طور پر لکھے جائیں
کہ اس سے یہ معلوم ہو سکے کہ فلانے زمانے میں یہ
حادثہ یا واقعہ گزرا۔ بخلاف تذکرہ کے اس میں خاص
قسم کے لوگوں کا حال لکھا جاتا ہے۔'' (۱)

ادبی تاریخ اور ادبی تحقیق کا موضوع بلا شبہ خشک ہی نہیں بل کہ بہت خشک معلوم بھی ہوتا ہے۔ اس موضوع پر لیکچر سننے والا یا کسی مقالے کو پڑھنے والا طالب علم بہت جلد اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے کیوں کہ تاریخی اور تحقیقی مسائل جو اتنے دقیق ہوتے ہیں کہ اس کی سمجھ سے بالاتر ہونے لگتے ہیں جس سے اسے بوریت کا احساس ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ادبی تاریخ کسی عہد کی تہذیب و ثقافت سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ نہ صرف تہذیب و ثقافت بل کہ سیاسی تاریخ، فلسفہ، فکر، دیو مالا، نفسیات، معاشیات، پیداواری نظام اور سماجی تاریخ سے بھی گہرا تعلق اس کے حصہ میں شامل ہے۔ ادبی تاریخ اس داستان کو بھی بیان کرتی ہے جس کا تعلق ماضی سے ہے۔ یہ ماضی کے واقعات، تصورات اور رجحانات کی داستان ہے کہ جس کی تخلیق کسی مخصوص عہد میں ہوتی ہے مگر اس داستان کی ایک جہت یہ بھی ہے کہ وہ ماضی میں پیش آنے والی واردات کے علم و آگہی کا بھی نام ہے۔ ادبی مؤرخ کا بنیادی کام اسی علم و آگہی کی دریافت کرنا اور اسے مناسب طور پر پیش کرنا بھی ہے۔ اگر ادب کی تاریخ میں علم و آگہی کی یہ بصیرت نہیں ملتی تو اسے ادبی تاریخ کا درجہ بھی نہیں دیا جائے گا اور یہ تاریخ ماضی کے واقعات و رجحانات کا ایک تذکرہ بن کر رہ جائے گی۔

تاریخ نگاری کی ضرورت و اہمیت

تاریخ نگاری کا مقصد ماضی کی بازفت ہے لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ پرانی کتابوں میں لکھے گئے واقعات کو اپنی زبان میں بیان کر دینا۔ اگر پرانی کتابوں میں درج

واقعات کو دہرانا ہی مقصود ہو تو نئی کتاب لکھنے کا کیا فائدہ؟ پرانی کتابیں نئی کتابوں کی نسبت مشترک معلومات کے جاننے کا بہترین اور مستند ذریعہ ضرور ہوتی ہیں۔ مؤرخ اپنے عہد کی تاریخ لکھتے ہیں اور یہ تاریخ لکھتے وقت اگر صرف وقائع نگاری پر اکتفا کرے تو اسے حق بجانب قرار دیا جا سکتا ہے کیوں کہ وہ آئندہ کے مؤرخ کے لیے مواد کی جمع آوری کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کی تاریخ لکھنے والوں کی ذمہ داریاں بہت زیادہ ہیں۔ وہ ہر عہد کے سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی مدوجزر اور اقدار کو پیش نظر رکھ کر واقعات جانچتا، پرکھتا اور ان میں تضاد کے ہوتے ہوئے باہمی تعلق کو دریافت بھی کرتا ہے اور ایک ایسی صورت پیش کرتا ہے جس میں متعلقہ عہد اپنے صحیح خدوخال کے ساتھ نظر آتا ہے۔ تاریخ افراد کی سوانح عمریوں اور کارناموں کے مجموعے کا نام نہیں ہے بل کہ فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق کو سمجھنے سمجھانے کا بھی وسیلہ ہے۔ یقیناً وہ افراد بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جو معاشرے پر اثر انداز ہوئے لیکن ان لوگوں کی بھی اہمیت مسلّم ہے جنھوں نے اس اثر کو قبول کیا۔ عمومی تاریخ اور ادبی تاریخ میں فرق یہ ہے کہ عمومی تاریخ میں ہر طرح کے اہم لوگوں کو شامل کیا جاتا ہے لیکن ادبی تاریخ وہ سمندر ہے جس میں مؤرخ کو صرف ادب کا نقاد اور محقق ہونا کافی نہیں ہوتا اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ متعلقہ خطے یا عہد کی سیاسی تحریکات، ثقافتی اقدار، لسانی گروہوں اور سماجی رابطوں سے بھی پوری طرح واقف ہوتا ہے۔ ادبی مؤرخ ادب کے حوالہ سے انسانی مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور ادب کے ہی وسیلہ سے اُن تہذیبی قدروں کی نشان دہی کرتا ہے جو عام زندگی میں جاری وساری ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ ایک ثقافتی مبصر اور سماجی ناقد کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ ادبی تاریخ کی جامع تاریخ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان الفاظ میں کی ہے:

> **''ادب کی تاریخ وہ آئینہ ہے جس میں ہم زبان اور اس کے بولنے اور لکھنے والوں کی اجتماعی وتہذیبی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ ادب میں سارے فکری، تہذیبی، سیاسی، معاشرتی اور لسانی عوامل ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک وحدت، ایک اکائی بناتے ہیں اور تاریخ ادب ان**

سارے اثرات، روایات، محرکات اور خیالات و
رجحانات کا آئینہ ہوتی ہے۔"(۲)

ادبی تاریخ کے نام پر جو کتب لکھی گئی یا لکھی جا سکتی ہیں انہیں ہم چار بڑی قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ مختلف مقامات کی ادبی تاریخیں
۲۔ موضوعاتی تاریخیں
۳۔ کسی خاص عہد کی ادبی تاریخیں
۴۔ عام عہد کی ادبی تاریخیں

اس کے علاوہ بھی اردو ادب کی تاریخ کو ذیل کے ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے

☆ پہلا دور ۱۲۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک
☆ دوسرا دور ۱۷۰۰ء سے ۱۸۰۰ء تک
☆ تیسرا دور ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک
☆ چوتھا دور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک
☆ پانچواں دور ۱۹۱۴ء سے حال تک

تاریخ، تحقیق اور تنقید کا باہمی امتزاج اور اشتراک ابتدا میں عموماً تذکرہ نگاری میں نظر آتا ہے جس میں تذکرہ نگاروں کا تنقیدی شعور بھی شامل ہے کہ جس کے زیرِ اثر وہ شعرا کا کلام منتخب کرتے رہے اور کہیں کہیں ان کے کلام اور ان کی شخصیت، ان کے ذوق و فن کی جانب اشارے بھی کرتے رہے۔ یہیں ان کے تحقیقی و تنقیدی شعور کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔ اردو تاریخ کا آغاز عموماً تذکرہ نگاری سے ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب میں تاریخ نگاری کا یہ اہم موڑ ثابت ہوئے ہیں۔ ذیل میں ان تذکروں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اردو تاریخ نگاری کے حوالہ سے اہم ترین ثابت ہو چکے ہیں۔

۱۔ گلشنِ گفتار
۲۔ نکات الشعرا
۳۔ تذکرہ ریختہ گویاں

۴۔ تحفۃ الشعرا

۵۔ مخزنِ نکات

۶۔ تذکرہ شعرائے اردو

۷۔ گل زارِ ابراہیم

۸۔ تذکرہ ہندی

۹۔ ریاض الفصحا

۱۰۔ طبقاتِ شعرا

۱۱۔ گلشنِ ہند (لطف)

۱۲۔ مجموعہ نغز

۱۳۔ معرکہ زیبا

۱۴۔ طبقاتِ سخن

۱۵۔ عیار الشعرا

۱۶۔ مسرت افزا

۱۷۔ مقامات الشعرا

۱۸۔ خوش معرکہ زیبا

۱۹۔ معدن الجواہر

۲۰۔ انتخابِ یادگار

۲۱۔ خم خانہ جاوید (۳) وغیرہ اہم تذکرے ہیں جن کے سبب ادبی تاریخ نگاری نے اپنا راستہ پکڑا اور ادبی مؤرخوں نے کمال عمدگی سے ادبی تاریخ کو پیش کیا۔

ادبی تاریخ لکھنے کے اصول

ایک مثالی ادبی مؤرخ کو کن خوبیوں کا حامل ہونا ضروری ہے تا کہ اس کی لکھی گئی ادبی تاریخ ایک مکمل نمونہ پیش کر سکے۔ ان خوبیوں کو ذیل میں بیان کیا جا تا ہے:۔

- ادبی مؤرخ کو غیر جانب دار ہونا چاہیے اور اپنے فیصلوں پر ہر ممکن معروضیت

کو برقرار رکھنا چاہیے۔

- چوں کہ ادبی تاریخ کا دارومدار سوانحی تحقیق اور ادبی تنقید پر ہوتا ہے لہٰذا تاریخ نگار کی نظر ان دونوں پر عمدہ ہونی چاہیے، اس کے علاوہ دوسرے سماجی علوم مثلاً فلسفہ، عمرانیات، نفسیات اور مذہب پر بھی اسے دسترس ہونی چاہیے۔
- ادبی مؤرخ کے فیصلوں کا دارومدار متن پر ہوتا ہے لہٰذا اُسے تدوینِ متن کے اصولوں سے آگاہ ہونا چاہیے۔ اس کا لسانی شعور اسے کئی اغلاط سے بچا سکتا ہے۔
- تذکروں کی اغلاط اور سوانح کے متعلق جو تحقیقات ہوئی ہیں اُن سے بھی آگاہ ہونا چاہیے،
- اپنے پیش رووں کے ہر بیان کو من وعن قبول نہیں کرنا چاہیے۔
- ہر عہد کے کارناموں کو ان کے سیاسی، سماجی اور فنی ماحول سے جدا کر کے نہیں دیکھنا چاہیے۔ ادبی تاریخ ایک طرح کی قومی سوانح عمری ہوتی ہے لہٰذا ادب کو بدلتے ہوئے تہذیبی ارتقا کی روشنی میں دیکھنا ہی صحیح نتائج تک پہنچا سکتا ہے۔
- مختلف ادب پاروں کو آج کے معیار پر نہیں بل کہ ان کے عہدِ تصنیف میں رکھ کر پرکھنا چاہیے۔
- کسی بھی ادبی مرکز کو دبستان بنا لینا درست نہیں ہوگا۔ ماضی میں لکھنؤ، دہلی، رام پور اور عظیم آباد کے دبستانوں نے کئی مغالطے پیدا کیے لہٰذا ایسی تقسیم پر یقین نہیں رکھنا چاہیے۔
- ادوار بندی میں اس اصول کا خیال رکھا جائے کہ وہ کسی واضح تصور پر مبنی ہوں۔
- ادبی تاریخ کو پہلے تاریخ ہونا چاہیے اور پھر کچھ اور، لہٰذا سنین کے درست استعمال اور واقعاتِ زمانی کے تعین پر زیادہ توجہ دینی چاہیے۔
- ادب محض فکشن یا انشائیہ نہیں ہے دیگر اصناف میں تخلیقی کام کرنے والے مصنفین کو بھی مناسب نمائندگی ملنی چاہیے۔
- نمائندہ اشعار کا انتخاب درست متن کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اشعار کا ذخیرہ خاصا ہوگا تو انتخاب بھی مناسب ہوگا۔ کسی ایک شعر کے شاعر کے مجموعی رنگ کا اندازہ ہمیں غلط نتیجے تک لے جا

سکتا ہے۔

- تخلیق اور تخلیق کار کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا لہٰذا ادبی مؤرخ کو سوانحی حصہ پر کماحقہٗ توجہ صرف کرنی چاہیے۔
- محض الفاظ کی بنیاد پر لسانی نظریے وضع نہیں کرنے چاہیں بل کہ صوتیات اور صرف ونحو پر مطالعے کی بنیاد رکھنی چاہیے۔
- ہر دور کے حالات و واقعات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ان واقعات کے اثرات کو اُس دور کے ادب میں تلاش کرنا چاہیے۔
- ادبی مؤرخ کو ادبی تخلیقات کے مآخذ اور محرکات کا بھی کھوج لگانا چاہیے۔
- سب سے اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ ادبی مؤرخ کو ادب کے مرکز سے باہر نکل کر بھی اعلیٰ ادب کی تلاش کرنی چاہیے۔ اسے ادبی ذخائر دریافت کر کے ان کی قدر و قیمت کا بھی تعین کرنا چاہیے۔
- کوئی ایسا ادارہ ضرور ہونا چاہیے جو بعض منتخب اور مستند تاریخوں کو مصنف کی وفات کے بعد بھی اپ ٹو ڈیٹ رکھے اور اس میں مناسب اضافہ کرتا رہے۔ (۴)

تاریخ اور ادب میں گہرے روابط ہیں۔ تاریخی منظومات، تاریخی قصے، ناول، افسانے سب تاریخ کے اہم ترین مآخذ ہیں۔ اس طرح کسی عہد کی تمدنی صورتِ حال کے بارے میں جاننے کا سب سے اہم ذریعہ ادب اور فنونِ لطیفہ ہیں لیکن اس ربط کے باوجود تاریخ اور ادبی تاریخ میں بعض افتراقات بھی ہیں۔ تاریخ نگاری کا بنیادی وظیفہ وقائع نویسی ہے، اگر چہ وقائع نویسی سے سوا بھی ہے۔ ادبی تاریخوں میں واقعات کا زیادہ تر تعلق تخلیق کار کے حالات زندگی سے ہے۔ سوانح نگاری ادبی تاریخ کا یک جزو ہے۔ ادبی تاریخ، ادبی تاریخ نگاری کا لازمی حصہ ہے لیکن تاریخ نگاری میں سیاسی تعامل کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے جب کہ ادبی تاریخ نگاری میں سیاسی صورتِ حال محض پس منظر کا کام دیتی ہے البتہ یہ سچ ہے کہ ادبی تاریخ میں بھی وہی زندہ رہا ہے جس کو سیاسی عنایات یا مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کا سیاسی اثر ورسوخ نہ تھا اس کو اکثر ادبی تاریخ نگار نظر انداز کرتے آگے نکل گئے ہیں۔ ادبی تاریخ نگاری میں جو اہم اصول مدّ نظر ہونے چاہیں وہ ذیل میں ہیں:۔

۱۔ تسلسل

۲۔ عصری صورتِ حال

۳۔ تاریخی اظہار

۴۔ تناظرات کی عکاسی

۵۔ زمان ومکان کا بُعد

۶۔ اپنے عہد کی زندہ روایات اور اقدار

۷۔ نگارشات کے نمونے

۸۔ فضول موازنے سے اجتناب

۹۔ وضاحت

۱۰۔ محنت اور دیانت داری

۱۱۔ پیرائیۂ تحریر

۱۲۔ دستاویزات وماخذات اوّلین ماخذات ثانوی ماخذات

داخلی وخارجی ماخذات

۱۳۔ تنقید کی اہمیت

۱۴۔ ادوار اور اصناف کی تقسیم (۵)

درج بالا اصولوں کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تاریخِ ادب جیسے اہم ترین موضوع کو اتنا آسان لیا جاتا رہا ہے کہ آج تک اس کے اصول مرتب کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی گئی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

ڈاکٹر جمیل جالبی اردو زبان وادب کے حوالہ سے بطور محقق، مدون، ناقد، لغت نویس، مترجم، ماہرِ دکنیات اردو زبان وادب کے مؤرخ کے طور پر مشہور ہوئے۔ ان کا پورا نام محمد جمیل خان ولد محمد ابراہیم خان ہے اور آپ کے دادا کا نام محمد اسماعیل خان ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا تعلق پٹھان قبیلے یوسفزئی خاندان (۶) سے ہے۔ ان کا قلمی نام جمیل جالبی/ ڈاکٹر جمیل جالبی ہے۔ اگرچہ سرکاری ریکارڈ کے مطابق ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ پیدائش یکم جولائی ۱۹۲۹ء بتائی جاتی ہے جب کہ ان کی اصل تاریخ پیدائش ۱۲ جون

۱۹۲۹ء(۷) ہے اور ان کی پیدائش کا شہر علی گڑھ ہے۔

تعلیم

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ابتدائی تعلیم علی گڑھ سے ہی حاصل کی۔ ان کے تعلیمی میدان کی کامیابیاں ذیل میں دی جاتی ہیں:

نمبر شمار	نام ڈگری	سال	ادارہ/مقالہ
۱	میٹرک	۱۹۴۳ء	گورنمنٹ ہائی سکول سہارن پور (بھارت)
۲	ایف اے	۱۹۴۵ء	میرٹھ کالج بھارت
۳	بی اے	۱۹۴۷ء	میرٹھ کالج بھارت
۴	ایم۔اے انگریزی	۱۹۴۹ء	سندھ یونیورسٹی کراچی
۵	ایم۔اے اردو	۱۹۵۰ء	سندھ یونیورسٹی کراچی
۶	ایل ایل بی	۱۹۵۰ء	سندھ یونیورسٹی کراچی
۷	پی ایچ ڈی اردو	۱۹۷۱ء	سندھ یونیورسٹی جامشورو
۸	ڈی لٹ	۱۹۷۳ء	سندھ یونیورسٹی جامشورو
۹	ڈی ایس سی	۱۹۸۸ء	Medinica Alternatua International

(۸)

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنا پی ایچ ڈی اردو کا مقالہ ڈاکٹر غلام مصطفٰی خان کی نگرانی میں مکمل کیا اور مقالہ کا عنوان قدیم اردو کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ تھا جب کہ ڈی لٹ کی ڈگری ان کو مثنوی کدم راؤ اور پدم راؤ کی تدوین کرنے پر عطا کی گئی

شادی

ڈاکٹر جمیل جالبی کی شادی یکم نومبر ۱۹۵۳ء کو ان کی خالہ زاد نسیم شاہین سے ہوئی۔ ان سے ان

کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

ا۔ڈاکٹر خاور جمیل ۲۔محمد علی خان ۳۔سمیرا جمیل ۴۔ فرح جمیل (۹)

ملازمت

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ملازمت کے سلسلہ میں جن اداروں سے وابستہ رہے ان کی تفصیل ذیل میں ہے۔

نمبر شمار	ذمہ داری	دورانیہ	ادارہ
۱	ہیڈ ماسٹر	۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۲ء	بہادر یار جنگ ہائی سکول
۲	انکم ٹیکس آفیسر CSS	۱۹۵۳ء	انکم ٹیکس آفس
۳	وائس چانسلر	یکم ستمبر ۱۹۸۳ء تا ۳۱ اگست ۱۹۸۷ء	جامعہ کراچی
۴	صدر نشیں	۷ نومبر ۱۹۸۷ء تا نومبر ۱۹۹۴ء	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد
۵	اعزازی صدر	۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۸ء	اردو ڈکشنری بورڈ کراچی

(۱۰)

تصانیف

جیسا کہ آغاز میں ذکر ہوا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نامور محقق، ناقد، مترجم ار تاریخ دان کی حیثیت سے اپنی زندگی گزار چکے ہیں۔ان کی تصنیف و تالیف کردہ کتب کی فہرست ذیل میں دی جاتی ہے۔

تنقید

نمبر شمار	نام کتاب/مضمون	سال اشاعت	مقام اشاعت
۱	پاکستانی کلچر،قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ	۱۹۸۱ء تا ۱۹۹۲ء (پانچ ایڈیشن)	نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد
۲	تنقید اور تجربہ	۱۹۷۴ء	مشتاق بک ڈپو کراچی
۳	محمد تقی میر	۱۹۸۱ء	انجمن ترقی اردو کراچی
۴	نئی تنقید (مرتبہ خاور جمیل)	۱۹۸۵ء	رائل بک کمپنی کراچی
۵	ادب کلچر اور مسائل (مرتبہ خاور جمیل)	۱۹۸۴ء	رائل بک کمپنی کراچی
٦	قومی زبان۔یک جہتی نفاذ اور مسائل	۱۹۸۹ء	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد
۷	معاصر ادب	۱۹۹۱ء	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
۸	ادبی تحقیق	جون۔۱۹۹۴ء	مجلس ترقی ادب لاہور

تحقیق وتدوین

نمبر شمار	نام کتاب/مضمون	سال اشاعت	مقام اشاعت
۱	حاجی بغلول منشی سجاد حسین کا ناول	۱۹۴۱ء	مشتاق بک ڈپو کراچی
۲	دیوان حسن شوقی	۱۹۷۱ء	انجمن ترقی اردو کراچی
۳	دیوان نصرتی (مقدمہ وفرہنگ)	۱۹۷۲ء	قوسین لاہور
۴	مثنوی نظامی دکنی المعروف مثنوی کدم راؤ پدم راؤ	۱۹۷۳ء	انجمن ترقی اردو کراچی
۵	بزم خوش نفساں (شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کا مجموعہ)	۱۹۸۵ء	مکتبہ اسلوب کراچی
٦	ن۔م راشد ایک مطالعہ	۱۹۹۰ء	سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور
۷	کلیاتِ میراجی	۱۹۸۸ء	اردو مرکز لندن

۸	میراجی ایک مطالعہ	۱۹۹۰ء	سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور

لغات

نمبر شمار	نام کتاب/مضمون	سال اشاعت	مقام اشاعت
۱	قدیم اردو کی لغت	۱۹۸۳ء	مرکزی اردو بورڈ لاہور
۲	فرہنگِ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ جلد اوّل	۱۹۹۱ء	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد
۳	فرہنگِ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ جلد دوم	۱۹۹۳ء	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد
۴	قومی انگریزی اردو لغت	۱۹۹۲ء	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

تاریخِ ادب اردو

نمبر شمار	نام کتاب/مضمون	سال اشاعت	مقام اشاعت
۱	تاریخ ادب اردو (قدیم دور) آغاز تا ۱۷۰۵ء	۱۹۸۴ء	مجلس ترقی ادب لاہور
۲	تاریخ ادب اردو جلد دوم	۱۹۸۷ء	مجلس ترقی ادب لاہور
۳	تاریخ ادب اردو جلد سوم	۲۰۰۴ء	مجلس ترقی ادب لاہور
۴	تاریخ ادب اردو جلد چہارم	۲۰۱۲ء	مجلس ترقی ادب لاہور

تراجم

نمبر شمار	نام کتاب/مضمون	سال اشاعت	مقام اشاعت
۱	جانورستان (جارج آرول کے ناول Animal Farm کا ترجمہ	۱۹۸۵ء	
۲	ایلیٹ کے مضامین اردو	۱۹۴۰ء	اردو اکیڈمی سندھ کراچی
۳	ارسطو سے ایلیٹ تک	۱۹۷۵ء	نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی

۴	برصغیر میں اسلامی جدیدیت (عزیز احمد کی انگریزی کتاب کا ترجمہ)	۱۹۸۹ء	ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور
۵	برصغیر میں اسلامی کلچر (عزیز احمد کی انگریزی کتاب کا ترجمہ)	۲۰۰۵ء	ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور

دیگر کتب

نمبر شمار	نام کتاب/مضمون	سال اشاعت	مقام اشاعت
۱	حیرت ناک کہانیاں	۱۹۸۳ء	نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی
۲	پاکستان میں ذریعہ تعلیم کا مسئلہ	۱۹۹۳ء	پمفلٹ
۳	نہ ہوئی قرولی (سرشار کے مزاحیہ کردار کی سرگزشت)	۱۹۹۳ء	فیروز سنز لاہور

(۱۱)

اعزازات

نمبر شمار	نام کتاب	اعزاز	سال	ادارہ/حکومت
۱	پاکستانی کلچر	ادبی انعام	۱۹۴۴ء	داؤد ادبی انعام
۲	مثنوی کدم راؤ پدم راؤ	ادبی انعام	۱۹۷۳ء	داؤد ادبی انعام
۳	قدیم اردو لغت	ادبی انعام	۱۹۷۴ء	داؤد ادبی انعام
۴	تاریخ ادب اردو	ادبی انعام	۱۹۷۵ء	داؤد ادبی انعام
۵	یونیورسٹی گولڈ میڈل		۱۹۷۸ء	
۶	محمد طفیل ادبی ایوارڈ	ادبی انعام	۱۹۸۹ء	محمد طفیل ادبی ایوارڈ

۷	ستارہ امتیاز	صدارتی انعام	ادبی ۱۹۹۰ء	حکومتِ پاکستان
۸	ہلالِ امتیاز	صدارتی انعام	ادبی ۱۹۹۴ء	حکومتِ پاکستان
۹	بابائے اردو مولوی عبد الحق ادبی انعام ایوارڈ		۲۰۰۶ء	اکادمی ادبیات پاکستان
۱۰	کمالِ فن		۲۰۱۵ء	

(۱۲)

وفات

پاکستان کا یہ نامور محقق، نقاد، ماہر لسانیات، ادبی مؤرخ، سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی، چیئرمین مقتدرہ قومی زبان اور صدر اردو لغت بورڈ بالآخر ۱۸۔ اپریل ۲۰۱۹ء (۱۳) کو اپنی سانسیں ہار گیا اور اپنی جان، جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

''تاریخ ادبِ اردو'' از ڈاکٹر جمیل جالبی

ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ کام جسے انہوں تاریخِ ادب اردو کا نام دیا ہے چار جلدوں پر مشتمل ہے جو تاریخِ اردو ادب کے حوالہ سے طویل ترین کام ہے۔ ہر جلد جدید اور مربوط انداز میں لکھی گئی ہے، متفرق مقالات کا مجموعہ یا تذکرہ نہیں ہے۔ تمام جلدیں اپنی جگہ مکمل اور دوسری جلدوں سے مربوط بھی ہیں۔ جدید ادب کی طرح قدیم ادب بھی مخصوص تہذیبی معاشرتی، معاشی، سیاسی، لسانی و ثقافتی عوامل کا منطقی نتیجہ تھا۔ اس لیے اس کا مطالعہ بھی تہذیبی و معاشرتی عوامل کی روشنی میں ویسے ہی کیا گیا ہے جیسے جدید ادب کا کیا جاتا ہے۔ ذیل میں سرسری جائزہ لیا جاتا ہے:۔

جلد اوّل آغاز تا 1750ء

پہلی جلد جولائی 1975ء میں منظر عام پر آئی اس میں کل 791 صفحات ہیں اور اس کو چھ فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر فصل اپنی ذیل میں کچھ ابواب رکھتی ہے جو مختلف ادوار کے حساب سے

اردو ادب کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔تمہید، ترتیب، کتابیات اور اشاریہ اس کے علاوہ ہیں۔ذیل میں وہ تقسیم پیش کی جاتی ہے:۔

تمہید اردو زبان اور اس کے پھیلنے کے اثرات

فصل اول شمالی ہند(۱۰۵۰ء تا ۱۷۰۷ء)

پہلا باب مسعود سعد سلیمان سے گرونانک تک(۱۰۵۰ء تا ۱۵۲۵ء)

دوسرا باب بابر سے شاہ جہاں تک (۱۵۲۵ء تا ۱۶۵۷ء)

تیسرا باب دورِ اورنگ زیب(۱۶۵۷ء تا ۱۷۰۷ء)

فصل دوم گجری ادب اور اس کی روایت(۱۰۵۰ء تا ۱۷۰۷ء)

پہلا باب پانچویں صدی عیسوی ہجری تا آٹھویں صدی ہجری تک(۱۰۵۰ء تا ۱۴۰۰ء)

دوسرا باب نویں اور دسویں صدی ہجری کے ملفوظات، لغات، کتبے (۱۴۰۰ء تا ۱۶۰۰ء)

تیسرا باب نویں اور دسویں صدی ہجری کی ادبی روایت(۱۴۰۰ء تا ۱۶۰۰ء)

چوتھا باب دسویں، گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری کے اوائل میں گجری ادب(۱۶۰۰ء تا ۱۷۰۷ء)

فصل سوم اردو بہمنی دور میں(۱۳۵۰ء تا ۱۵۲۵ء)

پہلا باب پس منظر، مآخذ، ادبی ولسانی خصوصیات

دوسرا باب ادب کی روایت نویں اور دسویں صدی ہجری کے اوائل میں (۱۴۳۰ء تا ۱۵۲۵ء)

فصل چہارم عادل شاہی دور(۱۴۹۰ء تا ۱۶۸۵ء)

پہلا باب پس منظر، روایت اور ادبی ولسانی خصوصیات

دوسرا باب گجری روایت کی توسیع، ہندوی روایت کا عروج(۱۵۲۵ء تا ۱۶۲۷ء)

تیسرا باب ہندوی وفارسی روایت کی کشمکش(۱۵۷۶ء تا ۱۶۴۰ء)

چوتھا باب فارسی روایت کا رواج(۱۶۴۰ء تا ۱۶۵۷ء)

تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر جمیل جالبی جلد دوم

پہلا باب مذہبی شاعری، لسانی خصوصیات شمال و دکن کی زبانوں کا فرق

دوسرا باب رزم نامے

تیسرا باب طنز و ہجو کی روایت: جعفر زٹلی

فصل دوم

پہلا باب فارسی ریختہ گو: بیدل، شاہ گلشن وغیرہ

دوسرا باب فارسی کے ریختہ گو: آرزو، مخلص وغیرہ

فصل سوم

پہلا باب ولی دکنی کے اثرات، تخلیقی رویے، شاعری کی پہلی تحریک: ایہام گوئی

دوسرا باب ایہام گو شعرا: آبرو

تیسرا باب دوسرے ایہام گو شعرا: ناجی وغیرہ

چوتھا باب غیر ایہام گو شعرا: اشرف، فائز وغیرہ

فصل چہارم ردِّ عمل کی تحریک

پہلا باب اسباب، خصوصیات، معیارِ سخن

دوسرا باب ردِّ عمل کے شعرا: مظہر جان جاناں، یقین وغیرہ

تیسرا باب ردِّ عمل کے شعرا: شاہ حاتم

فصل پنجم ردِّ عمل کی تحریک کی توسیع

پہلا باب میر و سودا کا دور

دوسرا باب محمد تقی میر: حیات، سیرت، تصانیف

تیسرا باب محمد تقی میر: مطالعہ شاعری

حصہ دوم

چوتھا باب مرزا محمد رفیع سودا

پانچواں باب خواجہ میر درد

چھٹا باب قائم، میر سوز، میر اثر

(۱۵)

تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر جمیل جالبی جلد سوم انیسویں صدی نصف اوّل

تیسرا باب شاہزادہ سلیمان شکوہ: حالات وشاعری

چوتھا باب مرزا محمد تقی خان ہوس: حالات ومطالعہ شاعری

چند اور شعرا روایت کی تبدیلی کا عمل و آغاز

پہلا باب طالب علی خان عیشی حالات ورنگ شاعری

دوسرا باب جسونت سنگھ پروانہ: حالات وشاعری

تیسرا باب قاضی محمد صادق اختر حالات وتصانیف وشاعری

چوتھا باب مہدی علی خان زکی، مرادآبادی حالات وشاعری

فصل دوم اردو نثر فورٹ ولیم کالج

پہلا باب فورٹ ولیم کالج، مقاصد وتعارف

دوسرا باب جون گل کرسٹ: تعارف، علمی وتاریخی خدمات

تیسرا باب میر امّن دہلوی: حالات ومطالعہ باغ وبہار

چوتھا باب شیر علی افسوس: حالات وزندگی، مطالعہ باغِ اردو وآرایش محفل

پانچواں باب حیدر بخش حیدری: حالات ومطالعہ، آرایش محفل وتوتا کہانی، گلزارِ دانش وغیرہ

چھٹا باب نہال چند لاہوری: حالات ومطالعہ مذہبِ عشق

ساتواں باب میر بہادر علی حسینی: حالات ومطالعہ، نثر بے نظیر، اخلاق ہندی، نقلیات وغیرہ

آٹھواں باب مظہر علی خان ولا: حالات اور مطالعہ: مادھونل اور کام کنڈلا، بیتال پچیسی وغیرہ

نواں باب کاظم علی جوان: حالات ومطالعہ: شکنتلا، سنگھاسن بتیسی، ترجمہ قرآن مجید وغیرہ

دسواں باب حفیظ الدین احمد: حالات ومطالعہ: خرد افروز (انوار سہیلی)

گیارہواں باب خلیل علی خان اشک: اردو داستان نویسی اور سائنسی تالیف کی ابتدا، حالات ومطالعہ: داستان امیر حمزہ ورسالہ کائنات جو، نگارخانہ چین وغیرہ

بارہواں باب مولوی اکرام علی: حالات ومطالعہ: اخوان الصفا

تیرہواں باب بنی نرائن جہاں: حالات و مطالعہ: چار گلشن، دیوان جہاں، نو بہار وغیرہ

چودہواں باب مرزا علی لطف: حالات ومطالعہ: تذکرہ گلشن ہند

پندرہواں باب فورٹ ولیم کالج کی چند غیر مطبوعہ تالیفات وتراجم

فصل سوم نوطرز مرصع اور فسانہ عجائب کی درمیانی کڑیاں

پہلا باب محمد بخش مہجور: حالات ومطالعہ: گلشن نو بہار ونورتن

دوسرا باب عظمت اللہ نیاز: حالات ومطالعہ: قصہ رنگین گفتار

تیسرا باب غلام علی عشرت: حالات ومطالعہ داستان سحر البیان

نثر رنگیں کا نقطہ عروج

پہلا باب مرزا رجب علی بیگ سرور: حالات و مطالعہ: فسانہ عجائب، سرور سلطانی، شبستان سرور، فسانہ عبرت وغیرہ

رجب علی بیگ سرور اور میر امّن دہلوی کا قضیہ: سروشِ سخن اور طلسم حیرت

دوسرا باب فخر الدین حسین سخن دہلوی: سروشِ سخن۔ حالات ومطالعہ

تیسرا باب جعفر علی شیون: حالات ومطالعہ: طلسم حیرت (ضلع جگت کی آخری تصنیف)

فصل چہارم ناسخ وآتش کا دور: سادہ گوئی کے خلاف ردّعمل، طرزِ جدید وتازہ گوئی کا رواج

پہلا باب ناسخ وآتش کا دور: پس منظر اور رجحانات

دوسرا باب شیخ امام بخش ناسخ: حیات و احوال، تصانیف، طرزِ جدید کا عروج، مطالعہ شاعری، لسانی خصوصیات

تیسرا باب خواجہ حیدر علی آتش: حالات وآثار، طرزِ جدید اور متضاد، متوازی روایت۔ شاعری ولسانی خصوصیات

چند دوسرے شعرا طرزِ جدید کی تکرار وتوسیع

پہلا باب علی اوسط رشک: (نظم ونثر)، حالات وروایت ناسخ کی توسیع

دوسرا باب فتح الدولہ مرزا محمد رضا برق: حالات ومطالعہ شاعری

تیسرا باب امداد علی بحر (نظم ونثر) حالات ومطالعہ شاعری۔ بحرالبیان

چوتھا باب خواجہ محمد وزیر، وزیر لکھنؤی۔ حالات ومطالعہ شاعری

پانچواں باب فقیر محمد خان گویا (نظم ونثر)، حالات زندگی ومطالعہ شاعری و نثری داستان: بستان حکمت کا مطالعہ

چھٹا باب کلب حسین خان نادر (نظم ونثر) حالات ومطالعہ شاعری، تلخیصِ معلیٰ کی اہمیت ومطالعہ

ساتواں باب مرزا حاتم علی مہر: حالات وتصانیف ومطالعہ شاعری

آٹھواں باب میر کلّو عرش: حالات ومطالعہ شاعری

نواں باب عبدالغفور خان نسّاخ (نظم ونثر)، تصانیف وتذکرے، لسانی مباحث معرکہ: انتخاب نقص

دسواں باب اندر سبھا اور واسوخت کی مقبولیت، رواج وعروج، آغا امانت حسن لکھنؤی

روایتِ آتش کی توسیع، تکرار اور امتزاج

پہلا باب محمد خان رند: حالات ومطالعہ شاعری

دوسرا باب میر وزیر علی صبا: حالات ومطالعہ شاعری

تیسرا باب آغا حجو شرف: حالات ومطالعہ شاعری، مثنویاں

شاگردانِ آتش میں مثنوی کی مفرد روایت

پہلا باب پنڈت دیا شنکر نسیم: مثنوی گلزارِ نسیم، معرکہ چکبست وشرر

دوسرا باب نواب مرزا شوق؛ حالات ومطالعہ: فریب عشق، بہارِ عشق، زہر عشق

فصل پنجم انیسویں صدی کی دو اہم ادبی وتہذیبی شخصیات

پہلا باب بادشاہ واجد علی شاہ: حالات وشخصیت ومزاج، تصانیف (نظم ونثر) رہس اور اثرات

دوسرا باب عوام کا اکلوتا شاعر: نظیر اکبرآبادی: جدید شاعری کا پیش رو: مطالعہ شاعری

اشاریہ (۱۶)

تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر جمیل جالبی جلد چہارم

چوتھا باب	میر مہدی حسین مجروح: حالات وشاعری
پانچواں باب	قربان علی بیگ سالک: حالات وشاعری
چھٹا باب	قلق میرٹھی: حالات وشاعری
ساتواں باب	نظام رام پوری: حالات وشاعری
آٹھواں باب:	ظہیر دہلوی: حالات وشاعری

نواں باب انور دہلوی: حالات وشاعری

فصل دوم	اردو مرثیہ
پہلا باب	روایت وارتقا، پس منظر، انیس و دبیر کے پیش رو میر مستحسن خلیق، میر ضمیر، میاں دلگیر، مرزا جعفر علی فصیح

دوسرا باب میر مستحسن خلیق

تیسرا باب مظفر حسین ضمیر

چوتھا باب	چھنو لال دلگیر
پانچواں باب	مرزا جعفر علی فصیح

اردو مرثیہ کا نقطۂ عروج

باب اوّل	میر ببر علی انیس
باب دوم	میرزا سلامت علی دبیر
روایت کی تکرار	دوسرے مرثیہ گو
پہلا باب	میر مونس

دوسرا باب میر عشق

تیسرا باب میر تعشق

چوتھا باب	مرزا محمد جعفر اوج
پانچواں باب	میر نفیس
چھٹا باب	پیارے صاحب رشید

فصل سوم دورِ جدید کی توسیع: اردو نثر کا تنوع، طنز و مزاح کی روایت

باب اوّل اودھ پنچ: اشاعت و خصوصیات، بانی و مدیر منشی سجاد حسین: دورِ جدید کی توسیع، طنز و مزاح کی روایت

باب دوم اودھ پنچ کے ممتاز لکھنے والے: مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، جوالا پرشاد برق، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد، اکبر الہ آبادی: طنز و مزاح کا بے مثال، نیا منفرد رنگِ شاعری

اردو کے عناصر خمسہ

- سر سیّد احمد خان: سوانح، شخصیت، مزاج، تصانیف و تالیفات، فکر و عمل کا مطالعہ، تہذیب الاخلاق، مضامین
- خواجہ الطاف حسین حالی: حالاتِ زندگی، تصانیف، شاعری، نثر، تنقید
- محمد حسین آزاد: حالاتِ زندگی، شخصیت و مزاج، وفات، جدید نظم کا آغاز 1874ء، تصانیف و تالیفات، شاعری
- شبلی نعمانی، حالاتِ زندگی، شخصیت و مزاج، تصانیف و تالیفات، تنقید، تاریخ نویسی، شاعری، عطیہ فیضی
- نذیر احمد: سیرت و شخصیت، مزاج، تصانیف و تراجم و مکاتیب، ناول نگاری، تنقید

روایت شاعری کا فروغ پرانی روایت میں نئے رجحانات کے واضح اثرات

پہلا باب سیّد اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی

دوسرا باب سیّد مظفر علی اسیر لکھنؤی

تیسرا باب امیر اللہ تسلیم لکھنؤی

چوتھا باب میر ضامن علی جلال لکھنؤی

فصل چہارم اردو داستانیں: تمہید و مطالعہ طلسم ہوشربا، بوستان خیال

داستان اور ناول کا امتزاج پنڈت رتن ناتھ سرشار: حالات زندگی، فسانہ آزاد، ناول و تصانیف

دوسری اصنافِ نثر کا مطالعہ

سفر نامہ یوسف خان کمبل پوش: عجائباتِ فرنگ/ تاریخِ یوسفی

سیاحت نامہ کریم خان: روز نامچہ روز نامچہ: سیّد مظہر علی سندیلوی مذہبی

تصانیف میں اردو نثر

تقویۃ الایمان از شاہ محمد اسمٰعیل شہید سیّد غوث علی شاہ پانی پتی تذکرہ غوثیہ

تذکروں میں اردو نثر گلشنِ ہند، خوش معرکہ زیبا، گلستانِ سخن، تذکرہ طبقات شعرائے ہند، انتخابِ یادگار

کتب تواریخ میں اردو نثر تاریخ روہیل کھنڈ تاریخ بندیل کھنڈ

اردو نعت گوئی کا نیا رنگ، نئی روایت محسن کاکوروی کرامت علی خان شہیدی

شاعری کے دو روایتی رنگ: انیسویں صدی کا خاتمہ امیر مینائی

مرزا داغ دہلوی

جدید دور کا ارتقا اسمٰعیل میرٹھی: تمہید، حالات و عوامل، نیچرل شاعری کا ارتقا، قبولیت و اشاعت

اشاریہ (۱۷)

حوالہ جات

۱۔ عامر سہیل، سید، ڈاکٹر، نسیم عباس احمر، ''ادبی تاریخ نویسی''، لاہور، پاکستان رائٹرز کوآپریٹیو سوسائٹی، ۲۰۱۰ء، ص ۳۳

۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخ ادب اردو''، طباعت ہشتم، جلد دوم، لاہور مجلس ترقی ادب، دسمبر ۲۰۱۶ء، ص ۱۶

۳۔ عامر سہیل، سید، ڈاکٹر، نسیم عباس احمر، ''ادبی تاریخ نویسی''، لاہور، پاکستان رائٹرز کوآپریٹیو سوسائٹی، ۲۰۱۰ء، ص ۲۶

۴۔ ایضا ص ۱۶۸

۵۔ ایضا ص ۲۸۴ تا ۲۹۸

۶۔ عبد العزیز، ساحر، ڈاکٹر، ''جمیل جالبی: شخصیت اور فن''، اسلام آباد، اکادمی

ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱

۷۔ خلیق انجم، ڈاکٹر، ''کچھ جمیل جالبی کے بارے میں''، مرتبہ مضمون: ڈاکٹر جمیل جالبی ایک مطالعہ، از مشرف احمد، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، بار اوّل، ۱۹۹۳ء، ص ۱۸

۸۔ نسیم احمد، ڈاکٹر، بہ اشتراک سعید احمد، ''ڈاکٹر جمیل جالبی سوانحی کتابیات''، لاہور، الفیصل تاجران و ناشران کتب، ۱۹۹۴ء، ص ۳۱

۹۔ سمیرا انجم، ڈاکٹر، ''ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادبی خدمات کا جائزہ''، مقالہ پی ایچ ڈی اردو، شعبہ اردو، ملتان، بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی، ۲۰۱۷ء، ص ۲

۱۰۔ عبدالعزیز ساحر، ڈاکٹر، ''ڈاکٹر جمیل جالبی: شخصیت اور فن''، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء، ص ۱۳

۱۱۔ نسیم احمد، ڈاکٹر، بہ اشتراک سعید احمد، ''ڈاکٹر جمیل جالبی سوانحی کتابیات''، لاہور، الفیصل تاجران و ناشران کتب، ۱۹۹۴ء، ص ۳۱

۱۲۔ سمیرا انجم، ڈاکٹر، ''ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادبی خدمات کا جائزہ''، مقالہ پی ایچ ڈی اردو، شعبہ اردو، ملتان، بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی، ۲۰۱۷ء، ص ۲ تا ۳

۱۳۔ www.Google / ڈاکٹر جمیل جالبی

۱۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخ ادب اردو''، طباعت نہم، جلد اول، لاہور مجلس ترقی ادب، جنوری ۲۰۱۶ء، (ترتیب)

۱۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخ ادب اردو''، طباعت ہشتم، جلد دوم، لاہور مجلس ترقی ادب، دسمبر ۲۰۱۶ء، (ترتیب)

۱۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخ ادب اردو''، طباعت چہارم، جلد سوم، لاہور مجلس ترقی ادب، مارچ ۲۰۱۶ء، (ترتیب)

۱۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخ ادب اردو''، طبع دوم، جلد چہارم، لاہور مجلس ترقی ادب، جون ۲۰۱۵ء، ص ۷ تا ۱۴

☆☆☆

ڈاکٹر جمیل جالبی: اُردو زبان و ادب کا محسن

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

عظمیٰ نورین
پی ایچ ڈی اسکالر، جی سی ویمن یونیورسٹی،
سیالکوٹ، پاکستان

ABSTRACT

"Real name was Muhammad Jamil Khan and who to his name as he was impressed by ”Jalbi“later on added the famous Journalist Syed Jalib Dehlvi.Dr Jamil Jalbi was in Uterperdaish, Aligarh,and died at the 1929ءborn in June years in Karachi.age of about 90

primary and secondary education from He received from Meerath and migrated to Aligarh,did his F.A,B.A Bahadur Yar ”1947.He was headmaster atءPakistan in improving education school Karachi.He continued ”Jung from Sindh English,Urdu,and L.L.B passing M.A after University Jamshoro.He obtained Doctorate Degree from Thesis on the PHD Jamshorou Sindh university and wrote Ghulam "in supervision of Dr قدیم اُردو ادب کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہtitle of " Mustafa Khan.He was awarded D_Lit Degree on the subject

edited very first time on the subject "as he کدم راؤ پدم راؤ مثنوی of "
served in Incom Tax exams and above.He qualified CSP
department.After retirement he passioned for urdu literature
development.He wrote urdu,English dictionary comprising of
words.He became Vice Chancellor of Karachi 2,50,000
University.He became president of Muqtadra Qaumi Zaban
books.The books written by about 38wrote at Islam Abad.He
him contain research,criticism,editing,translation,dictionary
history from traced and urdu literature of children.He
wrote years.Dr jamil Jalbi comprising 2500 Aristotle till Elite
on the history of urdu literature contained four volums which
history from trekked was not possible for one person.Jalbi
years as he was impressed by the last 200

"بابائے اُردو مولوی عبدالحق"

Imtiaz and -e-Imtiaz, Sitar -e-He was awarded Hilal
e fun award. The urdu literature must be proud of -Kamal
.''his services renderd for the development of urdu literature

تاریخ شاہد ہے کہ کچھ شخصیات عہد ساز ہوتی ہیں۔اور بلاشبہ قدرت کا خاص انعام و اکرام ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص بندوں کو خاص مناصب کے لیے منتخب کر لیتا ہے اور انہیں خصوصیات وصفات اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسے کارنامہ ہائے سرانجام دیتے ہیں کہ تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتے ہیں۔ایک ایسی ہی عہد ساز شخصیت اُردو زبان وادب کی شان، آن، ایک معتبر نام اور مستند حوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک نامور محقق، نقاد، ماہر لسانیات ،ادبی مؤرخ اور مترجم کی حیثیت سے منفرد پہچان اور مقام و مرتبہ کے حامل تھے۔آپ کا نام علمی وادبی

حلقوں میں دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مثبت انداز میں نام روشن کرنا ہی اصل کامیابی وکامرانی ہے۔کوئی بھی قد آور شخصیت مال و دولت یا رعب و دبدبے کے بل بوتے پر اوراق تاریخ اور لوحِ دل میں جاگزیں نہیں ہوتی بلکہ اصل دولت عاجزی اور انکسار ہے۔کسی نے مجبور و بے کس اور بے بسوں کے لئے راہیں آسان کیں تو کسی نے قلمی جہاد کیا۔اور قلم کے ذریعے ادب کی خدمت کی۔سوال یہ ہے کہ ادب سے کیا مراد ہے؟اس کا سادہ اور آسان جواب یہ ہے کہ ادب دراصل انسان کے دل و دماغ پر خارجی موجودات کے نقوش و اثرات اور خیالات کی صورت میں پیدا ہونے والے اثرات و تاثرات کی روداد ہے۔ادب جذبات،احساسات اور خیالات کے موزوں اظہار کا نام ہے۔اُردو زبان پر مشتمل ادب اُردو ادب کہلاتا ہے جو نثر اور شاعری پر مشتمل ہے۔ نثری اصناف میں داستان،ناول، افسانہ،ڈرامہ،آپ بیتی،سوانح،انشائیہ،مکتوب نگاری اور سفرنامہ شامل ہیں۔جب کہ شاعری میں قصیدہ ،غزل،نظم،رباعی،مرثیہ اور مثنوی شعروسخن کی مثالیں ہیں۔ادب برائے ادب میں کسی سیاسی اور سماجی مسئلے کو موضوع نہیں بنایا جاتا بلکہ اصل مقصد ذہنی آسودگی اور تسکین ہوتا ہے جب کہ ادب برائے زندگی میں مسائل حیات کو اُجاگر کرتے ہوئے ادب سے زندگی کا حسن سنوارنے اور بہتر زندگی کا لائحہ عمل پیش کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ادب برائے ادب کا تصور فرانس میں مقبول و عام ہوا اور ادب برائے زندگی کا نظریہ علمی تحریک جسے تحریک علی گڑھ اور تحریک سرسید بھی کہا جاتا ہے، کے زیر اثر رائج پایا۔اُردو میں ادب عالیہ اُس ادب کو کہا جاتا ہے جو عظمت اور ترفع کے اس اعلیٰ معیار پر ہو جسے دوسری زبانوں کے ادب کے برابر رکھا جا سکے۔اسی طرح ادب لطیف کا مقصد نشاط انگیزی اور حصول مسرت ہے۔یوں ہم ادب کو مختلف صورتوں میں دیکھتے ہوئے اپنی سمت متعین کرتے ہیں۔اُردو ادب میں نثری ادب بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ شعری ادب،لیکن غزل اور نظم سے ہی اُردو ادب کی شان میں اضافہ ہوا ہے۔اُردو ادب پاکستان میں مقبول اور بھارت میں مشہور ہے جب کہ دنیا بھر کے ساتھ ساتھ افغانستان میں بھی سمجھا اور پڑھا جاتا ہے۔ادب کی اصطلاحی تعریف میں علماء کی مختلف آرا ملتی ہیں۔

علامہ مرتضیٰ زبیدی کے بقول:

"ادب ایک ایسا ملکہ ہے کہ جس کے ساتھ قائم ہوتا ہے ہر ناشائستہ بات سے اس کو بچاتا ہے۔"

ابوزید انصاری نے ادب کی تعریف کچھ یوں کی ہے:

"ادب ایک ایسی اچھی ریاضت ہے جس کی وجہ سے
انسان بہتر اوصاف سے متصف ہوتا ہے۔"

ابن الاکفانی کے نزدیک:

"علم ادب ایسا علم ہے جس کے ذریعے سے الفاظ اور کتابت کے ذریعے
اپنا مافی الضمیر دوسروں تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ اور اس کا موضوع لفظ
اور خط ہے۔ اس کا فائدہ مافی الضمیر کا اظہار ہے۔"

قیام پاکستان کے بعد ادب کے حوالے سے فکری، تاریخی، ثقافتی اور نظریاتی اساس کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہ آزادی کے بعد سست اور آہستہ ضرور رہی مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا پودا دھیرے دھیرے نشو ونما پاتا رہا۔ پاکستانی ادب کی کئی تعریفات کی گئی ہیں۔ جو بہت حد تک پاکستانی ادب کی ماہیت اور اس کے خدوخال کو بیان کردیتی ہیں۔ ان تعریفات سے اختلاف بھی ہوسکتا ہے۔ مگر ان میں سچائی کا عنصر بہر حال نمایاں ہے۔

فیض احمد فیض کا موقف ہے:

"پاکستانی ادب وہ ہے جس میں پاکستانی روایات، حالات، پس منظر اور
پیش منظر سے مطابقت موجود ہو۔ اس میں مقامیت کے مقاصد کے
ساتھ آفاقیت بھی موجود ہے۔"

احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں:

"پاکستانی ادب سے مراد وہ ادب جو پاکستان کے وجود، پاکستان
کے وقار اور پاکستان کے طریقے کا اثبات کرتا ہو اور جو پاکستان
کے تہذیبی و تاریخی مظاہر کا ترجمان ہو اور جو یہاں کے کروڑوں
باشندوں کی امنگوں اور آرزوؤں نیز شکستوں اور محرومیوں کا غیر
جانبدار عکاس ہو۔ ظاہر ہے اس صورت میں پاکستانی ادب، ہندوستانی
یا ایرانی، چینی یا انگریزی ادب سے مختلف ہوگا۔"

مرزا ادیب کا خیال ہے:

"وہ ادب جو پاکستان میں رہنے والے ادیبوں نے وجود پذیر کیا ہے۔
پاکستانی ادب ہی کہلائے گا۔"

ڈاکٹر سلیم اختر پاکستانی ادب کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

"پاکستانی ادب کا لکھا ہوا وہ ادب جس میں پاکستانی قوم کے مسائل وابتلا
کا تذکرہ ہو یا جس سے پاکستانی قوم کا تشخص اُجاگر ہوتا ہو،
اسے پاکستانی ادب قرار دیا جا سکتا ہے۔"

پاکستان میں اُردو زبان وادب کے میدان میں قلمی جہاد کا فرض منصبی سرانجام دینے والی معتبر ادبی شخصیت ڈاکٹر جمیل جالبی جون 1929ء کو علی گڑھ، برطانوی ہندوستان میں ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔تاریخ پیدائش میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

"سرکاری ریکارڈ میں جمیل جالبی کی تاریخ ولادت یکم جولائی 1929ء
ہے لیکن ان کی پیدائش کی اصل تاریخ 12 جون 1929ء ہے۔
جالبی علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔"(1)

اصل نام محمد جمیل خان ہے۔اور آپ کا مکمل نام محمد جمیل خان بن محمد ابراہیم خان بن محمد اسماعیل خان ہے۔جب کہ قلمی نام جمیل جالبی اور بعد ازاں ڈاکٹر جمیل جالبی کہلائے۔

"جس زمانے میں جالبی صاحب فرسٹ ائیر کے طالب علم تھے۔تو انھوں نے اپنا نام جمیل جالبی کر لیا، نام کے ساتھ جالبی کا لاحقہ اس لیے لگایا کہ اُردو ادب کے صف اول کے صحافی سید جالب دہلوی اور جمیل جالبی کے دادا، دونوں ہم زلف بھی تھے۔اور رشتے کے بھائی بھی تھے۔ان کی غیر معمولی شہرت کی وجہ سے گھر میں ان کا اکثر ذکر رہتا۔محمد جمیل خان نے جب ادبی دنیا میں قدم رکھا تو ان کا آئیڈیل سید جالب دہلوی تھے۔اس لیے جالب کی رعائیت سے انہوں نے نام کے ساتھ جالبی لگا لیا۔"(2)

آپ کے آباؤاجداد کا تعلق یوسف زئی پٹھان قبیلےسے تھا۔اور اٹھارویں صدی میں سوات سے ہجرت کر کے ہندوستان میں آباد ہوئے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے والد محمد ابراہیم خان میرٹھ میں پیدا ہوئے۔

آپ نے ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی۔ میٹرک 1943ء میں گورنمنٹ ہائی سکول سے پاس کیا۔ میرٹھ کالج سے 1945ء میں ایف-اے اور 1947ء میں بی-اے کی ڈگری حاصل کی۔ کالج کے تعلیمی ماحول میں جالبی صاحب کو ماہر لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزوادی، پروفیسر غیور احمد رزمی، پروفیسر کرار حسین جیسے اساتذہ ملے۔ جنھوں نے ان کی ادبی صلاحتیوں کو نکھارا۔ قیام پاکستان کے بعد 1947ء میں جمیل جالبی والدین کو بنا بتائے پاکستان آ گئے۔ ابتدائی ایام کراچی میں گزارے۔ بعدازاں ان کے بھائی عقیل بھی پاکستان آ گئے۔ اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ یہاں ان کے والد ہندوستان سے ان دونوں بھائیوں کے تعلیمی اخراجات کے لیے رقم بھیجتے رہے۔ ابتدا میں کراچی کے ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹری کی پیش کش کو قبول کرتے ہوئے پیغمبری پیشے میں اپنے فرائض سرانجام دینے لگے۔ معلّمی کے ساتھ ساتھ علمی تشنگی کو بجھانے کا بندوبست بھی کرنے لگے۔ اور جوئندگان علم کے متلاشی جمیل جالبی صاحب نے کراچی یونیورسٹی سے ایم-اے انگریزی، ایم-اے اُردو اور ایل ایل بی کا امتحان بھی پاس کرلیا۔ 1981ء میں سندھ یونیورسٹی جامشورو سے پی ایچ ڈی کا مقالہ "قدیم اردو ادب کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ" ڈاکٹر مصطفیٰ خان کی نگرانی میں مکمل کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1983ء میں جامعہ ہٰذا سے ہی اردو ادب کی پہلی مثنوی" کدم راؤ پدم راؤ" کی تدوین پر ڈاکٹریٹ آف لٹریچر کی ڈگری سے نوازا گیا۔

گھریلو تعلیم وتربیت کے علاوہ جمیل جالبی کی تعلیم وتربیت میں جن اساتذہ کرام نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں ولی محمد خان شعلہ، مولوی محمد اسماعیل اور مولوی فیض الحسن کیساتھ ساتھ کالج کے اساتذہ میں پروفیسر کرار حسین، پروفیسر غیور احمد رزمی صدیقی، پروفیسر مظہری پروفیسر محمد حسن عسکری، پروفیسر بسواس، ڈاکٹر شوکت سبزواری، پروفیسر ماتھر اور پروفیسر حبیب اللہ غضنفر خاص طور پر شامل ہیں۔ ان اساتذہ نے آپ کے علمی وادبی ذوق کو اُبھارنے اور نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔

تعلیمی مراحل کی تکمیل کے بعد سول سروسز (سی ایس ایس) کا امتحان پاس کر کے انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ میں اپنی پیشہ ورانہ خدمات سرانجام دینے لگے۔ اور انکم ٹیکس کمشنر کی حیثیت سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد باقاعدہ طور پر زبان وادب کی خدمت پر مامور ہوئے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ جالبی صاحب کو اردو زبان وادب سے شغف نہیں عشق رہا ہے۔ جس کا ثبوت یکم ستمبر 1983ء سے 31 اگست 1987ء تک جامعہ کراچی میں بحیثیت چانسلر تعیناتی ہے۔ اردو ادب

کے فروغ کا ایک اہم ادارہ مقتدرہ قومی زبان (موجودہ نام ادارہ فروغ قومی زبان) میں بھی اپنی خدمات سرانجام دیں۔

17 نومبر 1987ء سے 1994ء تک مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے صدر نشین رہے۔(4)

1991ء سے 1998ء تک اردو ڈکشنری بورڈ کراچی کے اعزازی صدر رہے۔(5)

1953ءمیں ڈاکٹر جمیل جالبی کی شادی ان کی خالہ زاد نسیم شاہین سے ہوئی۔ دو بیٹے ڈاکٹر خاور جمیل (خاور جمیل بھی اپنے والد کی طرح علمی و ادبی ذوق رکھنے والی شخصیت ہے) اور محمد علی خان، دو بیٹیاں سمیرا جمیل اور فرح جمیل ہیں۔ جالبی صاحب کی سب سے پہلی تخلیق "سکندر اور ڈاکو" تھی۔ جو انہوں نے بارہ سالہ کم سنی میں تحریر کی۔ مذکورہ کہانی بطور ڈراما اسکول میں اسٹیج کیا گیا۔ اپنے ایک انٹرویو میں جمیل جالبی صاحب نے اپنی اولین تخلیقی سرگرمی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا:

> "میں نے سب سے پہلے نویں جماعت میں ایک چھوٹا سا ڈراما لکھا تھا۔ اس کے بعد بچوں کے لیے کہانیاں لکھتا رہا۔ جب کالج میں پہنچا تو افسانے لکھنے شروع کیے۔ کبھی کرشن چندر کے رنگ میں، کبھی منٹو کے انداز میں اور کبھی عصمت چغتائی اور حسن عسکری کے رنگ میں۔"(6)

ڈاکٹر جمیل جالبی کا سب سے پہلا تنقیدی مضمون "نئے شاعر فیض احمد فیض" اگست 1968ء میں "نیا دور" کراچی سے شائع ہوا۔ لکھتے ہیں:

> "1967ء میں جب سہارن پور میں ہندو مسلم فساد ہو رہا تھا۔ کرفیو لگا ہوا تھا۔ اور ہم سب گھروں میں قید تھے تو اس وقت میرے پاس چند کتابیں تھیں۔ ان میں فیض کی "نقش فریادی" بھی تھی۔ نقش فریادی اس زمانے میں میرا پسندیدہ مجموعہ تھا۔ میں اسے پڑھتا رہتا اور لطف اندوز ہوتا رہتا۔ اسے پڑھتے پڑھتے خیال آیا کہ فیض کی شاعری کے بارے میں کچھ لکھنا چاہیے۔ یہ میرا پہلا تنقیدی مضمون تھا۔ جو میں نے لکھا جب کراچی آیا تو یہ مسودہ میرے ساتھ تھا۔ محمد شاہین صاحب کو دے دیا جسے انہوں نے نیا

دور میں شائع کیا۔"(7)

جارج آرول کے ناول کا ترجمہ جمیل جالبی نے "جانورستان" Animal FormThe کے نام سے کیا۔ جو 1958ء میں شائع ہوا۔ ان کی سب سے پہلی مرتب کردہ کتاب منشی سجاد حسین کی "حاجی بغلول" تھی۔ جو کہ 1961ء میں منظر عام پر آئی۔ پہلی طبع زاد کتاب جو کہ بہت اہم اور شہرت کی حامل سمجھی جاتی ہے اس کا نام "پاکستانی کلچر: قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ" تھی۔ جو پہلی مرتبہ 1964ء میں شائع ہوئی۔ اور اب تک اس کے تقریباً آٹھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ 1969ء میں کراچی سے شائع ہونے والے ادبی رسالہ "پیام مشرق" سے نائب مدیر کی حیثیت سے چھ ماہ تک منسلک رہے۔ بعد ازاں 1950ء سے 1956ء تک "ساقی" کی مجلس صدارت میں شامل رہے۔ آپ نے مذکورہ رسالے میں "باتیں" کے عنوان سے ادبی کالم نگاری کا آغاز کیا۔ 1955ء میں اپنا رسالہ "نیا دور" نکالا۔ جو مختصر وقت میں آپ کی خاص ادبی شناخت کا سرخیل ثابت ہوا۔ اس رسالے میں آپ نے ن-م راشد کے حوالے سے پہلی اشاعت کا اہتمام کیا جسے بعد میں کتابی صورت میں "ن-م راشد ایک مطالعہ" کے عنوان سے شائع کر دیا گیا۔ جالبی صاحب کی مدیرانہ خدمات کے حوالے سے نذر الحسن صدیقی رقم طراز ہیں:

"1955ء میں لاہور میں ایک نیا ادبی جریدہ خریدا تھا۔ جس کے دیدہ زیب ٹائٹل اعلیٰ پائے کے ادبی وشعری معیار اور اچھوتے انداز نے اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ یہ "نیا دور" کا پہلا شمارہ تھا۔ صفحہ ادارت پر شمیم احمد اور شاہد قمر سلطانہ کا نام چھپتا تھا مگر جب 1957ءمیں مستقل طور پر کراچی آ گیا تو میاں بھائی کے ذریعے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ نیا دور جمیل جالبی کا پرچہ ہے۔ اور اپنے پرچے میں چھپنے والی سطر سطر پہلے ان کی نظر سے گزرتی ہے۔ آنے والے بعد کے سالوں میں خود مجھے بھی ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہو گیا اور صدیقی صاحب کی بات کی تصدیق ہو گئی۔"(8)

ایک اور جگہ تحریری معیار کو پرکھتے ہوئے ڈاکٹر مشرف یوں رائے زنی کرتے ہیں:

"نیا دور" اردو کا غالباً واحد ادبی رسالہ ہے جس کے اصل مدیر کا نام کبھی اس پر لکھا نظر نہیں آیا۔ لیکن اس کے باوجود تمام اہل قلم جانتے تھے کہ اس پردہ نگاری کے پیچھے کون ہے۔؟"(9)

بلا شبہ عمیق، ژرف نگاہ اور صاحب بصیرت ڈاکٹر جمیل جالبی حیات زیست کا ایک عہد اردو زبان وادب کی آبیاری میں گزار چکے ہیں۔ قطع نظر ادبی خدمات کے ظاہری اور باطنی حلیے پر بھی ایک نظر ڈالتے ہیں کہ قاری کو لفظی تصویر کشی سے جالبی کے خدوخال سے بھی شناسائی ہو جائے کہ کس قسم کی شخصیت تھے۔ جمیل جالبی کے حلیے کے حوالے سے ان کے قریبی دوست شاہد احمد دہلوی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

"ایک دن دونوں وقت ملتے ایک بڑے ریشمیں سے نوجوان سامنے آ کھڑے ہوئے اور نہایت ادب کے ساتھ سلام کیا۔ میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سر پر سفید کشتی نما ٹوپی، گول چہرہ، کشادہ پیشانی، آنکھیں، کتارا سی ناک، پتلے پتلے گلابی ہونٹ، ٹھوڑی میں ہلکا سا چاہِ زنخداں، ڈاڑھی مونچھ صاف، سفید سلک کی شیروانی، اکہرا پاجامہ اور پاؤں میں سفید جوتی۔"(10)

جالبی کے اخلاق وخصائل کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے انور عالم صدیقی اپنے مضمون "میرا اہم جماعت" میں لکھتے ہیں:

"جمیل دل کا صاف، زبان کا کھرا اور صاف گو انسان ہے۔ کسی کو دھوکا نہیں دے گا کسی سے دشمنی نہیں نکالے گا، کسی سے بدلہ یا انتقام نہیں لے گا، معاف کرنا اس کا مسلک ہے۔ کوئی اس کے ساتھ برائی کرے تو وہ بھول جاتا ہے۔ وہ کھلے دشمنوں سیبھی دشمنی نہیں کرتا، تعصب اس کے مزاج میں بالکل بھی نہیں ہے۔ ضرورت مند کوئی ہو، کہیں کا ہو، وہ اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ بہت سے طالب علم ایسے ہیں جنہیں جمیل جالبی نے اپنے خرچ سے تعلیم اور اعلیٰ تعلیم دلوائی ہے۔"(11)

بیگم نسیم شاہین اپنے مضمون "ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے گھر میں" میں لکھتی ہیں:

" لکھتے ہوئے بار بار چائے پیتے ہیں اور یہی حال کھانے کا ہے، سگریٹ وغیرہ کے بالکل شوقین نہیں ہیں کھانے میں گوشت بہت پسند کرتے ہیں۔ اور سویٹ ڈش بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ کرتا اور شیروانی اور چپل پہننا انہیں اچھا لگتا ہے۔ ان کی پسند رنگوں کے معاملے میں بدلتی رہتی ہے۔ پھولوں اور خوشبو سے بھی بہت پیار ہے اور پھولوں میں گلاب کا پھول بہت پسند ہے۔"(12)

محقق اور نقاد ڈاکٹر فرمان فتح پوری اظہار رائے کرتے ہوئے جمیل جالبی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر جمیل جالبی ہمارے عہد کی قدآور شخصیتوں میں سے ہے۔ان کے مزاج میں سنجیدگی اور شگفتگی کے عناصر برابر ہیں۔غالباً سنجیدگی علمی کاموں کےحوالے سے اور شگفتگی ادبی کاموں کے حوالے سے ان میں پختہ جگہ پا گئی۔"(13)

ان آراء کی روشنی میں ڈاکٹر جمیل جالبی ظاہری و باطنی عادات، اخلاق و خصائل میں ایک نہایت نفیس اور نستعلیق شخصیت کے مالک تھے۔جالبی صاحب نے کم و بیش 38 کتابیں تصنیف کی۔ان کی درجہ بندی کچھ یوں ہے۔

تنقید:

تنقید میں پاکستانی کلچر:"قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ"،"تنقید اور تجربہ"،"محمد تقی میر"،"نئی تنقید (مرتبہ: خاور جمیل)"،"ادب کلچر اور مسائل (مرتبہ: خاور جمیل)"،"قومی زبان یک جہتی نفاذ اور مسائل"،"معاصر ادب"۔

ادبی تحقیق:

تنقید کے بعد تحقیق و تدوین کے حوالے سے حاجی بغلول (منشی سجاد حسین کا مزاحیہ ناول)، "دیوان حسن شوقی"،"دیوان نصرتی"،مثنوی نظامی دکنی المعروف" کدم راؤ پدم راؤ"،"بزم خوش نفساں "(شاہد احمد دہلوی کے 116 خاکوں کا مجموعہ)،"ن-م راشد:ایک مطالعہ"،" کلیات میراجی"،"میرا جی:ایک مطالعہ"فن پارے ادب کی زینت بنے۔چونکہ جالبی صاحب کراچی اردو لغت بورڈ کے سربراہ بھی رہے۔انہوں نے فن لغت نویسی میں بھی کمال جوہر دکھائے اور" قدیم اردو لغت"، "فرہنگ اصطلاحات، جامعہ عثمانیہ (اول جلد)"،" فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ (جلد دوم)"،"قومی انگریزی اردو لغت"۔بحیثیت ادبی مؤرخ جمیل جالبی نے" تاریخ ادب اردو" کی چار ضخیم جلدیں تصنیف کر کے لکھی گئی تمام تواریخ سے منفرد مقام و مرتبہ حاصل کرنے میں کامیاب و کامران ہو کر اردو ادب کے ماتھے کا جھومر ثابت ہوئے

"تاریخ ادب اردو" کی کتب کی درجہ بندی جالبی صاحب نے کچھ یوں کی ہے:

1۔تاریخ ادب اردو: قدیم دور،آغاز سے 1705ء تک (جلد اول)۔

2۔تاریخ ادب اردو (جلد دوم، حصہ اول)۔

3۔تاریخ ادب اردو (جلد دوم، حصہ دوم)۔

4۔تاریخ ادب اردو (جلد سوم)۔

5۔تاریخ ادب اردو (جلد چہارم)۔

آغاز سے تا حال اردو زبان و ادب کی تاریخ رقم کرنا فردِ واحد کے بس کی بات نہ تھی لیکن جالبی صاحب کی محنت، ریاضت اور علمی و ادبی شغف لائق تحسین ہے۔ اور ایک یہی ادبی کام انہیں تا ابد تاریخ کے اوراق میں زندہ رکھنے کو کافی ہے۔ جمیل جالبی کی ایک پہچان بطور مترجم بھی ہے

۔انہوں نے درج ذیل تراجم کیے۔

1-جانورستان (جارج آرول کی کتاب "دی اینمل فارم" کا ترجمہ)

2۔ایلیٹ کے مضامین۔

3۔ارسطو سے ایلیٹ تک۔

4۔برصغیر میں اسلامی جدیدیت (عزیز احمد کی کتاب کا ترجمہ)

Islamic Modernism in india and Pakistan (1857ء-1964ء)

5۔برصغیر میں اسلامی کلچر (عزیز احمد کی کتاب کا ترجمہ)

Islamic culture in Indian Environment.

اور دیگر تصانیف میں بچوں کے لیے قصے کہانیاں، حیرت ناک کہانیاں لکھیں۔ ایاز قادری نے سندھی زبان میں مذکورہ کتاب کا ترجمہ "حیرت ناک کہانیوں" کے نام سے کیا۔ پاکستان میں ذریعہ تعلیم کا مسئلہ، ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا۔ سرشار کے مزاحیہ کردار خوجی کی سرگزشت پر مبنی کہانی "نہ ہوئی قرولی" کے عنوان سے لکھی۔ جو ماہ نامہ "ہونہار" کراچی میں کامل القادری کے باہمی اشتراک سے قسط وار شائع ہوتی رہی۔ پاکستانی کلچر بہ اشتراک ایم ایچ صدیقی شائع ہوا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ایک ہمہ جہت اور کثیر الصلاحیت نابغہ روزگار تھے۔ ایک مؤرخ کے نزدیک ادبی تاریخ کسی بھی عہد کے ادب کے ارتقائی سفر کی روداد اور دستاویز ہے۔ ادب دراصل انسان کی

خواہشات،فکری رویوں، رنج والم،انبساط اور خیالات وتخلیقات کا عکاس گردانا جاتا ہے۔جب کہ تاریخ مذکورہ تمام لوازمات وتلازمات کو سیاسی،معاشرتی واقتصادی،جغرافیائی صورت حال اور مذہبی عناصر کے زیر اثر دیکھنے اور پرکھنے کا عمل ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک تاریخ ادب کی تعریف کچھ یوں ہے:

"ادب کی تاریخ وہ آئینہ ہے جس میں اس زبان اور اس زبان کے بولنے اور لکھنے والوں کی اجتماعی وتہذیبی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ادب میں سارے فکری،تہذیبی، سیاسی، معاشرتی اور لسانی عوامل ایک دوسرے میں پیوست ہوکر ایک وحدت ایک اکائی بنائے۔اور تاریخ ادب ان سارے اثرات و روایات،محرکات اور خیالات ورجحانات کا آئینہ ہوتی ہے۔"(14)

اس طرح ایڈسن لکھتا ہے:

It is a chronological account of the men who wrote ’‘
in these languages and the books they produced, with critical analysis of their merits and defects and some description of literary schools and traditions and of (15)’’fluctuation in fashions and taste.

جالبی صاحب وسیع المطالعہ تھے۔انہیں تاریخ کا گہرا شعور تھا۔تاریخ کے اصول پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تاریخ کا کام صرف یہ نہیں کہ واقعات وحقائق کا محض اندراج کردے۔بلکہ ضروری ہے کہ مختلف سروں کو باہمی ربط دے کہ ایک ایسی تنظیم میں لے آئے کہ یہ تصویر پڑھنے والے کے ذہن پر نقش ہوجائے اور ادب کا حقیقی،تاریخی ارتقاء بھی نظروں کے سامنے آجائے۔"(16)

یعنی تاریخ کے بیان میں ایک ربط،تسلسل اور تنظم ہونی چاہیئے تاکہ تاریخ ماضی بن جائے اور گزرے کل کی صورت میں عیاں ہوجائے۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"ایک ادبی محقق کا کام ماضی کے ذخائر کو دریافت کرنا ہے۔حقائق واقعات اور سوانحات کی صحت کو جانچنا ہے۔ماضی کے تسامحات کو دور کرنا ہے اور مختلف افراد سے منسوب غلط روایت کی تردید کرنا

اور تحقیقی کام میں درست حقائق کو سامنے لانا ہے۔"(17)

درج بالا رائے کی روشنی میں دیکھا جائے تو ادب کی تاریخ مرتب کرنے والے مصنف کی ذمہ داری بہت حد تک بڑھ جاتی ہے۔یعنی ایک طرف تو وہ قدیم ادبی متون کی فراہمی کا ذمہ دار ہوتا ہے اور دوسری طرف صحت، کتابت اور سند کا بھی ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔اگر تاریخ نویسی کے دوران میں واقعات کی صحت و تنظیم کا خیال ملحوظ خاطر نہ ہو تو ایسی تاریخ قابل قدر کسی صورت نہیں سمجھی جاتی۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ایک کہنہ مشق مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ قاری بھی ثابت ہوئے ہیں۔ انہوں نے چہارسو عمیق گہرائی سے گیرائی کا جائزہ لیتے ہوئے ادب کی کم و بیش تمام جہتوں میں قلمی جوہر دکھاتے ہوئے ادبی سرمایہ میں ناقابل فراموش اضافہ کیا ہے۔ جالبی صاحب تاریخ نویسی کے فن سے شناسا ہوئے۔اصول وضوابط متعین کیے۔ادب کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے ادوار اور اصناف سے متعلق کس حد تک معلومات ہونی چاہیئے۔جس سے مصنف استفادہ کرسکتا ہے۔بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

"ادوار کی زمانی تقسیم کے ساتھ روایت کی تشکیل و تعمیر اور ردعمل و تبدیلی کو بنیادی طور پر سامنے رکھا جائے تاکہ زمانی ترتیب، روایت کا سفر اور روح ادب بیک وقت سامنے آجائیں۔"(18)

جالبی صاحب نے ان تمام امور کی نہ صرف نشاندہی کی جن سے ایک مؤرخ کو تاریخ نویسی کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ بلکہ انہوں نے "تاریخ ادب اردو" کی چار جلدیں لکھ کر اس کا عملی مظاہرہ کر دکھایا۔تحقیق کی دنیا میں ایک اہم نام ڈاکٹر گیان چند جین نے ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ نویسی کے فن کے حوالے سے لکھا ہے۔

"ادبی تاریخ کے ابتدائی دور میں جہاں مختلف ادوار کی لسانی خصوصیات شمار کرانے کو کافی سمجھا جاتا تھا۔بعد میں تحقیقی پہلو کے علاوہ تخلیقات کا تاریخی تہذیبی پس منظر میں بھی مطالعہ کیا گیا۔اور سب سے زیادہ ادب اور کلچر کے باہمی ردعمل پر زور دیا گیا۔آب حیات سے رام بابو سکسینہ کی تاریخ تک ارتقاء کی ایک بڑی جیت ہے اور رام بابو سکسینہ سے جمیل جالبی تک دوسری، جنہوں نے ادوار کی بجائے روایات کا دامن پکڑ کر تاریخ کا بیان کیا۔"(19)

جالبی صاحب ادب اور سماج کے باہمی تعلق سے بخوبی آگاہ ہیں۔ادب کو جہاں معاشرے اور تہذیب کا عکاس اور ترجمان قرار دیتے ہیں۔وہاں تاریخ نویسی میں تحقیق کی اہمیت پر بھی زور دیتے

دکھائی دیتے ہیں۔ان کے مطابق تحقیق کے بغیر تاریخ اور تاریخ ادب کی چنداں اہمیت نہیں۔آپ تحقیق اور تنقیدی شعور کی دولت سے مالا مال تھے۔جو کسی بھی ادیب کے ادبی مقام و مرتبہ کے تعین کی امتیازی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔جالبی کی تاریخ ادب اردو جلد اول جولائی 1975ء میں پہلی مرتبہ سامنے آئی۔ جلد اول اردو زبان و ادب کے آغاز سے لے کر 1975ء تک کے دور کا جائزہ پیش کرتی ہے۔یہ چھ فصلوں پر محیط ہیہر فصل میں ابواب کی تعداد مختلف ہے۔جالبی صاحب نے آغاز حسب روایت تمہید سے کرتے ہوئے اردو زبان کی ابتداء اور نشو ونما کے حوالے سے مختلف نظریات اور زبان کے پھیلاؤ میں سماجی اور سیاسی عوامل بیان کیے ہیں۔بقول جمیل جالبی:

"پنجاب اور اہل پنجاب سے اس زبان کا رشتہ ناتا روز اول ہی سے قائم ہے اور اہل پنجاب ُنے شروع ہی سے اس زبان کو بنانیسوارنے میں حصہ لیا۔وہ زبان وہ جو عبوری دور میں دہلی سے دکن، گجرات، مالوہ اور دوسرے صوبوں میں پہنچی۔اس کی ساخت اس کے مزاج، لہجے اور آہنگ پر پنجاب ہی کا اثر سب سے زیادہ اور گہرا تھا۔"(جلد اول ص22)

اس بارے میں جالبی نے قدیم اردو ادب کا گہرا تاریخی حوالے سے مطالعہ پیش کیا ہے۔ دوسرے باب کا عنوان "بابر سے شاہجہان" تک ہے جو 1525ء سے 1657ء تک کے دور پر مشتمل تقریباً سوا سو سال کے ان سیاسی، تہذیبی، سماجی اور لسانی اثرات کا جائزہ پیش کیا ہے۔جو اردو زبان و ادب کے ارتقاء پر اثر انداز ہوا ہے۔جالبی صاحب نے محقق کے ساتھ ساتھ مدون کے فرائض بھی نبھائے ہیں۔

تدوین عربی زبان کا لفظ ہے۔فارسی زبان میں تدوین کے معنی گرد آوردن، فراہم آوردن، تالیف کردن، تالیف درج ہیں۔

"فرہنگ عامرہ میں تدوین کے جو معانی دیے گئے ہیں ان میں جمع کرنا، تالیف کرنا شامل ہیں۔"(19)

اردو لغت میں تدوین کے معنی جمع و ترتیب، تالیف اور تحریر کے ہیں۔ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق:

"اردو میں تدوین متن کی حد تک ہم متن اس تحریر کو کہہ سکتے ہیں جسے کوئی محقق ترتیب دینا چاہتا

ہے۔ وہ تخلیق،نظم ونثر ہو یا غیر تخلیقی تذکرہ یا انشا کی دریائے لطافت یا گل کرسٹ کا رسالہ، قواعد وغیرہ۔تدوین متن مختلف نسخوں، شاذ وحید نسخے کا مطالعہ کر کے مصنف کے اصل متن کی بازتشکیل کرنے کو کہتے ہیں۔"(20)

تدوین دراصل تحقیق ہی کی ایک شاخ ہے تدوین متن کے لیے مدون کے لیے لازم ہے کہ وہ تحقیقی وتنقیدی شعور سے کام لیتے ہوئے متن کو ترتیب دے۔تدوین متن اور ترتیب متن کا تعلق گیان چندجین کی رائے کی روشنی میں لکھتے ہیں:

"اردو میں تدوین متن سے زیادہ مقبول اصطلاح ترتیب متن ہے۔دونوں قریب المعنی ہیں۔ ترتیب کے معنی کسی شے کے اجزاء کو مناسب تقویم وتاخیر سے رکھنا ہے۔تدوین کے معنی متفرق اجزا کو اکھٹا کر کے ان کی شیرازہ بندی کرنا ہے۔شعراء کے مجموعہ کلام کو اسی لیے دیوان کہا گیا کہ ان میں غزلیں اور نظمیں جمع کی جاتی ہیں۔ترتیب ایک عام لفظ ہے اور تدوین کا تعلق کتابوں سے ہے۔اس لیے اس اصطلاح کو ترجیح ہے۔"(20)

یعنی تدوین متن سادہ الفاظ میں متفرق اجزا کو ایک جگہ براہ راست یکجا کر دینا ہے جب کہ ترتیب متن میں مدون اپنی مرضی سے تقویم وتاخیر اور ترتیب میں ردوبدل کر سکتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے جب تاریخ ادب اردو جلد اول تحریر کی تو اس دوران انہیں قدیم فنون سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ابتدائی شعری سرمایہ دستیاب ہوا اور پھر ابتدائی دور کے حوالے سے خاص طور پر دکنی ادب کے دیوان دستیاب ہوئے تو انہوں نے اس قدیم عہد کے تین اہم شعرائے ملک کے دواوین کی تدوین کی ان شعراء کے نام یہ ہے۔حسن شوقی،نصرتی اور نظامی۔

"دیوان حسن شوقی 1971ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان سے شائع ہوا۔اس سے پہلے مولوی عبدالحق نے 1929ء میں حسن شوقی کی دو مثنویات اور تین غزلیں شائع کیں۔"(20)

سخاوت مرزا نے 1956ء میں مزید تین غزلیں اور 1945ء میں حسینی شاہ پانچ غزلیں تلاش کر کے منظر عام پر لائے۔حسن شوقی کے اس کلام کی دریافت کی اور مزید اضافہ کرتے ہوئے جالبی صاحب لکھتے ہیں:

"قدیم ادب کا اس سے بڑا خزانہ پاکستان میں نہیں ہے اور بہت سے مخطوطات ایسے ہیں جن

کی اشاعت اردو ادب کی بنیادی ترقی اور ادبی تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کو ملانے کے لیے ضروری ہے۔ دیوان حسن شوقی اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے جس میں فتح نامہ نظام شاہ، میزبانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ کے علاوہ تین غزلیں، جو قدیم بیاضوں میں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں، شامل ہیں۔ چند غزلوں کو چھوڑ کر باقی سب چیزیں پہلی بار شائع ہو رہی ہیں۔"(21)

مختلف بیاضوں سے حسن شوقی کا کلام مجتمع کر کے جس انداز میں جالبی نے اپنے علمی مقدمے کے ساتھ پیش کیا ہے تو آپ کا طریق تحقیق و تدوین واضح ہو جاتا ہے۔ تدوین متن کے حوالے سے جالبی صاحب کا ایک اور اہم کارنامہ "دیوان نصرتی" کی ترتیب و تدوین ہے جو "دیوان حسن شوقی" کی اشاعت کے دوسرے ہی سال 1982ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ باقاعدہ اشاعت سے قبل اسے سہ ماہی صحیفہ لاہور سے 1972ء میں شائع کیا گیا۔ بعدازاں اسے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ نصرتی کے اس دیوان میں 23 غزلیں، 28 رباعیاں، 3 قطعے، 2 مخمس، ایک ہجو 550 اشعار کی ایک مثنوی جسے "تاریخ اسکندری" کہا جاتا ہیاور ایک قصیدہ شامل ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق:

" نصرتی کی تین تصانیف یادگار ہیں۔ ایک گلشن عشق (1068ء) دوسری علی نامہ (1076ء) اور تیسری دیوان نصرتی جس میں تاریخ سکندری یعنی فتح نامہ بہلول (1083ء) شامل ہیں۔"(22)

بہمنی دور کا پہلا شاعر فخر الدین نظامی اپنے عہد کا ایک باکمال شاعر تھا اور اپنے فن میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ جالبی ایک محقق تھے انہوں نے داخلی شواہد کی بنا پر مثنوی " کدم راؤ پدم راؤ" کے مصنف کا نام فخر الدین کی بجائے فخر دین تحریر کیا ہے۔ بقول جالبی:

" کدم راؤ پدم راؤ میں فارسی، عربی کے اثرات، لہجہ میں، اسلوب میں، ذخیرہ الفاظ میں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اس مثنوی میں تقریباً بارہ ہزار الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور ان میں صرف سوا سو الفاظ فارسی ہیں۔ ان میں بھی بہت سے الفاظ بگڑی ہوئے شکل میں آئے ہیں۔"(23)

مثنوی کی زبان گو کہ اردو کے قریب ترین ہے لیکن جالبی نے اس پر پنجابی، گجراتی، مرہٹی، سرائیکی اور سندھی زبان کے اثرات کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ یہ اردو زبان کی پہلی طبع زاد مثنوی ہے۔ یہ

اردو زبان کا قدیم ترین ادبی اور لسانی نمونہ ہے۔ مذکورہ مثنوی اردو زبان کے قدیم دکنی لہجے میں لکھی گئی۔اس کا قصہ تبدیلی قالب سے متعلق ہے۔ یہ تصور دراصل عقیدہ " تناسخ " سے جڑا ہوا ہے۔ راجہ کدم راؤ جب اکھر ناتھ یوگی سے اپنی روح کو دوسرے کے مردہ جسم میں منتقل کرنے کا منتر سیکھتا ہے تو اس کے نتیجے میں اسے بہت سی مشکلات، پریشانیوں اور مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس میں قدیم ہندوانہ عقیدے اور توہم پرستی کو بھی قصے کا جزو بنایا گیا ہے۔مثنوی کے مرتب جمیل جالبی نے مثنوی کا تعارف و تجزیہ کرتے ہوئے مفید معلومات فراہم کی ہیں۔

آزاد نظم کے بانیوں میں شمار ہونے والے ثنا اللہ ڈار عرف میراجی کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کے لیے انہوں نے میراجی کے مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ کلام کو یکجا کیا اور " کلیات میراجی " انہی کاوشوں کی اک کڑی ہے۔ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

" کلیات میراجی کی اشاعت سے پہلے میراجی کے پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ان کے نام یہ ہیں (1)۔میراجی کی نظمیں 1966ء، (2)۔میراجی کے گیت 1963ء، (3) گیت ہی گیت 1966ء، (4)۔تین رنگ 1967ء، پابند نظمیں 1928ء۔اس کے علاوہ ان کی کچھ نظمیں " نیا دور " کراچی میں بھی شائع ہوئی تھیں۔ عام رائے یہ تھی کہ ان کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام اختر الایمان کے ہاں محفوظ ہے۔اختر الایمان بھی اسے ایک مجموعے کی صورت میں مرتب کرنا چاہتے تھے۔لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔جمیل جالبی نے " کلیات میراجی " میں نہ صرف ان کے مطبوعہ کلام کو شامل کیا بلکہ اختر الایمان اور میراجی کے دوسرے دوستوں سے بھی جو کچھ دستیاب ہو سکا اسے ایک جگہ جمع کر دیا۔"(24)

" کلیات میراجی " کے حوالے سے جالبی صاحب کی کاوش بسلسلہ تحقیق نو آموز محققین کیلئے بہت سودمند ثابت ہو سکتی ہے۔آپ نے " کلیات میراجی " کی تدوین کے مراحل میں تدوین متن کے تمام تقاضوں کو بااحسن طریق نبھایا ہے۔ نہ صرف کلام کو یکجا کیا بلکہ ایک تنقیدی مقدمہ لکھ کر قاری کے ذہن کو وسعت بھی بخشی ہے۔اور ان کی شاعری پر جو ابہام کے الزام لگتے رہے ہیں انہیں بڑی حد تک دور کرنے میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔مختلف تنقیدی مضامین کو یکجا کر کے "ن-م راشد: ایک مطالعہ " کے نام سے کتاب مرتب کی جو آنے والے محققین اور ناقدین کے لیے نایاب تحفہ ہے۔اسی طرح "میراجی: ایک مطالعہ " کے نام سے بھی تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب مرتب کی۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے تدوین میں تخلیق،

تحقیق اور تنقید کے حسین امتزاج سے نہ صرف اردو زبان و ادب کے قدیم سرمائے کو تحفظ فراہم کیا بلکہ جدید اردو زبان و ادب کے لیے بھی راہیں ہموار کیں۔ گو کہ جالبی صاحب سے پہلے بھی قدیم متون کی دریافت اور تدوینی کاوشیں کامیاب ثابت ہوئیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی خدمات لائق تحسین ہیں لیکن ان کے تحقیقی و تدوینی متون پر صحت کے حوالے سے اعتراضات سامنے آتے رہے جب کہ جالبی صاحب درست معلومات کی فراہمی اور ترتیب متن کے عمومی اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے تدوینی خدمات مسلم انداز میں سرانجام دیتے دکھائی دیتے ہیں انہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نیدستیاب حقائق کو جانچ پرکھ کے بعد ردو قبولیت کا شرف بخشا اور کتب کی تدوین کے وقار میں اضافہ کیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی ماہر لسانیات اور لفظ شناس کے روپ میں بھی جلوہ گر دکھائی دیتے ہیں۔ لسانیات سے اپنی دلچسپی کا جواز پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"لسانیات سے بھی مجھے گہری دلچسپی ہے، اشتقاق کی تلاش میں ایک لطف آتا ہے، لفظوں کے معنی تلاش کرنے اور متعین کرنے میں مجھے ایک خاص کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔"(25)

جالبی کی مرتب کردہ پہلی لغت "قدیم اردو لغت" پہلی مرتبہ دسمبر 1977ء میں شائع ہوئی جسے مرکزی اردو بورڈ، لاہور کے پلیٹ فارم سے شائع کیا گیا۔ انتساب اپنے استاد محترم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب کے نام کیا۔ کتاب کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر اشفاق لکھتے ہیں:

"اس لغت کے مطالعے سے یہ بات بھی قاری کے سامنے آئے گی کہ ہمارے اسلاف لفظوں کو کس تلفظ سے ادا کرتے تھے؟ ان کی املاء کیا تھی؟ ان کے اصول وقواعد کیا تھے؟ اور پاکستان کی علاقائی زبانوں نے اردو زبان کی ابتدائی تشکیل میں کیا کردار ادا کیا تھا؟ آپ کو اس لغت میں قدیم اردو کے ہزاروں الفاظ ملیں گے جو آج بھی پاکستان کی علاقائی زبانوں میں زندہ ہیں اور ہمیں دعوت فکر دیتے ہیں۔"(26)

لغت کے طریقہ کار کے حوالے سے جالبی صاحب نے لغت کے "پیش لفظ" میں لغت مرتب کرنے کے طریقہ کار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جس سے قارئین، محققین اور لغت نویسوں کے لیے لغت کی تفہیم میں مدد ملے گی۔

جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

"اس لغت کو مرتب کرتے وقت میں نے حسب ضرورت مصدر، ماضی مطلق، مرکبات و مشتقات کی بیشتر شکلیں شامل کر دی ہیں۔ تا کہ قدیم ادب کے مطالعہ کرنے والے کو مصدر کی بدلی ہوئی شکل پہچاننے میں دقت نہ ہو۔ ساتھ ساتھ اگر ایک ہی لفظ مختلف املائی شکلوں میں ملا تو اس کی یہ شکلیں بھی شامل کر دی ہیں تا کہ پڑھنے والے کو کسی غلط فہمی یا الجھن کا شکار نہ ہونا پڑے۔ اس کے علاوہ اگر مختلف مآخذ سے ایک ہی لفظ کے مختلف معانی سامنے آئے ہیں تو ان سب معانی کو اسی لفظ کے تحت یکجا کر دیا ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس لغت میں الفاظ کے وہی معنی دیئے گئے ہیں جو قدیم دور میں رائج تھے۔ بہت سے الفاظ کے معنی ایسے ہوں گے جو آج کے معنی سے مختلف مثلاً بانگ کے معنی اذان، جنگی کے معنی سپاہی، البتہ کے معنی یقیناً، ضرور کے معنی بیشک، اڑانی کے معنی پنکھا، اُپرنی کے معنی دوپٹہ وغیرہ۔"(27)

پروفیسر وحید الدین سلیم کے مطابق: اصطلاحیں دراصل اشارے ہیں جو خیالات کے مجموعوں کی طرف ذہن کو منتقل کر دیتی ہیں۔ ایسے مخصوص الفاظ جن پر ماہرین علم و ادب اتفاق کر لیں اور وہ غیر زبان کے الفاظ متعلقہ زبان کا حصہ بن جائیں۔ اردو زبان ایک لچکدار زبان ہے جو اپنے اندر دوسری زبانوں کے الفاظ کو کسی مہربان میزبان کی مانند سمو لیتی ہے اور اتنی اپنائیت سے جزو بدن بناتی ہے کہ وہ الفاظ اردو زبان کا ہی حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ اردو میں اصطلاح سازی کی باقاعدہ کوششوں کا سراغ انیسویں صدی کے نصف اول میں ملتا ہے۔

جالبی صاحب نے فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ (جلد اول)، (جلد دوم) مرتب کی جسے ادارہ فروغ اردو اسلام آباد نے 1993ء میں شائع کیا، جالبی صاحب نے ابتدا میں "پیش لفظ" کے عنوان سے مقدمہ درج کیا ہے۔ اس مقدمے میں جالبی صاحب فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ جلد دوم کی غرض وغائیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"زوال حیدر آباد دکن کے بعد جب جامعہ عثمانیہ سے اُردو ذریعہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوا تو اصطلاح سازی کا عمل بھی رک گیا۔ دارالترجمہ کی عمارت کو آگ لگ گئی اور کم وبیش سارا خیرہ نذر آتش ہو گیا۔ جو بچا اسے 1968ء میں آصف ثامن نواب میر، برکت علی مرکم جاہ بہادر کے حوالے کر دیا گیا۔ آج برصغیر میں ایک بھی کتب خانہ ایسا موجود نہیں ہے جہاں یہ سب ذخیرہ موجود ہو۔ اس لیے

میری دلی خواہش تھی کہ اس سے پہلے کہ ان کتابوں کا حصول مشکل یا ناممکن ہو جائے، اصطلاحات کے اس عظیم ذخیرے کو محفوظ کر دیا جائے۔ فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ کی یہ دونوں جلدیں اسی خواہش کا نتیجہ ہیں۔ اب اہل علم اصطلاحات کے مطالعے اور رد و قبول کے عمل سے اصطلاح سازی کی اس عظیم روایت کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔"(28)

مذکورہ لغت آپ کا ایسا شاندار کارنامہ ہے جس کی ضرورت و اہمیت وقت کے ساتھ ساتھ روز افزوں بڑھتی جا رہی ہے۔ لغت نویسی ایک مشکل فن ہے لیکن ذولسانی لغت کو مرتب کرنا اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ عمل ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اردو میں ذولسانی لغات کی تدوین کی روایت کم و بیش چار سال سے زیادہ پرانی ہے۔ 1595ء میں ایک پرتگالی نے پہلا انگریزی لغت مرتب کیا۔ بعد ازاں برصغیر پر انگریزی کے دور اقتدار میں بہت سے ذولسانی لغات مرتب کیئے گئے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ لغات دور جدید کے علمی، فکری، معاشی و معاشرتی شعبوں میں ترقی کرنے کے لیے قاصر رہیں۔ ذولسانی لغات مرتب کرنے کے لیے لغت نویس کے لیے کم سے کم دو زبانوں کا گہرا علم ہونا لازم ہے۔ جالبی نے یہ لغت جدید ترین سائنسی، معاشی، معاشرتی، فکری، ادبی، علمی اور ثقافتی ضروریات کے تحت تخلیق کی ہے جالبی صاحب" قومی انگریزی اُردو لغت "اور دیگر لغات کے درمیان حد فاصل کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس لغت میں اردو زبان کے لسانی مزاج کے مختلف رنگوں اور خوشبوؤں کو ملا کر نئے مفاہم نئے معانی اور ان کے لیئے رخوں کو ایک واضح صورت دینے کی کوشش کی گئی ہے اظہار بیان کے نئے پیرائے زبان میں داخل کر دیے گئے ہیں اس لغت میں آپ کو اردو زبان بدلتی، نئے شعور، نئے تصورات اور نئے مفاہیم کو سلیقے سے ادا کرتی محسوس ہو گی۔"(29)

ڈاکٹر جمیل جالبی بلاشبہ اردو زبان و ادب کے ایک دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ انفرادی شعور اور فکر سے مرصع تھے۔ ان کے تنقیدی نظریات انفرادیت کے حامل تھے انہوں نے" پاکستانی کلچر: قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ " لکھ کر عملی تنقید کے در وا کیے۔ یہ کتاب 1966ء میں سب سے پہلے لاہور سے زور طبع ہوئی۔ بعد میں اس کتاب کا انگریزی ترجمہ نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد سے شائع ہوا۔ جب کہ 1987ء میں ڈاکٹر ایاز قادری نے سندھی زبان میں اسے ترجمہ کر کے متعارف کروایا۔ قیام پاکستان کے بعد تنقیدی مباحث کے حوالے سے اسے سب سے پہلی کتاب ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

اس کتاب کی تکمیل میں ساڑھے تین سال کا عرصہ لگا۔ جالبی صاحب کی اس تخلیقی سرمایہ کے بعد پاکستانی کلچر پر مباحث کا آغاز ہوا۔ مقدمہ شعروشاعری کو اردو کی پہلی تنقیدی کتاب کہا جاتا ہے۔ جو حالی کا شاہکار ہے۔ اسی طرح تنقید اور تجربہ جالبی صاحب کی پہلی باقاعدہ تنقیدی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ 1967ء میں شائع ہوئی۔ نئی تنقید کے نام سے جالبی صاحب کے فکری اور تنقیدی مضامین پر مبنی یہ کتاب 1985ء میں پاکستان نیشنل اکادمی کی معاونت سے شائع کی گئی۔ اس کتاب کے بارے میں جالبی صاحب لکھتے ہیں:

"اس مجموعے میں میں نے کلچر کی سطح پر فکر و ادب کے امتزاج اور نئی تنقید اور نئے ادب کے لیے نئے نئے پیمانے اور نئے معیار تلاش کرنے کی کوشش ہے۔ اس دور میں جب ہماری تہذیب پارہ پارہ ہو کر بے سمتی کا شکار ہو گئی ہے اور ہم فکری تہذیبی اور تخلیقی سطح پر گہرے بحران میں مبتلا ہیں۔ ہمیں اپنی شناخت کے لیے فکری تہذیبی، تخلیقی تنقیدی بلکہ زندگی کی ہر سطح پر امتزاج کی ضرورت ہے۔"(30)

ہمارے یہاں ادب کے حوالے سے بحرانی کیفیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ مولانا الطاف حسین حالی سے لے کر آج تک ہم نے اپنے ادب کو مغرب کے اصولوں کے تحت پرکھا ہے۔ ہمارے سامنے تہذیب وتمدن، کلچر، ادب اور لباس ہر ہر انداز میں مغرب ہی پیمانہ ہے، معیار ہے۔ ہم میں احساس کمتری کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ اس بحران سے نکلنے کے لیے ہمیں اپنی تہذیب کے معیار کو پرکھنے اور بہتر بناتے ہوئے تخلیقی وفکری شعور کے امتزاج کو بروئے کار لا کر جالبی صاحب کے تنقیدی تصورات کو سمجھنا ہوگا۔ تا کہ ہم اس سے کما حقہ فائدہ اٹھا سکیں۔ اپنی تنقید نگاری کے حوالے سے جالبی صاحب رقم طراز ہیں:

"جب میں نے تنقید نگاری کا آغاز کیا تو ایک طرف ان لوگوں کو پڑھا جو بڑی تنقید لکھ رہے تھے جیسے ٹی ایس ایلیٹ، آئی اے رچرڈ، سی ڈے لیوس، ہربرٹ ریڈ وغیرہ، ساتھ ہی اپنے اردو لکھنے والے جیسے مجنوں گورکھ پوری، نیاز فتح پوری، فراق گورکھ پوری، احتشام حسین، اختر حسین رائیپوری، حسن عسکری وغیرہ کو بھی ذوق وشوق سے پڑھا۔ ساتھ ہی شبلی، حالی اور آزاد کا بھی مطالعہ کیا۔ جہاں تک ان نقادوں کے اثرات کا تعلق ہے تو میں نے ان کا اثر قبول کیا۔ مگر

اس حد تک جتنا وہ میری طبعیت سے مناسبت رکھتے تھے۔ ایلیٹ مجھے سب سے زیادہ پسند

تھا۔ پھر اثرات کی بات یہ ہے کہ اگر خود آدمی کا تخلیقی وفکری سفر جاری رہے تو ہر پل ہر لمحہ بدلتے رہتے ہیں ایسے میں کسی ایک ادبی شخصیت کا اثر ذہن پر قائم ودائم نہیں رہتا یہ تو اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب ذہن کا سفر رک جائے ایسے میں منظر بھی ٹھہر جاتا ہے۔ اثر کی بات دو اور دو چار کی نہیں ہوتی بلکہ ذہن میں اپنا رنگ چھوڑتے ہیں اور یہ رنگ دوسرے رنگوں اور خود لکھنے والے، سوچنے والے کے ذہن کے رنگ کے ساتھ مل کر ایک نیا رنگ، ایک نیا روپ بنالیتا ہے اسی سے امتزاج پیدا ہوتا ہے۔"(32)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جالبی صاحب کو مشرق اور مغرب کے ادب سے کتنا گہرا شغف اور وابستگی تھی۔ اور انہوں نے ان کا اثر قبول کیا اور اعتراف بھی کیا ہے۔

جالبی صاحب نے متزاجی تنقید کی ضرورت اور اہمیت پر ہی زور دیا ہے۔ امتزاجی تنقید میں بے باکی اور جرات مندانہ رویہ اختیار کرنا ہی اس کا مقصد اور مدعا ہے۔ لہذا تنقید میں کلچر کے امتزاج کی اہمیت کے پیش نظر جالبی صاحب رقم طراز ہیں:

" کلچر کی سطح پر ہی تنقید میں بیک وقت سماجی، نفسیاتی، جمالیاتی، روائتی، فکری اور تخلیقی اقدار کا امتزاج ہوتا ہے اور ہوسکتا ہے اس سے ادب اور ادب پارے کی وضاحت بھی ہوسکتی ہے۔ اور اس کی قدر و قیمت کا تعین بھی ہوسکتا ہے۔ یہی تنقید کی تخلیقی سطح ہے اور ہی تنقید کا منصب ہے۔"(33)

جمیل جالبی صاحب چونکہ محکمہ انکم ٹیکس میں ملازمت کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنے متعدد مضامین میں ایک مفکر کے طور پر معاشرتی مسائل کو نہ صرف اجاگر کیا بلکہ ان سے نمٹنے کا حل بھی بتاتے نظر آتے ہیں۔

کسی تحریر یا تصنیف و تالیف کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل ترجمہ کہلاتا ہے۔ بقول نثار احمد قریشی:

" کسی مصنف کے خیالات کو لیا جائے، ان کو اپنی زبان کا لباس پہنایا جائے۔ ان کو اپنے الفاظ ومحاورات کے سانچے میں ڈھالا جائے اور اپنی قوم کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جائے کہ ترجمے اور تالیف میں کچھ فرق محسوس نہ ہو۔"(34)

ڈاکٹر حامد بیگ کے مطابق:

" کسی تحریر، تصنیف یا تالیف کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل ترجمہ کہلاتا ہے۔"

(35)

درج بالا تعریفات کی روشنی میں ترجمہ ایک ایسا عمل ہے جس سے گزر کر ایک زبان کا سرمایہ الفاظ و خیالات دوسری زبان میں مدغم ہوتے ہیں۔ اور مترجم دونوں زبانوں کے درمیان ایک حفاظتی پل کا سا مقام رکھتا ہے۔ جالبی صاحب نے بحیثیت مترجم بھی اردو ادب کی خدمت کی ہے آپ بھی ترجمہ نگاری کو نہ صرف ایک فن بلکہ ایک وسیلہ سمجھتے تھے کہ جس سے قوم کے خیالات، معلومات اور جذبات و احساسات کا ذخیرہ الفاظ کے ذریعے دوسری قوم تک منتقل کیا جاتا ہے۔

جالبی صاحب نے ایلیٹ کے مضامین پر مبنی کتاب پہلی مرتبہ اردو اکیڈمی سندھ سے 1959ء میں شائع کی بعد ازاں 1971ء میں مذکورہ کتاب نظر ثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن کے ساتھ رائٹرز بک کلب سے شائع ہوئی۔ ٹی ایس ایلیٹ کے حوالے سے اپنی پسندیدگی اور ایلیٹ کے اثرات قبول کرنے کے حوالے سے جالبی صاحب لکھتے ہیں:

"ان ترجموں سے میں نے اپنے ذہن کی تعمیر کا کام لیا ہے۔ یہ ترجمہ دراصل میرے لیے ریاض کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کے ذریعے میں نے ایلیٹ کی فکر اور اس کے طرز ادا کو اپنے مزاج میں سمونے کی کوشش کی ہے۔"(36)

مستند ترجمہ، اچھے ترجمے کی خصوصیات، مترجم کے فرائض و اوصاف سے متعلق جالبی صاحب کی سوچ اور فکر و تنقیدی شعور کو واضح سمت ملتی ہے کیونکہ ترجمہ جب ایک زبان کے قالب سے دوسری زبان کے قالب میں ڈھلتا ہے تو وہ محض ترجمہ اور لفاظی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ وہ ایک پورے معاشرے اور حالات و واقعات کی تہذیبی، ثقافتی، معاشی اور اخلاقی تصویر ہوتی ہے۔ مترجم کا یہ فرض ہے کہ ترجمہ اصل متن کے مطابق بھی ہو اور اس میں مصنف کا ذاتی اسلوب بھی جھلکتا ہو۔ بلاشبہ جالبی صاحب ایک محقق اور ادبی سائنس دان کی حیثیت سے ادب کی جملہ اصناف میں کامیاب تجربات کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُنہوں نے ایلیٹ کے مضامین، ارسطو سے ایلیٹ تک، برصغیر میں اسلامی جدیدیت اور برصغیر میں اسلامی کلچر جیسی اہم کتب سے اردو ادب کا کینوس مزین کر دیا جو ادبی سرمائے میں اضافہ کا باعث بنیں۔

ڈاکٹر احسن فاروقی "ایلیٹ کے مضامین" کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحسین میں

لکھتے ہیں کہ:

"ایلیٹ تنقید کی ایک سطح ہے جس تک ہمارے نقادوں میں وہی پہنچ سکے ہیں اور ان کا ترجمہ اتنا قدرتی، رواں اور انفرادی ہے کہ اسے اصل تصنیف کہنا چاہیئے ۔ پڑھنے والوں کو جدید ترین تنقید کی سطح پر ہونے میں پوری مدد کرتا ہے۔اور اس سطح پر جو مسائل سامنے آتے ہیں ان پر فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر ہر ادبی اور تنقیدی مسئلے پر نہ صرف ضروری معلومات سامنے آتی ہیں بلکہ ان پر ایک زاویہ نظر بھی ملتا ہے۔ جو پڑھنے والے کی نظر کو متاثر ضرور کرتا ہے۔اسی طرح تنقیدی شعور پیدا کرنے میں یہ تصنیف ایک خاص درس بہم پہنچاتی ہے۔"(37)

جالبی صاحب کی ترجمہ شدہ دوسری کتاب کا موضوع "ارسطو سے ایلیٹ تک" ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ 1975ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن نے شائع کی اس کتاب کے کم وبیش آٹھ ایڈیشن مختلف اداروں نے شائع کیے۔ پروفیسر نظیر صدیقی مذکورہ کتاب کی اہمیت کے پیش نظر رائے دیتے ہیں:

"ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب "ارسطو سے ایلیٹ تک" اپنے تراجم اور مغربی نقادوں کے تنقیدی تعارف کی بنیاد پر اردو کی تنقیدی کوششوں میں قدر اول کی چیز ہے۔تنقید کا طالب علم اردو میں جتنا کچھ اس کتاب سے سیکھ سکتا ہے اتنا کسی اور کتاب سے نہیں سیکھ سکتا۔ یہ کتاب نہ صرف مغرب کے تنقیدی نظریات سے بھرپور واقفیت بہم پہنچاتی ہے بلکہ مغربی تنقید کے بنیادی مسائل سے بھی آشنا کرتی ہے۔"(38)

جالبی صاحب کی ایک اہم تخلیق "برصغیر میں اسلامی جدیدیت" کے نام سے منظر عام پر آئی ہے جو کہ عزیز احمد کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ پہلی بار 1969ء میں چھپی ڈاکٹر عزیز احمد اپنی زندگی میں دلی خواہش کا اظہار کر چکے تھے کہ ان کی اس کتاب کا ترجمہ ہونا چاہیئے ۔زندگی نے وفا نہ کی اور ان کے انتقال کے بعد جمیل جالبی نے ان کی دونوں کتب برصغیر میں اسلامی کلچر اور برصغیر میں اسلامی جدیدیت کے مسودے تیار کیے۔ان تراجم کے حوالے سے جالبی صاحب لکھتے ہیں:

"ہمیں ذہنی،فکری سطح پر اپنے زندہ مسائل کے حوالے سے ایسی کتابوں اور ایسے ہی مطالعوں کی ضرورت ہے تا کہ ہم زندگی اور معاشرے کو آگے بڑھنے والی سوچ کی طرف مائل کر سکیں۔اور فکر نو کا سورج، بادلوں کی اوٹ سے طلوع ہو سکے۔آپ اس کتاب سے اتفاق کریں یا اختلاف، اپنی موجودہ صورت حال کا جائزہ لینے کی طرف مائل ضرور کرتی ہے۔"(39)

عزیز احمد کی کتاب

"Islamic modernism in India and Pakistan"

کو "برصغیر میں اسلامی جدیدیت" کے عنوان سے ترجمہ کیا۔1989ء میں اسے ادارہ ثقافت اسلامیہ نے شائع کیا۔ جب کہ بھارت سے یہ کتاب "ہندو پاک میں اسلامی جدیدیت" کے عنوان سے دہلی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس سے 1990ء میں چھپی۔

پروفیسر عقیل احمد "برصغیر میں اسلامی جدیدیت" میں جالبی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں: "عزیز احمد نے اس تصنیف میں 1857ء کے بعد تمام اہم مفکرین کے مذہبی اور سیاسی افکار کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔اور اس موضوع سے دل چسپی لینے والوں کے لیے اس عہد کے برعظیم کی اسلامی فکر کا تجزیہ اہمیت کا حامل ہے۔افکار و خیالات کا مطالعہ براہ راست اور اصل بنیادی مآخذ کے ذریعے کیا ہے۔اور موضوع بحث سے متعلق تمام متعلقہ امدادی مآخذ پیش نظر رکھے ہیں۔افسوس کسی اور پاکستانی مصنف نے اس موضوع کا خصوصی مستقل مطالعہ نہیں کیا۔"(40)

ڈاکٹر جمیل جالبی ترجمے کے فن سے بھی بڑی کامیابی کے ساتھ نبرد آزما ہو کر سامنے آئے ہیں۔ترجمہ ایک تخلیقی عمل ہے تو ترجمہ نگاری بھی تخلیقیت کے تقاضے پورے کر کے ہی معراج کو پہنچتی ہے۔اور مترجم کی ذات تخلیق کاری کے ساتھ ساتھ اپنے انفرادی اسلوب کے زیر سایہ فن پارے کی وقعت وعظمت میں اضافہ کرتی ہے۔آپ ذولسانی الفاظ وتراکیب اور تراجم کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگاری میں مصنف کے لہجے، اسلوب بیان کو اہم عناصر گردانتے ہیں۔لہذا جالبی صاحب کی تحاریر ہمارے سامنے تخلیق نو کی صورت جلوہ گر ہوتی ہیں اور قاری تخلیق کے داخلی وخارجی پہلوؤں کے سنگ سنگ سفر کرتے ہوئے مشرقی ومغربی تہذیب اور زبان و بیان کے چٹخارے لینے لگتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے تراجم مغربی تنقیدی نظریات کو اردو ادب میں متعارف کروانے کے لیے کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔اور مذکورہ کتب کے تراجم جالبی صاحب کے ترجمہ نگاری کے نظریات کی عملی ونظری صورتیں ہیں۔پروفیسر سجاد لکھتے ہیں:

"ترجمے سے اعلیٰ قسم وہ ہے جسے تخلیقی ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔یہ دراصل ایک زبان میں کہی گئی بات کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنے کا نام ہے کہ ترجمہ "تخلیق نو" کی صورت اختیار کرے۔ اردو میں اس روایت کو فروغ دینے والے مترجمین میں محمد حسن عسکری ایک خصوصی اہمیت کے حامل

مترجم تھے۔ مادام بواری اور گڈبائی ٹو برسن میں عسکری نے نہایت عمدگی سے مغربی ادب کے ان شاہکار وں کی اردو میں "تخلیق نو" کا قابل ستائش اور لائق تقلید کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ جالبی صاحب نے اپنے ترجموں کے ذریعے عسکری کی اس روایت میں اضافہ کیا ہے۔"(41)

ڈاکٹر جمیل جالبی کا شمار ایسے ادبا اور دانشوروں میں ہوتا ہے جو نونہالوں کو ملک وقوم کا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ جیسے تناور درخت کے لیے اچھے بیج کا بونا بہت ضروری ہے۔ اسی طرح ننھے بچوں کی ذہنی پرورش اور ذہنی آسودگی کے لیے نصیحت اور سبق آموز ادب کی تخلیق بھی ناگزیر سمجھی جاتی ہے۔ تاکہ درست سمت میں بچوں کی راہنمائی کی جا سکے۔ جالبی صاحب نے اردو زبان و ادب کی تاریخ اور دیگر تنقیدی کتب کی تخلیق سے اردو زبان و ادب کے حوالے سے عظیم خدمات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ بہت مصروفیت میں بھی بچوں کے ادب کے لیے وقت نکالا۔ بچوں کی دلچسپی کیمطابق ادب کی تخلیق مشکل ہے بلکہ موضوعات کا انتخاب اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے لیکن جالبی صاحب نے یہ کارنامہ بھی بالآخر سر انجام دے دیا اور ان کی کہانیاں" بلیاں" کے عنوان سے مولانا رزاق الخیری کے رسالے "بنات" میں شائع ہوتی رہیں۔ اور پھر "حیرت ناک کہانیاں " کے عنوان سے ایک طویل قصہ نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی 1983ء میں شائع کیا بچوں کے لیے جالبی صاحب نے جارج آرول کے ناول کا ترجمہ "جانور ستان" کے نام سے کیا۔ جسے مکتبہ نیا دور کراچی نے 1958ء میں شائع کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو ادب کا پہلا مزاحیہ ناول "فسانہ آزاد" کے مزاحیہ کردار "خوجی" سے بچوں کو متعارف کروانے کا سہرا بھی جالبی صاحب کے سر ہے۔ "خوجی پر کیا گزری" شروع کیا اور اسی سلسلے کا ذیلی عنوان "نہ ہوئی قرولی" کو بنایا گیا۔ جالبی صاحب نے بچوں کی ذہنی استعداد، عمر، دلچسپی اور رجحانات کے مطابق ادب تخلیق کیا۔ بچے مافوق الفطرت عناصر میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اس لیے انہوں نے مافوق الفطرت عناصر کے ساتھ ساتھ جانوروں کو کرداروں کی صورت میں پیش کر کے تربیتی کہانیاں تخلیق کیں۔ جن کا مقصد بچوں کی ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی تربیت کرنا تھا۔ ڈاکٹر محمود الرحمٰن جمیل جالبی کے اسلوب کے متعلق رائے دیتے ہیں:

"وہ نہ کہیں ثقیل الفاظ استعمال کرتے ہیں، نہ ہی محاورات کی بھرمار کرتے ہیں، نہ طویل جملہ لکھنے کے عادی ہیں اور نہ ہی عبارت کو گنجلک کر دینے کے خوگر ہیں۔ وہ بچہ بن کر بچوں کی زبان

بولتے ہیں۔ سیدھے سادے انداز میں اس طرح کہانی بیان کرتے ہیں جو ننھے دلوں میں اتر تی چلی جاتی تھے۔ پڑھنے والے بچوں کو اس　　کا ذرا سا بھی شائبہ پیدا نہیں ہوتا۔ کہ ان سے مخاطب ایک ایسا شخص ہے جو اپنے وسعت معلومات اور بلند فہم ادراک کی بدولت پورے برصغیر میں ایک قدآور　ادیب اور محقق کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے۔"(42)

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ محمد جمیل خان جنہیں ادبی دنیا ڈاکٹر جمیل جالبی کے نام سے جانتی　اور پہچانتی ہے۔ مشہور صحافی سید جالب دہلوی کی غیر معمولی شہرت کے باعث انہیں اپنا آئیڈیل تصور کرتے تھے۔ اسی نسبت سے جالبی لکھنے لگے اور یہی نام وجہ تسمیہ بن گیا۔ اردو زبان وادب سے عشق کو ایک فرض عبادت کی مانند نبھایا۔ اجتماعی کاوشوں کو انفرادی کاوش پر موقوف کرتے ہوئے جوئے شیر لانے کے مترادف ادبی وتخلیقی سرگرمیوں میں محنت　شاقہ سے کام لے کر اردو زبان وادب کی بیش بہا خدمت کی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی　کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں "ہلال امتیاز"، "ستارہ امتیاز"، "مولوی عبدالحق ایوارڈ ا" ور اردو ادب کا سب سے بڑا ایوارڈ " کمال فن ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ آپ　ایک کثیر الجہات شخصیت　تھے۔ اردو ادب کی تمام اصناف میں ان کی سنجیدہ علم ودوستی کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اردو ادب کے ارتقاء میں نہ صرف ایک　مشعل　بردار کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ اردو زبان و ادب کے محسن ہیں۔ جن پر اردو ادب کی تاریخ ہمیشہ نازاں رہے گی۔ اور جالبی صاحب اپنی نادر و نایاب تخلیقی خدمات کی　بدولت　تا ابد اردو ادب کے ماتھے کا جھومر بن کر　چمکتے رہیں گے۔

میر تقی میر نے کیا خوب کہا ہے:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں

تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

☆☆☆

حوالہ جات

1۔" کچھ جمیل جالبی کے بارے میں"، از مشرف احمد، مشمولہ، "ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ"، مرتبہ گوہر نوشاہی، دہلی، ایجوکیشنل　پبلشنگ ہاؤس، باراوّل، 1993ء، ص18

2۔" کچھ جمیل جالبی کے بارے میں"، از ڈاکٹر خلیق انجم، مشمولہ، "ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ"، مرتبہ

گوہر نوشاہی، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، باراوّل، 1993ء،ص19

3۔انٹرویو، ڈاکٹر جمیل جالبی سے گفتگو، ڈاکٹر مشرف احمد، مشمولہ، سہ ماہی "ارمغان، (جمیل جالبی نمبر) " کراچی، اپریل، مئی، جون 1996ء، ص154۔

4۔سہ ماہی "سفیر اردو (جمیل جالبی نمبر)" لیوٹن: اکتوبر نومبر دسمبر (یو کے)، 2004،ص6

5۔عبدالعزیز ساحر، ڈاکٹر، "ڈاکٹر جمیل جالبی: شخصیت اور فن"، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان 2007ء،ص13

6۔سہ ماہی "ارمغان"، ایضاً،ص168

7۔ایضاً،ص168

8۔نذر الحسن صدیقی، "روشنی سراپا"، مشمولہ، "ارمغان"، ایضاً،ص 31۔30

9۔مشرف احمد، ڈاکٹر، "جالبی صاحب"، مشمولہ، "ارمغان"، ایضاً،ص55

10۔شاہد احمد دہلوی، "جمیل جالبی"، مشمولہ، "ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ"، ایضاً،ص77،78

11۔انور عالم صدیقی، "میرا اہم جماعت"، مشمولہ، "ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ"، ایضاً،ص46،47

12۔بیگم نسیم شاہین، "ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے گھر میں"، مشمولہ، "ڈاکٹر جمیل جالبی: ایک مطالعہ، ایضاً،ص 149

13-انٹرویو محترمہ رضوانہ نسیم صاحبہ، بمقام، اردو ڈکشنری بورڈ کراچی، بتاریخ 3 اکتوبر، 2007ء

4 1-جمیل جالبی، ڈاکٹر، ' 'تاریخ ادب اردو ' '، (جلد دوم)، طباعت ششم، مجلس ترقی ادب، لاہور 2009ء،ص11-12

An Introduction to the study of ''William Henery Hydsan,-15 literature.2nd edition,George G.Hamp Co.P.36

6 1-جمیل جالبی، ڈاکٹر، ' 'تاریخ ادب اُردو ' '، (جلد دوم)، لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع سوم، 1994ء،ص12

17-تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، "تاریخ ادب اُردو" (ابتدا سے 1857 تک)، ایضاً،ص11

18-جمیل جالبی، ڈاکٹر، "تاریخ ادب اردو"، (جلد دوم)، ایضاً،ص13

19-سیدہ جعفر،گیان چند جین،ڈاکٹر، ' 'اُردو کی ادبی تاریخیں ' '،انجمن ترقی اُردو، پاکستان،2000ء،ص21

20-"فرہنگ عامرہ"(عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کی لغت)،محمد عبداللہ خان خویشگی

21-"اُردو لغت"،اُردو ڈکشنری بورڈ کراچی، جلد پنجم

22-گیان چند جین،ڈاکٹر،"تحقیق کا فن"،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،2002ء،ص398

23-ایضًا

24-"دیوان حسن شوقی"،مرتبہ،جمیل جالبی،ایضًا،کراچی،ص1

25-"دیوان نصرتی"،مرتبہ،جمیل جالبی،قوسین،لاہور،1972ء،ص7

26-مثنوی" کدم راؤ، پدم راؤ"،مرتبہ:جمیل جالبی،ایضًا،ص36

27-رشید امجد،ڈاکٹر،"میراجی پر دو اہم کتابیں"،مشمولہ،جمیل جالبی:ایک مطالعہ،ایضًا،ص230

28-"اُردو تحقیق کی روایت"،ایک مصاحبہ (گوہر نوشاہی،ڈاکٹر جمیل جالبی)،مشمولہ،"ادبی تحقیق"،مرتبہ،ڈاکٹر جمیل جالبی،مجلس ترقی ادب لاہور،1994ء،ص36

29-اشفاق احمد،تعارف،مشمولہ،"قدیم اردو کی لغت"،مرتبہ:ڈاکٹر جمیل جالبی،باب اوّل،مرکزی اردو بورڈ،لاہور،دسمبر1973ء

30-جمیل جالبی،ڈاکٹر،"قدیم اُردو کی لغت"،(پیش لفظ)،ایضًا،ص8

31-"فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ،(جلد دوم)"،مرتبہ،ڈاکٹر جمیل جالبی،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،1993ء،پیش لفظ،ص ج

32-"قومی انگریزی اردو لغت"، مرتبہ،ڈاکٹر جمیل جالبی،طبع اول، مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد، 1992ء،ص 6-7

33-جمیل جالبی،ڈاکٹر، ''نئی تنقید''،مرتبہ،خاور جمیل،کراچی،رائل بک کمپنی 1985ء،اشاعت اول،ص10

34-انٹرویو پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ،ایضًا،ص172

35-جمیل جالبی،ڈاکٹر،"تنقید اور تجربہ"،کراچی،مشتاق بک ڈپو،بار اول،1967ء،ص8

36-احمد فخری حاجی،"دور تراجم"،مشمولہ،"ترجمے کا فن اور روایت"،مرتبہ،نثار احمد قریشی،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،ستمبر 1985ء،ص 40-41

37-حامد بیگ مرزا،ڈاکٹر،"ترجمے کا فن"،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،مئی 1988ء،ص 5

38-جمیل جالبی،ڈاکٹر،"ایلیٹ کے مضامین"،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،2006ء،ص 38

39-محمد احسن فاروقی،ڈاکٹر، ''ارسطو سے ایلیٹ ''،مشمولہ، ''ڈاکٹر جمیل جالبی:ایک مطالعہ"،مرتبہ:ڈاکٹر گوہر نوشاہی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی،انڈیا،بار اول،1993ء،ص 420

40-نظیر صدیقی، ''ڈاکٹر جمیل جالبی،ایک ممتاز مترجم ''،مشمولہ، ''ڈاکٹر جمیل جالبی:ایک مطالعہ"،ایضاً،ص 403

41-جمیل جالبی،ڈاکٹر،(مترجم)،"برصغیر میں اسلامی کلچر"،ادارہ ثقافت اسلامیہ،لاہور،1990ء،ص 10-11

42-معین الدین عقیل،ڈاکٹر،"عزیز احمد پاکستان میں تاریخ نویسی کی منفرد مثال"،مشمولہ،جنرل آف دی ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان 1986،جلد 5،ص 104

43-سجاد شیخ،"اعلیٰ ترجمے کی دو مثالیں"،مشمولہ،"جمیل جالبی:ایک مطالعہ"،ایضاً،ص 406

44-محمود الرحمٰن،ڈاکٹر،"ڈاکٹر جمیل جالبی بچوں کے ادیب"،مشمولہ "جمیل جالبی:ایک مطالعہ"،از گوہر نوشاہی،ایضاً،ص:44

☆☆☆

ڈاکٹر جمیل جالبی اور بچوں کا ادب

ڈاکٹر یاسمین سلطانہ
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبہ اردو، وفاقی اردو یونیورسٹی

کلیدی الفاظ: تخلیقات، ذوق تسکین، اطفال نو، ادب الاطفال، قد آور، موضوع و اسلوب

ملخص

ڈاکٹر جمیل جالبی دنیائے ادب میں کئی حیثیتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ جمیل جالبی صاحب کو نقاد، تاریخ داں، مترجم، مبصر، محقو، مدیر کی حیثیت سے اردو دان طبقہ اچھی طرح واقف ہیلیکن جالبی صاحب کے ادبی کارناموں کا ایک گوشہ ایسا بھی ہے جس سے بہت کم قاری واقف ہیں اور وہ گوشہ ہے " ب وں کا ادب" ہمارے بڑے ادیبوں نے اس طرف توجہ نہیں دی گو کہ لکھنے والوں نے خوب لکھا ہے مگر ہمارے بڑے ادیب بالخصوص ناول نگار، افسانہ نگار، محقق اور نقاد نے اسے وقت کا زیاں سمجھ کر یکسر رد کر دیا ایسے میں اردو ادب کی ایک بڑی ہستی جنیل جالبی صاحب نے اپنی گوناں گو علمی مصروفیات میں سے بچوں کے لیے وقت نکالا انھیں اہمیت دی۔ انھوں نے بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی کہانیاں تخلیق کیں۔ اس حوالے سے نا صرف خود لکھا بلکہ ادیبوں اور شعرا کو ادھر متوجہ کرنے کے لئے اخبارات میں اس کی افادیت پر کالم اور مضامین بھی لکھے۔ چونکہ وہ ایک معلم بھی تھیاس لیے طلبا کی تعلیم و تربیت پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ عمارت کی تعمیر، خوبصورتی اور مضبوطی کا دارومدار اس کی بنیاد پر ہیاس لئے بنیاد پر خاص توجہ دینی چاہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کا ادب تخلیق کر کے اپنے ملک کے مستقبل کے معماروں کی ذہنی تربیت میں حصہ لیا۔

اردو ادب میں ایک بڑا نام ڈاکٹر جمیل ہے جو بلاشبہ کسی تعارف کا محتاج نہیں وہ سولہ جون 1929 کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے سرکاری ریکارڈ میں ان کی تاریخ پیدائش یکم جولائی 1929 درج ہے۔ 1943 میں میٹرک کا امتحان سہارن پور کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے پاس کیا میرٹھ کالج سے 1945 میں ایف اے اور 1947 میں بی اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ 1947 میں پاکستان چلے آئے یہاں سے ایم اے ایل ایل بی، پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی اسناد حاصل کیں ایل ایل بی اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں سندھ یونیورسٹی جام شورو سے حاصل کیں۔ انہیں ڈی ایس سی کی اعزازی ڈگری بھی دی گئی۔ جامعہ کراچی میں وائس چانسلر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے صدر نشین رہے۔ اردو لغت بورڈ کراچی کے سربراہ اور متعدد اہم اداروں کے رکن بھی رہے انہوں نے متعدد کتب لکھیں اور مرتب کیں۔ ایسی چند تصانیف بہ شمول لغات و تراجم میں تاریخ اردو ادب (چار جلدیں) ادبی تحقیق، بوطبقات از ارسطو، بزم خوش نفساں ن۔م راشد ایک مطالعہ، کلیات میراجی، میرامن ایک مطالعہ، فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ، میراجی ایک مطالعہ، ہندو پاک میں اسلامی کلچر، ہندو پاک میں اسلامی جدیدیت پاکستانی کلچر، قدیم اردو کی لغت، قلندر بخش جرات، محمد تقی میر، ادب، کلچر اور مسائل، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، تنقید اور تجربہ دیوان نصرتی، دیوان حسن شوقی، نئی تنقید بارہ کہانیاں، حیرت ناک کہانیاں، ایلیٹ کے مضامین، ارسطو سے ایلیٹ تک شامل ہیں آپ کا سب سے اہم کام قومی انگریزی اردو لغت کی تدوین ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں 1964ء، 1973ء، 1974ء اور 1975ء میں داؤد ادبی انعام، 1987ء میں یونیورسٹی گولڈ میڈل اور حکومت پاکستان کی طرف سے 1990ء میں ستارہ امتیاز اور 1994ء میں ہلال امتیاز سے نوازا گیا اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے 2015ء میں آپ کو پاکستان کے سب سے بڑے ادبی انعام کمال فن ادب انعام سے نوازا گیا۔

ڈاکٹر صاحب ادب کی دنیا میں کئی حیثیتوں سے اپنی پہچان بنائی ادب کے جس پہلو پر قلم اٹھایا ادب کا ایک باب روشن کیا۔ انہوں نے تاریخ پر قلم اٹھایا تو "تاریخ ادب اردو" کی چار جلدیں مرتب کر ڈالیں جن میں قدیم و جدید شعراء و نثر نگاروں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ اردو کی پہلی تاریخ ہے جس میں

ادب کو مخصوص تہذیبی، معاشرتی معاشی، سیاسی اور لسانی عوام کا منطقی نتیجہ اور اجتماعی تہذیبی روح کا عکس سمجھ کر اسے اس انداز میں زیر بحث لایا گیا ہے کہ وہ ایک نا قابل تقسیم اکائی کی صورت میں ہمارے سامنے آئے۔ یہ تاریخ ادب اردو جدید انداز کی مربوط تاریخ ہے(؟) تحقیق پر قلم اٹھایا تو چار کارنامے ہی ادبی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر گئے۔ "دیوان حسن شوق"، "دیوان نصرتی"، "مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" اور قدیم اردو کی لغت " ان کتابوں کو مرتب کرتے ہوئے جالبی صاحب محض مواد اکٹھا نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کی نظر ادبی تاریخ کے ارتقاء پر تھی انہوں نے ان شعراء کا مقام بھی متعین کرنے کی کوشش میں تاریخ کو کھنگال ڈالا ان تمام شعراء کے کلام کا لسانی مطالعہ کے ذریعے علاقائی زبانوں سے روابط بھی پیش کیا۔ جمیل جالبی صاحب کی تنقید کے پہلو پر بھی گہری نظر رہی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے کہا تھا کہ اردو کا بہترین نقاد وہ ہوگا جس کی دونوں آنکھیں روشن ہوں گی یعنی جو مغرب اور مشرق دونوں کے ادب سے پوری واقفیت رکھتا ہوگا۔ اس حوالے سے جمیل جالبی بہترین نقاد ثابت ہوئے کیونکہ وہ مغربی علوم کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کہتے ہیں جمیل صاحب ایک ذاتی اور انفرادی منی فیسٹو کے ساتھ تنقید کے میدان میں آئے ہیں وہ " فکری تنقید " میں فرق کرتے ہیں۔(؟) تنقید کے میدان میں ان کا تنقیدی مضامین کا مجموعہ " تنقیدی اور تجزیہ " ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے گو کہ اس میں تنقید کے علاوہ بعض مغربی ادیبوں کے مختصر تعارفی مضامین بھی شامل ہیں مگر اس مجموعی کی تنقیدی حیثیت برقرار ہے۔ تحقیق و تدوین کے حوالے سے دو اہم ترین کتاب " کلیات میراجی " اور " میراجی ایک مطالعہ " جمیل صاحب کا الگ کارنامہ ہے۔ کلیات میراجی میں ان کی غزلیں نظمیں، گیت کو یکجا کیا گیا ہے جبکہ " میراجی ایک مطالعہ میں میراجی کی شخصیت و فن پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ جمیل صاحب نے ترجمہ نگاری کے میدان میں بھی اپنی الگ پہچان بنائی ہے۔ انہوں نے ترجمے کے لئے مغربی ادب کی شاہکار کتابوں کا انتخاب کیا جن میں " ارسطو سے ایلیٹ تک " اور " ایلیٹ کے مضامین " قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ان دونوں کتابوں کے ذریعے نئی نسل تک ایلیٹ کے اثرات منتقل ہوئے۔

تاریخ کی طرف نظر گئی تو " تاریخ ادب اردو " کی چار جلدیں لکھ ڈالیں جو اردو ادب کا سرمایہ خاص بن گئیں۔ یہ کتاب اردو اب کی تاریخ کے حوالے سے ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کر گئی۔ انہوں نے اس میں جن نکات و رموز کی وضاحت کی ہے اس نے اردو ادب میں ایک تسلسل قائم کر دیا ہے یہ ان

کی دوربین نگاہی کا فیض ہے کہ ہم ادب وزبان کو ماضی، حال اور مستقبل کی جڑوں میں معنی خیز روایات کی طرز نو میں دیکھتے ہیں۔(?) جمیل جالبی کے مطالعے کی خاص عادت تھی کہ قدیم ادب کے مطالعے کے دوران اپنی یادداشت کے لئے قدیم اردو الفاظ کے معنی الگ الگ کارڈوں پر لکھ لیا کرتے تھے۔ان کی اس عادت نے انہیں اردو ادب کی ایک اور صنف کی خدمت کی طرف آمادہ کر دیا اور انہوں نے "قدیم اردو کی لغت" تیار کرڈالی۔اس کے علاوہ جامعہ عثمانیہ کی مطبوعات کے اصطلاحات بھی مرتب کیا۔ "فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ" کے نام سے جس میں ?? ہزار اصطلاحات شامل ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے "قومی انگریزی اردو لغت" بھی مرتب کیا جو ???? صفحات پر مشتمل ہے جس میں نئے الفاظ سازی کی عملی کاوشیں جابجا نظر آتی ہیں۔ایک صاحب فکر ادب ہونے کی حیثیت سے جمیل جالبی کی نظر مسلمانوں کے دیگر مسائل کی طرف بھی تھی جن میں ایک بڑا مسئلہ مسلمانوں کے کلچر کا تھا اس سلسلے میں انہوں نے "پاکستان کلچر:مسائل اور پاکستانی کلچر کی تشکیل" لکھ ڈالی اس میں انہوں نے کلچر کی تعریف سے لے کر مذہب اور کلچر کے متعلق اور پاکستان کے مخصوص قومی مسائل پر کھل کر بحث کی ہے۔اردو ادب کے متعدد گوشوں میں اپنی پہچان بنانے والے جمیل جالبی نے ادبی صحافت میں بھی خدمات انجام دیں۔سب سے پہلے ادبی رسالہ "ساقی" سے وابستہ رہے بعد ازاں "نیا دور" کے ایڈیٹر کے حیثیت سے جدید اردو ادب کی غیر معمولی خدمات سرانجام دیں۔

لیکن ادب کا ایک گوشہ ایسا بھی ہے جسے ہم کسی بھی بڑے ادیب کے ادبی تخلیق کا حصہ نہ سمجھتے ہوئے اس سے روگردانی کرتے ہیں۔اور وہ گوشہ ہے بچوں کا ادب۔جس پر ہمارے اردو کے بڑے ادیبوں کی نظر کم کم ہی گئی ہے اس لئے شاید ہمارے ہاں یہ رجحان پروان چڑھ گیا کہ بچوں کے لئے لکھنا بڑے ادیبوں کے شایان شان نہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ہمارے ہاں بچوں کے ادب تخلیق نہیں ہوئے۔یوں تو اُردو میں بچوں کے ادب کا آغاز اورنگزیب عالمگیر کے عہد سے ہوتا ہے۔اگر بیسیوں صدی کے ابتدائی ادوار پر نظر دوڑائیں تو بچوں کے ادب کا خاصا وسیع ذخیرہ نظر آتا ہے۔بچوں کے مخصوص ادبی رسالے مثلاً "پھول" "غنچہ" "پیامِ تعلیم" "سعید" وغیرہ پورے برصغیر کے بچوں کے ذوق تسکین کا باعث بن رہے تھے ان میں شامل ولولہ انگیز نظمیں، اخلاقی کہانیاں اور معلوماتی مضامین نا صرف اطفالِ نو کے دل ودماغ کو تفریح مہیا کر رہے تھے بلکہ ان کے علم میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت میں بھی

مثبت کردار ادا کر رہے تھے۔اس دور میں ہمارے شعراء وادیب بچوں کی تعلیم وتربیت کو اپنا قومی فریضہ سمجھتے ہوئے اپنے قیمتی وقت میں سے چند گھڑیاں بچوں کے لئے ضرور نکالتے تھے۔اس زمانے میں اردو ادب کی قد آور ہستیاں جنہوں نے ادب الاطفال کو اہمیت دی ان میں علامہ اقبال،مولانا احسن مارہروی،اختر شیرانی،مولانا حامد حسن قادری، علامہ تاجور نجیب آبادی، چراغ حسن حسرت،تلوک چند محروم، حفیظ جالندھری افسر میرٹھی،صوفی غلام مصطفیٰ تبسم،ڈاکٹر ذاکر حسین،محمدی بیگم،امتیاز علی تاج،عبدالواحد سندھی اوراشرف صبوحی قابل ذکر ہیں۔لیکن قیام پاکستان کے بعد ہمارے بڑے ادیبوں نے بچوں کی طرف سے غفلت برتنی شروع کردی۔ اس سے یہ مطلب اخذ نہ کیا جائے کہ بچوں کے ادب کی تخلیقات معدوم ہوگئیں، ہرگزنہیں بچوں کے ادب کوفروغ حاصل ہوامگر افسوس اس بات کا ہے کہ یہ ادب ہمارے بزرگ ادباء کی توجہ سے محروم رہاالبتہ نئے ادیب اورشعراءادب الاطفال کوخوب سے خوب تر بنانے میں اپنی بساط بھرکوششیں کرتے رہے ہیں۔مگر چند ادیب وشعراء ایسے ضرور تھے جنہوں نے بچوں کے ادب کوفروغ دینے میں اپنا مثبت کردار ادا کیا ان کے دل میں نسل نو کی محبت جاگزیں تھی۔ وہ بچوں کی بنیادی تعلیم و تربیت کے ذریعے ملک وقوم کا مستقبل محفوظ کرنے کے متمنی تھے اوران چند ادیبوں میں ایک ڈاکٹر جمیل جالبی بھی تھے۔

جمیل جالبی جوادبی دنیا کی قد آور شخصیت ہونے کے باوجو بچوں کیلئے وقت نکالتے رہے انہوں نے نے کبھی بھی بچوں کے ادب کو کم مایہ نہیں سمجھا اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ ایک شفیق باپ تھے اپنے بچوں کی محبت لاشعوری طور پر تمام بچوں سے قریب رکھتی تھی۔دوسری وجہ ان کا معلم ہونا بھی تھا۔اور تیسری وجہ نسل نو کی رہنمائی کے ذریعے وطن عزیز کی بقاء تھی۔اس سلسلے میں شعوری فکر کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے دیگر ادیبوں کی توجہ بھی "بچوں کی ادب" کی جانب مبذول کرنے کی کوشش کی۔اس سلسلے میں ان کا ایک مضمون "اچھا لکھنے والوں کوبھی بچوں کیلئے لکھنا چاہئے" جوروزنامہ "حریت" کراچی سے شائع ہوا۔اس مضمون میں جالبی صاحب نے بچوں کے ذہنی تربیت میں ادب کے رول پر روشنی ڈال کرادیبوں میں بچوں کے ادب کی تخلیق کی تحریک پیدا کی ہے۔اس کے علاوہ ایک مضمون "بچوں کی تربیت اس طرح کریں کہ منفی جذبات پیدا نہ ہوسکیں" روزنامہ جنگ میں شائع ہوا۔اس کے علاوہ بچوں کے حوالے سے متفرق مضامین وقتاً فوقتاً مختلف روزناموں میں شائع ہوتے رہے جن میں

"بچوں کو آسان زبان میں تاریخ، سائنسی اور دیگر معلومات سے روشناس کرایا جائے"، "بچوں کے ادب پر چند سال میں بہار آنے کا یقین ہو گیا ہے"، بچوں کے لئے کتابیں۔ "بچوں کے لئے اچھی کتابیں لکھنے پر توجہ دی جائے" اور "بچوں کے لئے کتابیں بچہ بن کر لکھی جاتی ہیں" شامل ہیں یہ وہ مضامین ہیں جو جالبی صاحب کی بچوں کے لئے فکر و نظر کو واضح کرتی ہیں۔ بچوں سے ذہنی ہم آہنگی کا یہی وہ فطری عنصر ہے جس نے انہیں بچوں کے ادب سے دور نہیں ہونے دیا۔

ایک تو بچپن سے مصنف بننے کا شوق جس کے تحت نوعمر جمیل کاپیاں پھاڑ کر کتاب بناتا اور اس پر مصنف کے طور پر اپنا نام نمایاں طور پر لکھ دیتا اور والد سے داد و تحسین پاتا دوسرے والدہ جو خود شاعرہ تھیں ان کی تربیت نے بچپن میں ہی ادبی رجحان پیدا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے صرف 12 سال کی عمر میں "سکندر اور ڈاکو" کے نام سے پہلی کہانی لکھی، جو اُن کے اسکول میں بطور ڈرامہ بھی پیش کی گئی۔ ان کی پہلی تحریر دہلی سے شائع ہونے والے رسالے "بنات" میں شائع ہوئی۔

جمیل جالبی نے اپنی گفتگو میں بتایا کہ جب وہ چھوٹے تھے تو نانی اماں سے کہانی سنے بغیر سوتے نا تھے۔ ایک بار کی کہی ہوئی کہانی بار بار سنتے تھے نانی کی زبانی "اٹے بٹے" کی کہانی انہیں بہت پسند تھی وہ کہتے ہیں کہ:

میرا ماضی ان کہانیوں کے اندر ملول کر گیا ہے اور اب وہ ان کی کہانیوں کے تعلق سے مجھ پر منکشف ہوتا ہے۔

جمیل صاحب کی بچوں کیلئے پہلی کتاب "جانورستان" کے نام سے شائع ہوئی جو جارج آرول کے ناول (FARMANIMAL) کا اردو ترجمہ تھا۔ کسی بھی تخلیق کو ادبی کسوٹی پر پرکھنے کیلئے دو باتوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے، ایک موضوع دوسرا اسلوب، ادب کی تخلیق کے حوالے سے پہلا مرحلہ موضوع کے انتخاب کا آتا ہے قاری کی عمر اور طباع کو ملحوظ رکھتے ہوئے ادیب موضوع منتخب کرتا ہے۔ بچے بنیادی طور پر جانوروں میں دلچسپی رکھتے ہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جانوروں سے متعلق گفتگو یا کہانیاں انہیں بیحد مرغوب ہوتی ہیں۔ بچوں کی اس نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے بچوں کی تربیت کیلئے کہانی کی شکل میں جانوروں کو موضوع بنایا اسی سلسلے میں مولانا رازق الخیری کے رسالہ 'بنات" میں اپنی دلچسپ کہانی "بلیاں" شائع کرائی۔ 2013 میں بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ "بارہ

کہانیاں" کے نام سے شائع کروایا جس کے دیباچے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ "یہ وہ کہانیاں ہیں جو میں نے بچپن میں سنی یا پڑھی تھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ موجودہ اور آنے والی نسلیں بھی ان کہانیوں کو پڑھ کر اپنے ذہن کو تازہ کریں۔(؟) اس مجموعے کی پہلی کہانی "اپنی مدد آپ" ہے جس میں ایک چڑیا کی نصیحت اپنے بچوں کے ذریعے دوسروں پر تکیہ کرنے کے بجائے اپنی مدد آپ کے اصول کو بیان کیا گیا ہے۔ کھیت کا مالک جب تک دوسروں پر انحصار کرتا ہے فصل کی کٹائی ممکن نہ ہوسکی مگر جیسے ہی اس نے ارادہ کیا کہ اب میں خود کل سے یہ کام کروں گا تو چڑیا کو یقین ہوگیا کہ فصل کی کٹائی ہوجائے گی اس لئے گھونسلہ تبدیل کرلینا چاہئے۔ دوسری کہانی "دو دوست دو دشمن' ہے جس کا موضوع "اتفاق" ہے کہ چوہا اور مینڈک جب تک مل جل کر تھے محفوظ تھے مگر جیسے ہی جھگڑا کیا چیل کی خوراک بن گئے۔ "ایک چیل کی کہانی" میں آزادی کی اہمیت کو موضوع بنایا۔ "ایک عجیب معاہدہ" میں دشمنوں پر بھروسے کے نقصانات دکھائے گئے۔ "نادانی کی سزا" میں بتایا گیا کہ اپنی حیثیت سے زیادہ کی تمنا انسان کو نقصان پہنچاتی ہے۔ سمجھدار گدھا" میں گدھے کے دانشمندانہ فیصلے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ "قصہ ایک بھڑیئے کا" جس میں ایک کمزور اور بھوکا بھیڑیا آرام و آسائش کی خاطر بھی اپنی آزادی کا سودا نہیں کرتا ہے۔ مطلب اس کہانی کے ذریعے آزادی کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے۔ "مغرور لومڑی" کے ذریعے اپنی صلاحیتوں کا بروقت استعمال کو موضوع بنایا گیا ہے "نادان بکری" لکھ کر لالچ کے انجام سے باخبر کیا کہ کس طرح بکری ٹھنڈے میٹھے پانی کی لالچ میں کنویں میں چھلانگ لگا کر اپنی جان سے ہاتھ دھوبیٹھی۔ "ناشکرا ہرن" میں ہرن کو ناشکری کی سزا اس کی موت کی شکل میں ملتی ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی مدد کرنے والی انگور کی بیلوں کو کھانے میں جلد بازی دکھائی تھی۔ "بدذات بلی" میں چغل خوروں کی باتوں پر کان نہ دھرنے کی اصلاح نظر آتی ہے۔ اگر چیل اور سؤرنی بلی کی باتوں میں نہ آتے اور ایک دوسرے کو اپنا دشمن نہ سمجھتے بلکہ پہلے کی طرح دوست بن کر رہتے تو اپنے بچوں سمیت موت کا شکار نہ ہوتے۔ "دو چوہے" میں گاؤں کی سادہ اور پرسکون زندگی کا موازنہ کیا گیا ہے شہر کی پرتعیش مگر پریشان کن زندگی سے۔

جمیل صاحب کا دوسرا مجموعہ "حیرت ناک کہانیاں" ہے جس میں صرف دو کہانیاں ہیں "چھن چھن چھن چھن" اور "بید کی کہانیاں" جو انہوں نے اپنے بچوں سمیرا جمیل اور فرح جمیل کی فرمائش پر لکھیں اور انہیں کے نام سے منسوب کی ہیں۔ چھن چھن چھن چھن میں جمیل جالبی نے اپنی آپ بیتی کو کہانی

کی شکل بیان کیا ہے۔سیکنڈ ایئر کے زمانے میں فلم دیکھنے کے شوق میں وہ چچا کے ساتھ سینما پہنچ گئے واپسی پر مانگی ہوئی بید سینما میں بھول آئے اور رات کے ڈیڑھ بجے اکیلے ہی بید لینے سینما جانا پڑا۔ واپسی پر چھن چھن کی آواز نے ان کا پیچھا کیا جو کمرے تک پہنچ گئی۔ انہوں نے دیکھا ایک چڑیل ان کے کمرے میں موجود تھی جو صبح فجر کی اذان ہونے تک انہیں اپنے مختلف عمل سے ڈراتی رہی۔ دراصل جمیل صاحب نے اب جس موضوع کا انتخاب کیا اس کا تعلق Fantasy سے تھا فوق الفطرت کہانیوں میں پناہ لینے کی روایت بڑوں سے بچوں میں بھی پہنچ کی چکی تھی۔ وہ بھی اپنی معاشرتی ذمہ داریوں اور ماحول کی بندشوں سے فرار حاصل کر کے Fantasy کی دنیا میں خوشی اور تحیر حاصل کرتا ہے۔ جہاں زندگی کی حقیقتوں کے برخلاف ماورائی دنیا آباد ہوتی ہے جہاں جن بھوت، پریاں اور دیو ہوتے ہیں جہاں حقیقت سے پرے واقعات رونما ہوتے ہیں۔انوکھے واقعات ہوتے ہیں۔غیر معمولی مہم سر کی جاتی ہے۔ یہ دنیا ایک خاص عمر کے بچوں کی مرغوب دنیا ہے جمیل جالبی صاحب بچوں کے اذہان میں Fantasy کی اہمیت سے واقف تھے اس لئے انہوں نے اس کہانی کا تانا بانا فوق الفطرت کے گرد بُنا ہے۔اس کہانی کا ایک نکتہ تو ایمان کی مضبوطی ہے کہ ہر مشکل میں ہم اپنے رب کو یاد کرتے ہیں۔اور وہ ہمیں مشکلوں سے نکالتا ہے ہے فجر کی اذان کے ساتھ ہی چڑیل غائب ہو جاتی ہے۔ دوسرا نکتہ احساس ذمہ داری ہے جو ڈر اور خوف کے باوجود مصنف کو کسی سے مانگا ہوا بید واپس لانے کے لئے سینما واپس جانے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ کہانی بچوں کو بیک وقت صبر، رحم، جرا?ت، حوصلہ اور عمر رسیدہ انسانوں سے محبت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ چونکہ اسی کہانی کا مرکزی کردار خود جمیل جالبی ہیں جو چڑیل کے خونیں پنجے کا شکار ہوئے اس لئے بچوں کو دل میں جمیل جالبی نے اپنے لئے ترحم اور محبت کا جذبہ جگا دیا۔اور یہ جذبہ بچوں میں پیدا کرنا دراصل ان کی تربیت کا حصہ تھا۔اس مجموعے کی دوسری کہانی "بید کی کہانی" ہے جس میں ایک سر کٹا مصنف کے پیچھے پڑ گیا تھا یہاں تک کے پاکستان بننے کے بعد جب مصنف پاکستان آ گئے تب بھی اس نے پیچھا نہ چھوڑا۔ چونکہ ان کے دوست شاہد بھی اس سر کٹے مخلوق کے گواہ ہیں اس سے بچوں کے تحیر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

جمیل صاحب بچوں کے ذوق مطالعہ اور نفسیات کا ادراک رکھتے ہیں وہ اپنا بچپن یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"پریوں کی کہانیاں مجھے اچھی لگتیں، رنگ برنگ کی پریاں سبز پری، نیلم پری، سرخ پری آج

بھی میرے تخیل کا حصہ ہیں۔اماں سے کہتے کہ ہم بھی پریاں دیکھیں گے تو وہ جواب دیتیں کہ رات کو بارہ بجے چار کالے بھجنگ دیوؤں کے کندھے پر سوار ہو کر ٹھیک رات کے بارہ بجے پریوں کا تختہ گزرتا ہے۔ آج رات کو میں تمہیں آنگن میں لے جا کر دکھادوں گی بارہ بجنے کا ہم انتظار کرتے رہے لیکن نیند کی پریاں ہمیں بارہ بجے سے پہلے ہی اڑا کر خوابوں کی دنیا میں لے جاتیں۔ان کی کہانیوں نے میرے ذہن کی تشکیل میں بڑا کام کیا ہے میرا خیال ہے یہ کہانیاں اسی طرح ہر نسل کی تربیت کرتی ہیں"۔

موضوع کے انتخاب کے ساتھ ساتھ بچوں کی کہانیاں لکھتے ہوئے جمیل جالبی نے اسلوب کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔ان کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے تحقیق،تنقید،تاریخ کی دنیا کا ڈاکٹر جمیل جالبی ذہن سے محو ہو جاتا ہے جس کے اسلوب میں ادبی شان پائی جاتی ہے،ہم ایک دوسرے جمیل جالبی سے ملتے ہیں جو جانوروں کے کی کہانیاں لکھتے ہوئے ہمیں ایک بچہ نظر آتا ہے لیکن جب حیرت ناک کہانیاں لکھتا ہے تو اس میں الفاظ کا چناؤ اور جملوں کی بنت باشعور بچوں کی ادبی شعور کو جلا بخشتی ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا بچوں کیلئے ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ناول "فسانہ ؟ آزاد" میں بچوں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اس کے مرکزی مزاحیہ کردار خوجی کے پرمزاح واقعات کو بچوں کی کہانیوں میں ڈھال دیا۔اس کردار کا تکیہ کلام "نہ ہوا قرولی" کو ذیلی عنوان بنا کر ہر واقعے کی ایک کہانی تشکیل دی جو جنوری ؟؟؟؟ سے بچوں کے ماہنامہ "ہونہار" میں قسط وار چھپنا شروع ہوئی ستمبر ؟؟؟؟ میں ؟؟ ویں قسط کی اشاعت آخری قسط ثابت ہوئی۔یہ کہانیاں رنگین تصویروں کے ساتھ شائع کی جارہی تھیں جو بچوں کی دلچسپی میں اضافے کا باعث بنیں۔سرشار کے ناول "فسانہ آزاد" کا یہ کردار خوجی بڑوں میں تو مقبول تھا ہی مگر جمیل جالبی نے اسے بچوں میں بھی مقبول عام بنا دیا۔

بچوں کے ادب کیلئے موضوع اور اسلوب دونوں ہی بہت اہم ہیں۔ان کا سہارا لے کر ہی ننھے قارئین کے دل و دماغ کو مسحور کیا جاسکتا ہے۔ان کے تفنن طبع کے سامان کے ساتھ ساتھ ان کے اندر ادب وفن کا صحیح ذوق بھی پیدا کیا جاسکتا ہے۔ان دونوں عناصر کی کسوٹی پر ڈاکٹر جمیل جالبی کی تخلیقات پوری اترتی ہیں۔وہ بچوں کا ادب تیار کرنے میں ناکام نہیں رہے۔اس کا بین سبب ان کا نفسیاتی شعور ہے۔وہ ایک ماہر تعلیم ہونے کی حیثیت سے بچوں کی ذہنی سطح،ان کے شوق وجذبے اور ان کی دنیائے تخیل سے کما حقہ آگاہ ہیں۔لہٰذا جب جالبی صاحب "ارسطو سے ایلیٹ تک" کی سطح معاً رُخ موڑ کر بچوں کے لئے کہانیاں

لکھنے بیٹھتے ہیں تو وہ فکر وفلسفہ اور علم وادب کے حصار سے باہر نکل آتے ہیں اور اس دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں اسمٰعیل میرٹھی، صوفی تبسم، شفیع الدین نیرؔ وغیرہ کا راج ہے۔ وہ بچوں کی معصوم دنیا کے باسی ہو جاتے ہیں ان کے اوپر سے تنقید، تحقیق و تجربہ کا پرتکلف و دانشمندانہ غلاف اتر جاتا ہے۔ ان کے سامنے ننھے منے بچوں کی معصوم دنیا ہوتی ہے جہاں " کلچر " کا ذکر ممنوع " تاریخ ادب " کی بات ناموزوں " اور کدم راؤ پدم راؤ " کا رومانی قصہ بے معنی سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ آسان بات نہیں۔ اپنے آپ کو تنقید، تحقیق اور تاریخ کی بندھی ہوئی زنجیروں سے آزاد کرنا کارِفرہاد سے کم نہیں۔(??) سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک بڑا ادیب جو شعور و قلم کی بلندیوں پر ہو اپنی ذہنی سطح کے مخالف سمت مراجعت کرتا ہے تو اس کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما رہے ہوں گے۔ یقیناً ہونہار سے محبت اور ان کی ذہنی تربیت، جنہوں نے مستقبل میں ملک و قوم کا باگ ڈور سنبھالنا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ گوشہ ہمارے ان تمام ادیب و شعراء کیلئے نکتہ فکر ہے کہ برصغیر کا ایک قد آور ادیب و محقق جس کا علمی تجربہ، معلومات کی وسعت اور فہم وادراک کی بلندی کا کوئی نعم البدل نہیں اس نے بچوں کی طرف سے صرفِ نظر نہیں بلکہ علمی وادبی نوعیت کے کے دقیع موضوعات کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب کو خاصی اہمیت دی اور ان کیلئے قیمتی وقت صرف کیا۔ اس لحاظ سے اردو ادب خوش نصیب ہے کہ اسے ڈاکٹر جمیل جالبی میسر آئے جنہوں نے اردو ادب کے ہر گوشے میں اپنے فکر وفن کے چراغ روشن کئے ڈاکٹر جمیل الدین عالی کی ادبی خدمات کا دورانیہ تقریباً ستر برس پر پھیلا ہوا ہے اور جس طرح سے انہوں نے مقدار اور معیار میں توازن کی عمدگی کو قائم اور برقرار رکھا ہے اس کی خوشبو اردو ادب کی فضاؤں میں دیر تک اور بہت دور تک ان کی یادوں کو زندہ اور محبوب رکھے گی۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ پروفیسر سید وقار عظیم، " جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو" مشمولہ "ڈاکٹر جمیل جالبی" مرتبہ، ڈاکٹر محمد خاور جمیل، الیٹ پبلشرز کراچی۔

۲۔ محمد احسن فاروقی، " جمیل جالبی کی تنقید نگاری" مشمولہ "ڈاکٹر جمیل جالبی" مرتبہ، محمد خاور جمیل،

۳۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، "ڈاکٹر جمیل جالبی کی " تاریخ ادب اردو" ایک سنگ میل" (ڈاکٹر جمیل جالبی۔

۴۔ڈاکٹر محمود الرحمٰن الذوی،"اردو میں بچوں کا ادب"مقدمہ،مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔
۵۔رانا محمد شاہد"بچوں کے جمیل جالبی'drdupiont.com
۶۔ڈاکٹر مشرف احمد،" لکھ رہی ہیں۔لکھ رہی ہیں۔لکھ رہی ہیں انگلیاں"مشمولہ "ارمغاں" جمیل جالبی نمبر،شمارہ?،اپریل،مئی 1996،کراچی۔
۷۔ڈاکٹر جمیل جالبی"بارہ کہانیاں"عفیف پرنٹرز،دہلی۔
۸۔"بارہ کہانیاں"
۹۔ڈاکٹر جمیل جالبی،"حیرت ناک کہانیاں"ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی۔
۱۰۔ڈاکٹر مشرف احمد، " لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں انگلیاں"
۱۱۔ڈاکٹر محمود الرحمٰن،"ڈاکٹر جمیل جالبی۔بچوں کے ادیب"مشمولہ "ڈاکٹر جمیل جالبی مرتبہ، ڈاکٹر محمد خاور۔

اردو کی پہلی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' اور ڈاکٹر جمیل جالبی

محمد ابرار
متعلم شعبۂ اردو علی گڈھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ، یو۔ پی

ABSTRACT

The sole purpose and resolution of penning down this article is an attempt to make readers aware of struggles of Dr. Jameel Jalibi .This piece of article deals with the major issues faced by Dr. Jameel jalibi in editing of first Urdu masnavi as well as first literary creation in Urdu called " Kadam Rao Padam Rao ". By this means he attained rough draft (Qalmi Nuskha) of masnavi " Kadam Rao Padam Rao ". In this article an attempt is made to figure out the difficulties faced by Dr. Jameel Jalibi in editing this masnavi critically and investigative manner by giving the evidences, by quoting some other notable Urdu scholars and critics . The starting lines of this article emphasized on the precedence of poetry in world literature as well as in Urdu literature too. This article also asserted the great contribution of Dr. Jameel Jalibi in Urdu literature especially in the field of Urdu research and criticism genre etc.

بنی نوعِ آدم نے از ابتدائے آفرینش جب اپنے قلوب و اذہان میں موجزن تفکرات و خیالات اور احساسات وجذبات کو دوسروں تک پہونچانا چاہا، مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے کوشش کناں ہوا تو نظم اور نثر کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ نثر اگر چہ نظم سے سہل اور آسان تر ہوتی ہے لیکن تقدم زمانی نظم کو حاصل ہے۔ کیوں کہ جب ہم عالمی ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تو نظم کی روایت بمقابل نثر کے قدیم تر ملتی ہے گویا نظم نثر سے پہلے معرض وجود میں آئی۔ چاہے وہ دورِ جاہلی کا قدیم عربی ادب ہو یا دیگر زبانوں کا ادب، بیشتر جگہ نظم کی اولیت موجود ہے۔ جس طرح نظم کو دوسری زبانوں کے ادب پر تقدم حاصل ہے اسی طرح اردو زبان میں بھی اس کی اولیت برقرار ہے۔ اردو ادب کی پہلی با قاعدہ مسلمہ تخلیق مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' فخر دین نظامی تسلیم کی جاتی ہے۔ جسے ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی دنیائے اردو ادب کے آسمان پر ایک ایسے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ جس کی زر پاشیاں مختلف اصنافِ ادب پر مشتمل ہیں۔ وہ بہ یک وقت ایک بلند پایہ عالم، قد آور محقق، صاحبِ نظر نقاد، کامیاب مترجم، بہترین لغت ساز، ایک حساس مدیر اور اردو تحریک کے فعال نمائندے کی حیثیت سے شناخت رکھتے ہیں۔ گویا آپ کثیر الجہت ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ مختلف موضوعات پر تیس سے زائد کتابیں اور تین سو سے زیادہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ بعض تخلیقات کے متعدد ایڈیشن شائع ہو کر دنیائے اردو تحقیق و تدوین میں شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کر چکی ہیں جو شاید کسی دوسرے کا مقدور ٹھہرے۔ انہی تحقیقی، تدوینی، ادبی نگارشات اور غیر معمولی خدمات کی بنیاد پر آپ کا شمار اردو ادب کے صفِ اول کے محققین میں کیا جاتا ہے۔ گویا آپ کی شخصیت اردو ادب میں ایک تاریخ ساز کی ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر، جمیل جالبی کی تحقیقی اور تدوینی خدمات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر جمیل جالبی تحقیق اور تدوین کی سنگلاخ وادی میں اترے تو نہ صرف اپنے لیے منفرد راستے کا تعین کیا بلکہ تازہ واردانِ بساطِ تحقیق کے لیے نئے امکانات کے چراغ روشن کیے۔ وہ دنیائے تحقیق میں حافظ محمود شیرانی، مولوی شفیع اور مولانا امتیاز علی عرشی کے قبیلے کے فرد ہیں۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی اردو تحقیق کے ساتھ ساتھ اردو تنقید میں بھی ایکساں دسترس رکھتے ہیں۔ جو

ان کی وسعت مطالعہ، باریک بینی، فکری تعمق، متانت وسنجیدگی اور غیر جانب دارانہ تنقیدی وتحقیقی شعور و بالیدگی کی غماز وعکاس ہیں۔ جیسا کہ گیان چند جین اپنے مضمون ''ڈاکٹر جمیل جالبی: ''تاریخِ ادب اردو'' میں لکھتے ہیں:

> ''میرا یہ عقیدہ ہے کہ کوئی شخص بہ یک وقت بڑا محقق اور بڑا نقاد نہیں ہوسکتا ۔ مجھے اردو میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی لیکن جمیل جالبی کو دیکھ کر میرے عقیدے میں تزلزل ہونے لگتا ہے۔ وہ تحقیق میں تو اَرفع مقام پر فائز ہیں ہی، تنقید میں بھی اچھا خاصا مقام رکھتے ہیں۔ اس ادبی تاریخ میں ان کی تنقیدی صلاحیتیں شرح وبسط سے جلوہ گر ہوئی ہیں۔''

دکنی اردو ادب کی پہلی باقاعدہ شعری تخلیق مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' ہے ۔ جسے فخر دین نظامی نے ۱۴۲۱ء سے ۱۴۳۵ء کے درمیان بہمنی سلطان احمد شاہ کے عہد میں تصنیف کیا۔ یہ مثنوی اردو ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ کیوں کہ اِس مثنوی کی دریافت، تدوین وترتیب اور اِشاعت سے نہ صرف اردو زبان کی تاریخی، تہذیبی اور ادبی رجحانات کے دھارے نویں صدی ہجری سے جا ملتے ہیں، بلکہ زبان کی بدلتی ہوئی صوری ومعنوی ارتقاء کی گمشدہ کڑیاں بھی مل جاتی ہیں۔ اہل علم اور ماہر لسانیات کے سامنے فکر وتدبر، تحقیق وتدوین کی نئی راہیں بھی وا ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اسے ۱۹۷۳ء میں مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ جس پر سندھ یونیورسٹی نے ڈی۔ لٹ کی سند سے نوازا تھا۔ اس مثنوی کے قدیم نسخے کی دریافت اور مخطوطے کی شکل میں بابائے اردو تک رسائی کا مکمل احوال مشفق خواجہ نے مضمون ''مثنوی، کدم راؤ پدم راؤ'' میں بتفصیل لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''حیدآباد دکن میں ایک علم دوست بزرگ تھے لطیف الدین ادریسی، کتابوں کی تجارت ان کا مشغلہ تھا۔ وہ تلاش اور محنت سے کتابیں، خصوصاً قلمی کتابیں حاصل کرتے تھے اور انہیں اہلِ علم تک پہنچاتے تھے۔ ایک مرتبہ انہیں ایک دکنی مثنوی کا مخطوطہ کہیں سے ملا۔ انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کس کی اور کس زمانے کی تصنیف ہے؟ ادریسی صاحب نے یہ مخطوطہ مشہور محقق مولانا نصیرالدین ہاشمی کو دکھایا۔ ہاشمی صاحب نے اسے سرسری طور پر دیکھا اور اس کے بارے میں ایک مختصر سا

مضمون ''بہمنی عہدِ حکومت کا ایک دکنی شاعر'' کے عنوان سے لکھ کر ''معارف'' اعظم گڑھ کے اکتوبر ۱۹۳۲ء کے شمارے میں چھپوا دیا۔ ہاشمی صاحب نے اس مثنوی کے مرکزی کرداروں کدم راؤ پدم راؤ کی مناسبت سے اس کا نام ''کدم راؤ پدم راؤ'' رکھا۔ گو مصنف نے یہ نام نہیں لکھا تھا، لیکن مثنوی کی شہرت اسی نام سے ہوئی۔ مولانا نصیرالدین ہاشمی کے توسط، سے آج سے بیالیس سال قبل، اردو دنیا اس مثنوی کے وجود سے آشنا ہوئی تھی، لیکن اس کی اصل اہمیت اس وقت واضح ہوگئی، جب یہ مخطوطہ بابائے اردو کے پاس پہنچا۔''

تاریخی اور لسانی نقطۂ نظر سے نہایت اہمیت وافادیت کا حامل یہ مخطوطہ، اب بابائے اردو مولوی عبدالحق کی دسترس میں تھا۔ اگر چہ وہ اردو ادب کے اس گوہر نایاب کو اردو کے قصرِ سلطانی پر سجانا و سنورانا چاہتے تھے، مگر تنگیٔ وقت اور عدیم الفرصتی دامن گیر تھی جس کے سبب خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے۔ اس لیے انھوں نے اہلِ علم وفراست کو اس کی تدوین وترتیب کے لیے دعوت دی مگر بیشتر اشخاص نے تحقیق وتدوین کے اس کوہِ ہمالہ کو دیکھ کر راہِ فرار اختیار کی اور بعض نے مولوی صاحب کی طرح عدیم الفرصتی کا عذر پیش کیا۔

ایک مدت مدید کے بعد بالآخر اس کی ترتیب وتدوین ڈاکٹر جمیل جالبی کی مقدور ومقسوم ٹھہری۔ انھوں نے مثنوی کو بڑی محنت ومشقت اور جاں فشانی سے شایانِ شان انداز واسلوب میں ترتیب دیا۔ اپنی جہدِ مسلسل، انتھک کوشش، مستقل مزاجی، خداداد ذہانت وفطانت، فنِ مخطوطہ شناسی کے رموز واسرار سے گہری واقفیت اور اصولِ تدوین وتحقیق کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نسخے کی قرأت اور متن کی ترتیب وتدوین میں کامیاب ہوئے۔ جیسا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی سرگرمیوں اور کدوکاوشوں کے بارے میں مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''۱۹۶۷ء میں پہلی بار میں اس مخطوطے سے متعارف ہوا۔ مہینوں اس کے مطالعے کی کوشش میں لگ گئے۔ آتشیں شیشہ لیے گھنٹوں اسے پڑھنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک تو رسم الخط اور اس کے اصول، جو کاتب کے پیشِ نظر تھے، سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ ڈیڑھ سال کی محنت وکوشش اور لغات کے ساتھ

سر کھپانے کے بعد میں اس قابل ہو گیا کہ کسی حد تک اسے پڑھ سکوں۔ مجھے اس کا اندازہ ہوا کہ کاتب مختلف حروف اور ان کے جوڑ کی مختلف شکلیں کس طرح لکھتا ہے۔مختلف حروف مثلاً: ب، گ، ڑ، ڈ کے لیے وہ کیا عمل کرتا ہے۔دوسرے حروف وہ کس طرح بناتا ہے۔ یہ مشکل بھی ہمیشہ پریشان کرتی رہی کہ لفظ پڑھ لیا، تو اس کی تصدیق کے لیے معنی کی تلاش ہوئی۔ یہ کام بھی ساتھ ساتھ ہوتا رہا۔ پھر دو سال کے اندر اندر مجھ میں یہ حوصلہ پیدا ہو گیا کہ میں اس مخطوطے کی پہلی نقل تیار کرلوں۔اس نقل کا مقابلہ جب اصل سے کیا، تو اس میں اتنی کانٹ چھانٹ ہوئی کہ میں دوسری نقل تیار کرنے پر مجبور ہوا۔ دوسری نقل کا مقابلہ جب پھر اصل سے کیا اور ہر لفظ پر غور کیا، تو یہ دوسری نقل بھی اس قابل نہ رہی کہ اسے صاف کیا جا سکے۔ دوسری نقل اور اصل کو سامنے رکھ کر میں نے تیسری نقل تیار کی، جو ۱۲ اگست ۱۹۷۱ء کو مکمل ہوئی۔''

چوں کہ مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کا ایک ہی نسخہ دستیاب تھا، جو ناقص الطرفین (وہ نسخہ جس کے اول اور آخر کے اوراق ضائع ہوں) ہونے کے ساتھ ساتھ نامانوس طرزِ کتابت کا حامل بھی تھا، جس کی قرأت اور تصحیح آسان کام نہ تھی۔اس لیے ڈاکٹر جمیل جالبی کو مزید مشکلات اور دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا۔ مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے قلمی مخطوطے کا تعارف کراتے ہوئے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کا ایک ہی معلوم نسخہ ہے، جو انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کے کتب خانۂ خاص میں محفوظ ہے۔ یہ واحد نسخہ بھی ناقص ہے۔ بیچ بیچ میں سے اکثر صفحات غائب ہیں اور آخر میں بھی مثنوی کے کم از کم دو تین صفحات کم معلوم ہوتے ہیں۔اسی وجہ سے کاتب کا نام اور سنۂ کتابت کا بھی پتا نہیں چلتا۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مثنوی کے مقدمے میں زمانۂ تصنیف پر جہاں بتفصیل گفتگو کی ہے وہیں داخلی شواہد کی بنیاد پر اس کا تعین بھی کیا۔ کہانی کے خلاصہ کے ساتھ ساتھ تہذیبی، معاشرتی اور لسانی تجزیہ بھی کیا ہے۔جمیل جالبی نے اس مثنوی کی تدوین و ترتیب میں ادب کو معاشرتی، تہذیبی و سیاسی عوامل کے ساتھ دیکھا اور سمجھا ہے، اور ادب کی روایت جن جن اثرات و ماحولیات سے مل کر بنتی اور رنگ و روغن کشید

کرتی ہے انہیں بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

بقول جمیل جالبی:

''ادب کی روایت معاشرت وتہذیب سے الگ رہ کر پروان نہیں چڑھتی بلکہ زمانے کی روح کو اپنے اندر سمیٹتی، اپنے خدوخال بناتی ہے۔''

اردو چوں کہ شمالی ہند سے دکن پہنچی تھی۔ مقامی باشندگان سے باہمی اتحاد واشتراک، ابلاغ و ترسیل سے جو زبان معرض وجود میں آئی، اسے ہی دکنی اردو سے موسوم کیا گیا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شمالی ہند سے کوئی ایک زبان دکن نہیں پہنچی بلکہ یہ علاؤ الدین خلجی کی افواج کے ساتھ، پھر امیران صدہ اور ان کے لواحقین ومتوسلین کے ساتھ، اس کے بعد محمد تغلق کے زمانے میں دولت آباد کو دارالحکومت بنایا گیا تو پوری دلّی خالی ہوگئی جو لوگ دکن پہنچے وہ مختلف بولیاں بولتے تھے۔ اس لئے ان تمام بولیوں کے جو اثرات نظامی کی زبان پر مرتسم ہوئے، جمیل جالبی نے ان کی نشان دہی کی ہے۔ اور فخر دین نظامی کے زبان و بیان کے رجحانات وروایات کو موجود اور مروّج قواعد وضوابط اور اصول کے تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ جیسا کہ مثنوی کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''اس مثنوی میں بہ یک وقت کھڑی، پنجابی، راجستھانی، برجی، گجری، سندھی، سرائیکی اور مرہٹی کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ میں نے جب پنجابی، سندھی، کھڑی، راجستھانی، برجی اور گجراتی بولنے والوں کو الگ الگ اس مثنوی کے اشعار سنائے، تو انھوں نے جہاں اور کئی باتیں کہیں، وہاں یہ بات مشترک تھی کہ یہ زبان ان کی اپنی زبان سے قریب ہے اور آج بھی اس کے بہت سے الفاظ ان کے گھروں میں بولے جاتے ہیں۔ اس تجربے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ قدیم زبان، جو اس مثنوی میں استعمال ہوئی ہے۔ اس میں صدیوں کے میل جول سے متعدد زبانوں کا خون شامل ہے اور اسی خاندانی شباہت کی وجہ سے مختلف زبانیں بولنے والے اسے اپنی زبان سے قریب تر پاتے ہیں۔ معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی حالات کے ساتھ اردو کا ذخیرۂ الفاظ، لہجے اور اسالیب تو بدلتے رہے، لیکن یہ ہمیشہ سب ہند آریائی زبانوں کی ایک زبان بن کر پروان چڑھتی رہی، اس لیے میں اس

زبان کو برِصغیر کی ساری ہند آریائی زبانوں کا عادِ اعظم مشترک کہتا ہوں۔''

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اِس مثنوی کی تدوین وترتیب اور تصحیح وقرأت میں بڑی باریک بینی ،سنجیدگی اورعرق ریزی کا مظاہرہ کیا ہے۔انھوں نے اس اہتمام کے ساتھ ترتیب دے کر شائع کروایا ہے کہ سیدھے ہاتھ کی طرف مخطوطے کے ہر صفحے کا اصل عکس چھاپا گیا ہے اوراس کے سامنے بائیں صفحے پر ان کا تیار کردہ ''متن'' موجود ہے۔ یہ طریقۂ تدوین ان کے کام پر جہاں اعتماد ویقین اور توثیق کی علامت ہے، وہیں اہل علم وتحقیق کے مطالعہ اور مقابلہ کے لئے آسانی بھی فراہم کرتا ہے۔ایک عام قاری بھی اس کا مطالعہ اور مشاہدہ کر کے مثنوی کے رنگ وآہنگ سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔اور اس عہد کی تہذیب و معاشرت اور روایت سے بخوبی واقف ہوسکتا ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب ہی کا کمال ہے کہ انھوں نے اس ناخواندہ متن کو تدوین اور مخطوطہ شناسی کے جملہ رموز وعلامات کی مدد سے قابلِ خواندگی بنایا، باوجوداس کے کہ نسخہ ناقص الطرفین، املا اور رسم الخط نامانوس، تسلسل واقعات کی بے ترتیبی، مختلف زبان و بیان کی ہم آہنگی اور کاتب کے طرزِ کتابت کی بے اصولی۔لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان تمام مسائل ومصائب کے باوجود قرأت وتصحیح اور ترتیب

وتدوین میں بڑی دیدہ ریزی، وسعتِ فکری، تعمّقِ نظری اوراز حد محنت ومشقت کا ثبوت دیا ہے۔انھوں نے اس مثنوی میں کاتب کے غلط تحریر کردہ درست اِملائی فہرست، ایک جامع فرہنگ، متذکرہ شخصیات اور بہمنی سلاطین کے احوال وآثار کے دوضمیمے بھی شامل کیے ہیں۔مثنوی کی ترتیب وتدوین میں ان تمام اصول وضوابط اور قواعد ومناہج کا سہارا لیا گیا ہے جو متن کی قرأت وتفہیم میں معاون ومدد ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ترتیبِ متن میں جدید اصول و مدارج اور قارئین کے رجحانات ودل چسپی کو مدنظر رکھا ہے۔عموماً پرانے متون سے قارئین بے رغبتی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔تحقیقی کاموں میں رغبتی اور دل چسپی برقرار رکھنے کے لیے ایسے دواعی فراہم کرنا از حد ضروری تھا۔اس لیے آپ کا اندازِ اسلوب اور طرزِ بیان ثقیل اور بوجھل نہیں ہے جو قارئین کی طبیعت پر گراں بار ہوتا۔ بلکہ اتنا صاف وشستہ ،سادہ ودل کش اور جاذبِ نظر ہے، کہ قارئین کو دمِ زدن کے لیے بھی بوریت اور اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔گویا نثر میں شعری حلاوت وشیرینی گھول دی گئی ہو اور تخلیقی نثر کا احساس ہوتا ہے۔

اس قدیم مثنوی کی تدوین کے لیے آپ نے دکنی تہذیب کے ادبی رجحانات ،لسانی وشعری پیکروں کا تاریخی اور فکری زاویے نظر سے مسلسل مطالعہ کیا ہے۔۶ سال کی انتھک کوشش اور جد وجہد کے بعد اس مشکل ترین مہم کو سر کرنے میں کامیاب ہوئے جس کے چند اوراق ہی دیکھ کر بیشتر اہل علم دست بردار ہو گیے تھے یا معذوری کا سہارا لیا تھا۔مگر ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس گوہر نایاب کو اردو ادب کے قصر سلطانی میں سجا اور سنوار کر تا اَبد کے لیے امر کر دیا اور سرمایۂ اردو ادب میں ایک عظیم اضافہ کیا۔جس پر دنیائے اردو زبان وادب تاحین زمانہ مفتخر رہے گی۔

حوالہ جات:

۱ تاریخ ادب اردو ڈاکٹر جمیل جالبی

۲ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ڈاکٹر جمیل جالبی مکتبہ،ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،دہلی ۱۹۷۹ء

۳ ''ڈاکٹر جمیل جالبی:''تاریخ ادب اردو'' گیان چند جین

۴ ماہ نامہ قومی زبان:''جمیل جالبی نمبر'' اکتوبر ۲۰۱۹

۵ ڈاکٹر جمیل جالبی:شخصیت اور فن عبدالعزیز ساحر

''کویت میں ادبی پیش رفت'' ایک ادبی مکالمہ

ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا
شعبہ اردو، کروڑی مل کالج
دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

ملخص

یہ حقیقت ہے کہ جناب افروز عالم صاحب اردو نثر اور علم وخدمت میں ایک بڑے مقام کے مالک ہیں، شاعری میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ان کی نظمیں اور غزلیں گہرے معانی کے سمندر میں ڈوبی ہوئی اور عصری حاضر کے سلگتے و دہکتے مسائل کا ترجمان ہیں۔جن میں ہمارے عہد موجود کی وہ سچائیاں اور حقیقتیں ہیں جن سے ہم آئے دن دوچار ہوتے ہیں ۔ افروز عالم صاحب کی مرتب کردہ کتاب'' کویت میں ادبی پیش رفت'' ایک ایسی ببلیگرافی ہے جس میں ہر طرح کا مواد موجود ہے جن میں تعارفی مضامین میں مقالات وعلمی مباحث کی تحریریں ہیں۔ افسانے خاکے اور کالم کے علاوہ مزاحیہ مضامین کے علاوہ وفیات کا ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں ہر طرح کے پھول ہیں اور ہر پھول کی خوشبو جداگانہ ہے۔

☆☆☆☆

اردو کی پیدائش اور نشوونما ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وثقافت کی دین ہے اس کے علاوہ اس کے اندر دوسری زبانوں کو قبول کرنے اور ان کی خصوصیات سے فائدہ اٹھانے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج اردو نہ صرف برصغیر ہند و پاک میں بولی اور لکھی جاتی ہے بلکہ دنیا کے درجنوں ممالک میں نہ صرف بولی سمجھی جاتی ہے بلکہ اس زبان میں کثرت سے اخبار ورسائل شائع ہوتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے بعض خطوں میں ہند و پاک سے ہجرت کر کے جا بسنے والے مہاجرین

کسی نہ کسی طور پر جہاں اپنی تہذیب اور مذہب سے وابستہ رہے وہیں اپنی زبان سے رشتہ قائم رکھنے اور اسے پروان چڑھانے میں کامیاب رہے۔ مگر جن نئی بستیوں میں ہندو پاک سے محنت مزدوری کرنے کی غرض سے افراد گئے ان میں موریشس، فیجی، سعودی عرب اور مشرق وسطی کے ممالک قابل ذکر ہیں جن میں کویت ایک اہم ملک ہے جہاں ہر سال لاکھوں افراد سیر و تفریح، ملازمت اور تجارت کی غرض سے سفر کرتے ہیں لہذا ایک اپنی رابطے کی زبان جسے اردو کہتے ہیں ان ممالک کی تہذیب و رہن سہن کا حصہ بن کر سامنے آتی ہے۔ اپنی جن خصوصیات کی وجہ سے اردو کی نشو و نما ہوئی تھی انھی وجوہات سے مشرق وسطی میں پروان چڑھی۔

جہاں تک ادبی سفر کا تعلق ہے تو ان ممالک میں رہنے والے مہاجرین نے اردو شعر و ادب کی بے پناہ خدمات انجام دی ہے مشاعرے یہاں کی تہذیبی زندگی کا اہم حصہ ہیں۔ کویت میں تقریباً ستر اسّی سال سے ادب و شعر کی روایت قائم ہے مگر اس پر کوئی مفصل معلوماتی کتاب موجود نہیں تھی، کسی مبسوط کتاب کی ضرورت بڑی شدت سے ایک عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی۔ اور اس کام کے لیے ایک مرد کامل کی ضرورت تھی جو اس خدمت کو بحسن وخوبی انجام دے سکے۔ آج جس شخصیت کو تہنیت پیش کرنے کے لیے یہ جلسہ منعقد کیا گیا ہے۔ برادرم افروز عالم صاحب نے اس کام پیڑا اٹھایا اور ان تمام تخلیقی کاوشوں کو جو اس خطّے میں قلمبند کی گئیں ان کے انتخاب کو یکجا کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کویت میں اردو تاریخ نویسی کا سنگ بنیاد برادرم موصوف نے ڈال دیا ہے۔ چونکہ خود وہ ایک ادیب و شاعر کا ذہن رکھتے ہیں اس لیے اس کام میں منصفانہ عمل دیکھنے کو ملتا ہے۔

ڈاکٹر افروز کسی تعارف کے محتاج نہیں مگر پروفیسر مظفر حنفی کی زبانی ان کا تعارف کر دیا جائے جس سے ان کی علمیت، علم دوستی اور تحقیقی ذہن کا انکشاف ہو سکے۔ مظفر حنفی لکھتے ہیں:

> ''افروز عالم پینتیس چھتیس برس کی عمر میں ہی ادبی دنیا کے ایک جانے پہچانے قلمکار بن گئے ہیں اور اس مرتبے پر فائز ہیں جہاں پہنچنے میں عام لکھنے والوں کو اتنے ہی سال لگ جاتے ہیں جتنی ان کی عمر ہے''۔

جناب افروز عالم صاحب کی مرتب کردہ کتاب ''کویت میں ادبی پیش رفت'' ایک ایسی ببلیگرافی ہے جس میں ہر طرح کا مواد موجود ہے جن میں تعارفی مضامین میں مقالات وعلمی مباحث کی

تحریریں ہیں۔ افسانے خاکے اور کالم کے علاوہ مزاحیہ مضامین کے علاوہ وفیات کا ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں ہر طرح کے پھول ہیں اور ہر پھول کی خوشبو جداگانہ ہے۔

اس مجموعہ کا دیباچہ اردو کے ایک ممتاز عالم اور ترکی کے ادیب و شاعر پروفیسر خلیل طوقار صاحب نے قلمبند کیا ہے۔ اس کتاب کی خوبی کا ذکر کرتے ہوئے اردو کی برصغیر کے باہر کے صورتحال پر اظہار خیال کرتے ہیں صاحب کتاب پر ان کا تبصرہ ملاحظہ ہو وہ رقمطراز ہیں۔

''افروز عالم صاحب کا شغل تو کمپیوٹر سائنس اور حساب کتاب سے تعلق رکھتا ہے لیکن ان کا یہ شغل ان کے ادب اور فنون لطیفہ سے دلچسپی کے سامنے حائل نہیں ہوا ہے۔ اس لیے انہوں نے مختلف اصناف سخن کے میدانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل ہو، نعت ہو یا مضامین ہوانہوں نے مختلف اصناف میں اپنا جوہر دکھاتے ہیں۔ افروز عالم صاحب پرواز لندن، بین الاقوامی جدا، سری نگر آمد۔ تحریک ادب، آجکل، مشاعر، اجرا، عالمی رنگ ادب، جیسے اردو کے موقر جرائد کی کویت میں نمائندگی کرتے ہیں، مختلف ادبی انجمنوں سے منسلک ہیں۔ اور مزید برآں متعدد تصانیف بھی ان کے قلم سے نکل ہیں۔ ''کویت میں ادبی پیش رفت'' کے عنوان سے شائع ہونے والی یہ تصنیف بھی اسی ہم جہت ہستی کا ایک معلومات افزوں تحفہ ہے''۔

ڈاکٹر افروز عالم صاحب کتاب کے مرتب ضرور ہیں مگر اس کتاب میں خود ان کے بے شمار اور اتنے اچھے مضامین ہیں کہ وہ ایک کتاب کے متقاضی تھے۔ مثلاً ''ریاست کویت کا تعارف''، ''کویت سے شائع ہونے والے اخبارات ورسائل''، ''بیر بہوٹی: ڈاکٹر کلبہ قیصر کی شاعری'' اور شخصیت کی عکاسی، قدآور شخصیت اور شاعر ماجد دیوبندی، کویت کی ادبی انجمنیں، نثر نگار جو کویت سے چلے گئے، ہر دل عزیز نور پیکار، کویت کے شعراء وادباء کی تصانیف، کویت کی نثری تصانیف اور کویت کی شاعرات وغیرہ مضامین کی لمبی فہرست ہے جو کہ خود ان کے علمی کمالیت ان کا رنگ نظریات اور ادب دوستی کے ضامن ہیں۔ ان کے مضامین کے عناوین سے لگتا ہے کہ انہیں سرزمین کویت سے بے پناہ محبت ہے اور جو بھی کویت کا مہمان ہوتا ہے گویا وہ ڈاکٹر افروز عالم صاحب کا مہمان ہے۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی بھی شاعر وادیب کی آمد سے فائدہ اٹھا کر ان کے اعزاز میں ادبی نشست کا انعقاد کیا جائے اور پھر روداد قلمبند کرنے تاریخ کے حوالے کیا جائے۔ اتنا علمی شغف بہت کم لوگوں میں دیکھنے کو ملتا۔

مشرف عالم ذوقی کی نظر میں افروز صاحب نئی بستیوں میں اردو کے معمار ہیں۔ ملاحظہ ہو:

''وہ ایک اچھے شاعر ہیں مگر نثر میں ان کی دلچسپی بھی شروع سے رہی ہے۔ شاعر تو ہر جگہ مل جاتے ہیں مگر نثر لکھنے والوں کو ایک جگہ جمع کرنا مشکل کام ہے۔ افروز صاحب نے عرق ریزی اور محنت سے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ محض اسے ایک ادبی کارنامہ کہہ کر خوش نہ ہوا جائے، بلکہ اس کتاب کے مطالعہ، تبصرے اور تنقید کے ذریعہ یہ کوشش ہونی چاہیے کہ کویت میں مقیم حضرات کی حوصلہ افزائی ہو۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اردو کی بستیاں آہستہ آہستہ سرحدوں سے باہر نکل کر نئے راستوں کو بنانے کی کوشش کر رہی ہیں اور سب کا تعاون ملا تو ان بستیوں سے ایسے ایسے چراغ روشن ہوں گے کہ ایک دن اردو دنیا ان جیالے متوالوں پر فخر کر سکے گی''۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نثری خدمات کے بعد اب ڈاکٹر افروز عالم کی شعری خدمات کا جائزہ لیا جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ جہاں وہ اردو نثر اور علم و خدمت میں ایک بڑے مقام کے مالک ہیں، شاعری میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں گہرے معانی کے سمندر میں ڈوبی ہوئی اور عصری حاضر کے سلگتے و دہکتے مسائل کا ترجمان ہیں۔ جن میں ہمارے عہد موجود کی وہ سچائیاں اور حقیقتیں ہیں جن سے ہم آئے دن دوچار ہوتے ہیں۔ بالخصوص فرقہ پرستی اور مغربی سامراج کی یلغار و مظالم اور زیادتیوں ،اسی طرح فرقہ پرست حکومتوں و سماجوں کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'تجھے دیکھنے کے بعد'، 'آج اور کل'، 'ظلمات'، 'الزام'، 'محبت'، 'حالات'، 'شعور دل سے'، 'کیا یہ ممکن ہے (شبنم کے لیے)'، 'کسٹمر کا ٹائم ہے'، 'سمئے'، 'خیال'......افروز عالم کی نظموں کے یہ چند عنوان برائے عنوان نہیں ہیں بلکہ ان میں گہری زندگی کے راز اور فلسفے مخفی ہیں۔ وقت کی کجرو چال ڈھال پر قدغن لگانے کی کوشش ہے اور اپنے دل و احساس کو بھی تسلیاں دینے کی تلقین ہے۔ گویا افروز عالم جنگ کے میدان میں ہیں جہاں دشمنوں نے ان کے ملک، ان کے وطن اور ان کی خاک کو تہس نہس کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے، اس محاذ سے افروز صاحب ،مرد و خواتین کو دعوت عام دے رہے ہیں کہ اگر وہ مرد ہیں تو میرے شانہ بشانہ ان ناگفتہ بہ حالات سے مقابلہ کریں اور اگر وہ خواتین ہیں تو اپنے آنچلوں کا پرچم بنا کر مجاہدین کا حوصلہ بڑھائیں، ان کے ارادو ں کو مضبوط کریں اور ان کی رگوں میں جوش و امنگ بھر دیں......افروز عالم کی ان نظموں کا لفظ لفظ اسی

پیغام کا پیامبر ہے اور اسی احساس کا ترجمان بھی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں چند نمونے درج کر دیے جائیں:

کبھی کبھی
بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا
اپنے وجود سے کہیں دور
کسی کوہ سے الجھ جاتا ہے
یوں
بھٹک کر تنہائیوں کی
بانہوں میں
پناہ لیتا ہے!
کبھی کبھی
یوں بھی ہوتا ہے
میرے وجود کے نہاخانے میں
سرکتی ہوئی کوئی صدا
اپنی سرگوشیوں سے
دل کو اداس کر دیتی ہے
کہ
بے رنگ موسموں کی کڑواہٹ سے
الفاظ کے سحر میں
خواہشات کے ہجوم تلے
فریب کے بھنور میں
الجھ کر
وہ روٹھ جائے تو......کیا ہو؟

مان جائے تو.....کیا ہو؟

’حالات‘

رفتہ رفتہ
معاف کرنے کا چلن
مدھم پڑتا جا رہا ہے
کیا تمھیں یقین نہیں؟
کہ
بدلتے ہوئے لمحوں کی چکی میں
اخلاقیات، روایات اور قدریں
پس رہی ہیں
آج ہمارا معاشرہ
بے غیرتی کے اس سنگم پر کھڑا ہے
جہاں
عورت کی پاکیزہ کوکھ
کرائے پر لینے کے لیے سودے بازی ہو رہی ہے
ہماری بے حسی نے
ہمارے لبوں پر خاموشی کی مہر ثبت کر رکھی ہے
تو اے اہل دل
کل
کیا ہوگا؟
جب معافی مانگنے کا چلن
ختم ہو جائے گا!

’آج کل‘

اہل زر ہر مفلس کو
پاگل
کہا کرتے ہیں
دراصل
ہوس کا وہ آخری مرحلہ
ہم جسے
پاگل پن کہتے ہی
کسی مفلس پر
طاری نہیں ہوتا
یہ تو
الزام ہے
جو
مفلس کے ماتھے کی
شوبھا ہے
جو اپنی کوکھ سے
کئی گناہوں کو جنم دیتا ہے
نئے جہان کی تعمیر کرتا ہے!

'الزام'

مرے سامنے
کئی کوندھتی تلواریں ٹوٹیں
دیکھتے دیکھتے
کئی سورما شہید ہوئے
خرد و جنوں کی میں نے

کئی جنگیں دیکھیں
میں نے دیکھا
سوریہ پتر کو بے بس ہوتے
کئی شاہوں کے اوندھے پڑے پرچم دیکھے
یہ اور بات کہ
خاموشی میری فطرت ہے
میری آنکھیں لیکن کبھی بند نہیں ہوتیں
بڑے طریقے سے میں سب پر وار کرتا ہوں
مجھے پرکھنے کی ضرورت کیا ہے
کہ
میں تو سمئے ہوں.....!

'سمئے'

یہ ہیں افروز عالم کی نظموں کے چند نمونے جن میں حرف حرف سچائی اور لفظ لفظ صداقت بھری ہوئی ہے۔ جو ہماری زندگی کی وہ حقیقتیں اور سچائیاں ہیں جن سے ہمیں کسی صورت مفر نہیں بلکہ اگر ہم کچھ وقت کے لیے ان کی طرف سے آنکھیں بند بھی کر لیں تو وہ خود ہمیں اس غفلت سے ہوش کی دنیا میں لا کھڑا کر دیتی ہیں جہاں ہمارا احساب ہوتا ہے اور ہم اپنے کیے ہر فعل، انفعال اور کرتوتوں کا حساب دیتے ہیں۔

جہاں تک افروز عالم کی غزل نگاری یا غزل تخلیقیت کی بات ہے تو پتا نہیں کیوں انھیں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان میں وہ رنگ اور وہ آہنگ نہیں ہے، نہ وہ گہرائی اور گیرائی بلکہ ان کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ابھی ان میں اور بھی بہت کچھ شامل کرنا باقی ہے۔ فن اور تکنیک سے قطع نظر، یہ غزلیں اردو ادب سے دل چسپی رکھنے والے حلقوں میں مقبولیت حاصل کرنے میں ناکام ہیں تاہم چند ایک غزلیں، جنھیں افروز عالم کی نمایندہ غزلیں کہا جا سکتا ہے، ان کے منتخب اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

جذبات کی ہر بات سے ہم جوجھ رہے ہیں
بگڑے ہوئے حالات سے ہم جوجھ رہے ہیں

آوارہ ہواؤں کا پتا کون بتائے
سازش کی عنایات سے ہم جوجھ رہے ہیں
کچھ بہہ گئے سیلاب میں کچھ پاس بچے ہیں
بے وقت کی برسات سے ہم جوجھ رہے ہیں
ہیں اہل جگر چار سو محور میں اہل حسن
اور تاروں بھری رات سے ہم جوجھ رہے ہیں
حائل ہیں خواہشات میں زلفوں کے پیچ و خم
اک شوخ کی حرکات سے ہم جوجھ رہے ہیں
افکار کی آغوش میں ہر فن ہے حسیں تر
بے وجہ کمالات سے ہم جوجھ رہے ہیں

☆☆☆

ہولے ہولے سے جو چلتی ہے ہوا، رات گئے
کھنچ کے رہ جاتی ہے یوں دل کی فضا، رات گئے
میری سانسوں میں ترے جسم کی خوشبو ہے بسی
دل میں جو شور مچاتی ہے صدا، رات گئے
تشنگی لب پہ سجائے ہوئے دل کہتا ہے
آج برسے گی مری چھت پہ گھٹا، رات گئے
ایک سایہ ہے میری زیست کا حاصل،جیسے
موم پگھلی تو بڑھی اور ضیا، رات گئے

☆☆☆

کوئی بادل، کوئی جھونکا، اے خلیج زندگی
خشک ہے آنکھوں کا دریا، اے خلیج زندگی
خاک میں سب کچھ ملایا، اے خلیج زندگی

کیا ملا ہے مجھ کو تحفہ، اے خلیج زندگی
جانے کب تک وقت کی ہم گتھیاں سلجھائیں گے
وقت تو ہے ایک معما، اے خلیج زندگی
ذہن کی بنجر زمیں سے آرہی ہے یہ صدا
پھر ہرا ہو کوئی پودا، اے خلیج زندگی
صبح کا بھولا ہوا کیا شام تک لوٹ جائے گا
فلسفہ یہ سچ ہے کتنا، اے خلیج زندگی
دور رہ کر باپ سے بیٹا تو پل ہی جائے گا
کون دے گا پر دلاسا، اے خلیج زندگی

☆☆☆

پتھروں کا سلسلہ اپنی جگہ
آنسوؤں کا قافلہ اپنی جگہ
کچھ مراسم ہیں ہمارے درمیاں
دوریوں کا مسئلہ اپنی جگہ
ٹھوکروں نے پاؤں چومے ہیں مرے
راستوں کا تجربہ اپنی جگہ
شوق منز ل سے مرا رخت سفر
گو کٹھن ہے مرحلہ اپنی جگہ

☆☆☆

داغ کی شاعری کا مکالماتی اسلوب

ڈاکٹر محمد نظام الدین

Mob:9718048854

E-mail.nizamindia9@gmail.com

ملخص

داغ دہلوی ایک منفرد اسلوب کے مالک ہیں۔ وہ دہلی وراثت کے محافظ اور عظیم روایات کے امین ہیں۔ داغ دہلوی دبستانِ دہلی کی خصوصیات کے علمبردار ہیں۔ وہ اپنے مخصوص لب ولہجہ اور نا قابل تقلید طرزِ نگارش کے لحاظ سے یکتائے روزگار ہیں۔

داغ کی شخصیت کی تعمیر اور رنگین شاعری کی تزئین میں لال قلعے کی فضا کا اہم حصہ ہے۔ لال قلعہ میں مغل سلطنت کی شمع گل ہو رہی تھی لیکن اردو شاعری کی محفل چراغاں تھی۔ قلعے میں داغ کو دنیا کی ساری نعمتیں اور آسائشیں میسر تھیں۔ داغ کے یہاں ایک چلبلا پن، شرارت، شوخی، چھیڑ چھاڑ، معشوق کو دوٹوک سنا دینا، محبوب پر طنز، بے نیازی و لاپروائی سے کام لینا اور کبھی کبھی اس کو خاطر میں بھی نہ لانا وغیرہ باتیں موجود ہیں۔

جہاں تک داغ دہلوی کے اسلوب اور طرزِ نگارش کا تعلق ہے تو وہ خود داغ کی شخصیت اور تعیش پسند زندگی کی عطا کردہ ہے۔ مزید اس پر قلعہ معلیٰ کا ماحول اور محلات کے قیام کا اثر نمایاں ہے۔ اسی سبب داغ کا طرزِ ادا انشاطیہ ہے اور ان

کے مزاج میں رعنائی ہے۔ ان کے یہاں محاورات، ضرب الامثال اور زبان کا ذائقہ بکثرت ہے۔ ان کے یہاں الفاظ کی نشست و برخواست استادانہ ہے۔ ان کے کلام میں سلاست اور سادگی بلا کی

ہے اور اس میں سحر آفرینی و رنگینی حد درجہ ہے۔ان کے اسلوب میں کہیں بھی آورد کا احساس نہیں ہوتا بلکہ آمد ہی آمد کا احساس موجزن ہے۔اس لیے داغ کا اسلوب ایک منفرد اسلوب ہے۔

☆☆☆

جہانِ شعر وسخن میں داغ دہلوی ایک منفرد اسلوب کے مالک ہیں۔وہ اپنی شاعرانہ عظمت کے ساتھ شاعری کے افق پر جلوہ گر ہیں۔وہ دہلی وراثت کے محافظ اور عظیم روایات کے امین ہیں۔داغ دہلوی دبستانِ دہلی کی خصوصیات کے علمبر دار ہیں۔وہ اپنے مخصوص لب ولہجہ اور نا قابل تقلید طرزِ نگارش کے لحاظ سے یکتائے روزگار ہیں۔انہوں نے اردو شاعری کو ایسی فصیح و بلیغ زبان اور ایسا دلکش اسلوب عطا کیا کہ جس کی نظیر اردو شاعری میں بمشکل ملتی ہے۔

داغ کی شخصیت کی تعمیر اور رنگین شاعری کی تزئین میں لال قلعے کی فضا کا اہم حصہ ہے۔لال قلعہ میں مغل سلطنت کی شمع گل ہو رہی تھی لیکن اردو شاعری کی محفل چراغاں تھی۔قلعے میں داغ کو دنیا کی ساری نعمتیں اور آسائشیں میسر تھیں۔داغ کے مزاج،ان کی شاعری،ان کے افکار ونظریات اور زندگی کے بارے میں ان کے رویے کی تہذیب و ترتیب میں ان سارے عناصر کی کارفرمائی تھی۔دہلی کے بعد داغ نے رام پور کا رخ کیا۔وہاں بھی ان کی زندگی خاصی اطمینان بخش گزری۔اس کے بعد حیدرآباد کی طرف کوچ کیا۔وہاں بھی دنیائے شعر وادب میں انہوں نے اپنا سکہ بٹھایا اور نواب میر محبوب علی خان کی سرپرستی ،فیاضی اور داد ودہش سے مستفید ہوئے۔غرضیکہ داغ کی زندگی رنگینیوں میں گزری ہے۔ان کی شاعری میں اسی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ان کے یہاں ایک چلبلا پن، شرارت، شوخی، چھیڑ چھاڑ، معشوق کو دوٹوک سنا دینا،محبوب پر طنز، بے نیازی و لاپروائی سے کام لینا اور کبھی کبھی اس کو خاطر میں بھی نہ لانا وغیرہ باتیں موجود ہیں۔

داغ نے اپنے مطلب کے اظہار کے لئے جس طرز بیان ،طریقۂ کار اور اسلوب کا سہارا لیا ہے، وہ بادِ نو بہار اور شاہانہ طرزِ زندگی سے عبارت ہے۔کیونکہ اسلوب ایک ایسا طرزِ بیان اور طرزِ تحریر ہے جس میں تخلیق کار اپنے داخلی اور خارجی عوامل کو ایک دلکش اور مؤثر پیش کش کی صورت میں اپنے قاری کے روبرو ہوتا ہے۔داغ کا اسلوب بھی جاذبِ نظر اور پرکشش ہے جو قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔

اسلوب کیا ہے؟ اسلوب کی اہمیت کیا ہے اور اسلوب عہد کو متاثر کرتا ہے یا عہد اسلوب کو؟ ان سوالات کے تسلی بخش جوابات اور تفصیلات کتابوں میں موجود ہیں، جن سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ یہاں افہام و تفہیم اور مناسبت کے لحاظ سے اتنا بیان کرنا موزوں ہے کہ اسلوب ایک طرز اظہار کا نام ہے جس سے تحریر میں جاذبیت اور کشش پیدا ہوتی ہے۔ جب کوئی فنکار اپنے مخصوص طرز نگارش میں کسی خیال کی ترسیل کرتا ہے تو وہی مخصوص طرزِ نگارش اس کا اسلوب کہلاتا ہے۔ اسلوب کی گتھی کو سلجھانے کے لئے ادیبوں نے بہت ریاضت سے کام لیا ہے۔ عابد علی عابد، سید عبداللہ، ممتاز شیریں، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، اور محمد احسن فاروقی نے اسلوب کے حوالے سے عرق ریزی اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔ یہاں چند ادیبوں کے قول کو نقل کیا جا رہا ہے تا کہ مفہوم واضح ہو جائے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''اسلوب سے مراد بات کو بلیغ انداز میں پیش کرنا ہے اور وہ تمام وسائل استعمال کرنا مراد ہے، جن سے کوئی ادبی تحریر موثر ثابت ہو سکتی ہو۔'' (طیف نثر۔ص:22)

عابد علی عابد نے لکھا ہے:

> ''اسلوب دراصل فکر و معانی اور ہیئت و صوت یا مافیہ و پیکر کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔'' (اسلوب۔ص:93)

دراصل زبان پر دسترس، صرف و نحو سے واقفیت، صنعتوں، علامتوں اور علمِ کلام سے شناسائی، اظہار و بیان کی نزاکتوں کا علم، الفاظ کا ذخیرہ، اسلوب کا خام مواد ہے۔ کیونکہ اسلوب خیالی دنیا میں تشکیل نہیں پاتا بلکہ ٹھوس الفاظ کے موزوں استعمال سے تعمیر ہوتا ہے۔ البتہ فنکار کی ذاتی کاوش اور فنی مہارت اسے ایک منفرد شکل دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ممتاز شیریں نے اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے، جو معقول معلوم ہوتا ہے۔ لکھتی ہیں:

> ''ایک برتن بنانے کے لئے سب سے پہلے مٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے مواد سمجھ لیجئے پھر اس میں رنگ ملایا جاتا ہے۔ یہ 'اسلوب' ہے۔ پھر کاریگر مٹی اور رنگ کے مرکب کو اچھی طرح گوندھتا، توڑتا،

مروڑتا، دباتا، کھینچتا، کسی حصے کو گول، کسی کو چوکور، کہیں سے لمبا، کہیں سے
گہرا کرتا اور مخصوص شکل پیدا ہونے تک اسی طرح ڈھالتا چلا جاتا ہے۔''

(معیار، اشاعت اول، لاہور، 1963، ص:17)

جہاں تک داغ دہلوی کے اسلوب اور طرزِ نگارش کا تعلق ہے تو وہ خود داغ کی شخصیت اور تعیش پسند زندگی کی عطا کردہ ہے۔ مزید اس پر قلعہ معلیٰ کا ماحول اور محلات کے قیام کا اثر نمایاں ہے۔ اسی سبب داغ کا طرزِ ادا انشاطیہ ہے اور ان کے مزاج میں رعنائی ہے۔ ان کے یہاں محاورات، ضرب الامثال اور زبان کا ذائقہ بکثرت ہے۔ ان کے یہاں الفاظ کی نشست و برخواست استادانہ ہے۔ ان کے کلام میں سلاست اور سادگی بلا کی ہے اور اس میں سحر آفرینی و رنگینی حد درجہ ہے۔ ان کے اسلوب میں کہیں بھی آورد کا احساس نہیں ہوتا بلکہ آمد ہی آمد کا احساس موجزن ہے۔ اس لیے داغ کا اسلوب ایک منفرد اسلوب ہے اور اُسے داغ سے جدا کرنا ناممکن ہے۔

داغ کو امامِ فن ہونے میں خود ان کے شاعرانہ بانکپن اور شوخیٔ بیان کو دخل ہے۔ اقبال کی زبان میں:

اب کہاں وہ بانکپن، وہ شوخی ٔ طرز بیاں
آگ تھی کافور پیری میں جوانی کی نہاں

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن ، مارے گا دل پر تیر کون

داغ نے جس وقت شاعری کا آغاز کیا اس وقت غالب، مومن، ذوق اور بہادر شاہ ظفر کی شہرت ہر سو تھی۔ غالب فلسفیانہ مضامین کے دریا بہار ہے تھے۔ مومن معاملہ بندی میں اپنی شناخت بنا چکے تھے۔ ذوق زبان و محاورے پر زور دیئے ہوئے تھے۔ ظفر مشکل ریف اور قافیے میں طبع آزمائی کر رہے تھے۔ ایسے سخنوروں کے درمیان انفرادی پہچان بنانا داغ کے لئے کسی چیلنج سے کم نہ تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی افتادِ طبع کے سبب اپنی راہِ سخن اور طرزِ گفتار الگ بنائی۔

رام بابو سکسینہ نے داغ کی شاعرانہ عظمت پر مفصل گفتگو کی ہے۔ داغ کی شاعری کے تمام

پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ رام بابو سکسینہ نے داغ کی شاعرانہ عظمت کے راز سے پردہ اٹھایا ہے اور انہوں نے ان کی عظمت کا راز تین چیزوں کو قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''داغ کی عظمت ان تین چیزوں پر موقوف ہے۔یعنی (۱) ان کی عام شہرت (۲) ان کا خاص طرز (۳) وہ خدمات جو انہوں نے زبان کے ساتھ انجام دیں۔ داغ میٹھی، سریلی اور عاشقانہ شاعری کے مسلم الثبوت استاد ہیں، ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پیچیدہ اور گنجلک ترکیبوں اور موٹے موٹے غیر مانوس فارسی اور عربی الفاظ کو انہوں نے اپنے کلام میں جگہ نہیں دی، اس سے ان کا کلام تصنع اور تکلف سے خالی ہے۔ الفاظ نہایت سادہ اور معمولی، ترکیبیں سیدھی سادی اور درست۔ بندش نہایت چست، شعر کی ظاہری زیب وزینت یعنی صنائع بدائع کی کثرت اور دور از کار تشبیہوں اور مبالغہ اور حشو وزائد سے پاک ہے.......ان کے اشعار کسی نہ کسی جذبہ، انسان کے سچے فوٹو ہیں اور چونکہ ان جذبات کا اظہار نہایت سلیس اور عام فہم عبارت میں ہوتا ہے۔ اس لیے وہ دلوں پر ہمیشہ تیر ونشتر کا کام دیتے ہیں۔'' (مقدمہ منتخبات داغ، احسن مارہروی، ص:و)

مذکورہ اقتباس گرچہ طویل ہے لیکن داغ کے اسلوب کو سمجھنے میں کافی حد تک معاون ہے۔ داغ کی شاعری کے مطالعے کے بعد ان کے اسلوب کی چند خاصیتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔ وہ یہ ہیں:

☆ داغ کے اسلوب کا کمال ہے کہ ان کا کلام سننے والے کے دل پر فوری اثر کرتا ہے۔ تاثیرِ سخن میں داغ کو ملکہ حاصل ہے۔

☆ داغ قدرتی شاعر ہیں، جنہیں قدرت نے بہترین اسلوب عطا کیا ہے۔

☆ داغ کے اشعار زبان حال سے پکار کر کہتے ہیں کہ ہم داغ کے اشعار ہیں۔

☆ داغ اپنے اسلوب کے موجد ہیں کسی کے مقلد نہیں۔

☆'گلزار داغ' اور' آفتاب داغ' میں شاعری کی تمام خصوصیتیں موجود ہیں۔شیرینی بیان اور لطف زبان قابل رشک اور دلنشیں ہیں۔

☆داغ کے یہاں فصیح الفاظ، چست بندش اور موزوں محاورات کا استعمال خوب تر ہے۔

☆داغ کا اسلوب شوخی بیان ہے۔داغ کی پرورش و پرداخت چونکہ قلعہ معلیٰ میں ہوئی تھی، اس لئے ان کی طبیعت میں شوخی پن درآنا لازمی تھا۔

☆داغ کے کلام میں جدتِ ادا کامیابی کی آخری منزل پر ہے،جس کے سبب ان کے کلام میں بے ساختگی موجود ہے۔

☆داغ کا اسلوب صاف اور بالکل واضح ہے۔تعقید اور پیچیدگی سے پاک ہے۔غیر مانوس الفاظ اور تراکیب سے عاری ہے۔

☆داغ نے اپنے اسلوب اور سہل زبان کے ذریعے اردو اور ہندی کا تنازع بہت حد تک کم کردیا ہے۔

☆داغ نے اپنے کلام میں ہندی الفاظ کے استعمال سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔

☆زبان کو آسان اور سہل بنانے کے لئے داغ نے اپنے اردگرد کے بول چال اور محاوروں کا استعمال بہتر ڈھنگ سے کیا ہے۔

☆داغ سے زیادہ کسی اور شاعری نے آسان،سہل اور منفرد لب ولہجہ میں کلام پیش نہیں کیا۔

داغ کی شاعری کے بارے میں عام رائے ہے کہ حسن و جمال کی رعنائیوں سے لذت حاصل کرنے کی تمنا، کیف و مستی کی فضاؤں سے سرور لینے کی آرزو، بھرپور شباب کی رنگینیوں میں ڈوبے رہنے کی ہوس اور جنسی خواہشوں کے غلبے کے ساتھ حسین عورتوں کی جوانی سے تلذذ حاصل کرنے کی حسرت ہی داغ کے لئے سب کچھ تھی۔یہی وہ تمام باتیں ہیں جو داغ کی شاعری کو آفاقی بننے میں رکاٹ بنیں،لیکن اس کے باوجود ان کی آواز میں ایک کھنک اور ان کے رنگ و آہنگ میں ایک گرج ضرور پیدا ہوگئی، جو اس وقت کی آواز اور اسلوب سے ممتاز تھی۔

داغ کی شاعری میں ہجر کی باتیں کم اور وصال کے قصے زیادہ ہیں۔انہوں نے محبوب کو پانے کی کبھی کوشش نہیں کی بلکہ محبوب خود ان کا ہوگیا۔ان کے کلام میں محبوب کے حسن کا ذکر، رنگِ رخ،

خدوخال اور لب ورخسار کی حکایات زیادہ ہیں ،اسی لئے داغ نے ان کو کئی طرح سے بیان کیا ہے۔متکلم کے مکالماتی اسلوب سے پُر یہ اشعار دیکھیئے :

قیامت ہے بانکی ادائیں تمہاری ادھر آؤ لے لوں بلائیں تمہاری
تم کو چاہا تو خطا کیا ہے بتادو مجھ کو دوسرا کوئی تو اپنا سا بتادو مجھ کو

خاطر سے یالحاظ سے میں مان تو گیا جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
دل لے کے مفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا
دیکھا ہے بت کدے میں جواے شیخ کچھ نہ پوچھ ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا
ہوش وحواس وتاب و تواں جاچکے ہیں داغ
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

خاطر سے یالحاظ سے میں مان تو گیا جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
دل لے کے مفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا
دیکھا ہے بت کدے میں جواے شیخ کچھ نہ پوچھ ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

کب کسی درکی جبہہ سائی کی شیخ صاحب نماز کیا جانیں
جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے آپ بندہ نواز کیا جانیں

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے دل سے سب کچھ بھلادیا تونے

زبان کی لطافت اور روانی کے اعلیٰ نمونے جو داغ کے یہاں ملتے ہیں وہ کہیں اور نہیں ملتے۔ ان کے یہاں عشق کی نیرنگیاں کم اور عشق بازیاں زیادہ ہیں جو اثر دار زبان کے سہارے آگے بڑھتی ہیں۔ ان کے یہاں دلی کی ٹھیٹھ زبان ایک خوشگوار اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔سرور ونشاط سے لبریز لب ولہجہ اور دلی کی بولی وزبان پر مکمل دسترس داغ کی شاعری کی مقبولیت کا راز ہے۔داغ کے یہاں خوبصورت اشعار کا تصور رنگینیٔ بیان سے وابستہ ہے اور سادگی سے بھی۔بقول فراق گورکھپوری:

''دلی کی بولی ٹھولی اپنی پوری موج زنی کے ساتھ داغ کی غزلوں میں لہرا رہی ہے۔ داغ کے لئے رائے عامہ بالکل سچائی پر تھی کہ یہ شخص زبان کا لا ثانی جادوگر ہے۔ اردو شاعری نے داغ کے برابر کا فقرہ باز آج تک پیدا کیا ہے اور نہ آئندہ پیدا کر سکے گی۔...داغ کا تغزل سراسر واسوخت سہی لیکن اس کا بے پناہ قوتِ اظہار کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔''(نگار، اپریل۔1953)

داغ کی شاعری کے تیور بڑے بانکے ہیں۔ ان کی شاعری روایتی شاعری سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے بھی کچھ نئے پن کی حامل نظر آتی ہے اور ان کے مخصوص مزاج کی دین ہے۔ داغ کے مزاج اور ان کے منفرد اسلوب نے اردو شاعری کے روایتی موضوعات کو نیا رنگ و آہنگ دیا۔ معشوق سے داغ کا رویہ، رقیب سے برتاؤ اور زاہد و ناصح سے مراسم، ان سب میں داغ نے اپنے جاہ و جلال کو برقرار رکھا ہے۔ ان کی مقبولیت کا اصل سبب ان کے اسلوب اور لہجے کی طرح داری ہے۔

آپ کے سر کی قسم، داغ کو پروا بھی نہیں آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارمان ہوگا

کیا سمجھتے ہو تم اپنے آپ کو خوب رویوں سے جہاں خالی نہیں

پوچھے تو کوئی حضرتِ واعظ سے اتنی بات ایسے ہی تھے جناب کیا عہد شباب میں

داغ اپنی لذت پرستی، عیش کوشی اور ہوسناکی کے باوجود اپنے آس پاس کے ماحول سے لاعلم نہیں تھے۔ دلی کیا ویران اور برباد ہوئی داغ کا دل ویران و برباد ہو گیا۔ اجڑتی دلی کو دیکھ کر داغ بے قرار ہو گئے اور درد سے ان کا دل تڑپنے لگا، اس کا اثر ان کے اسلوب پر گہرا پڑا، جس کی جھلک 'شہر آشوب' میں ملتی ہے۔ 'شہر آشوب' کو داغ نے ایسا اسلوب عطا کیا ہے جو بے مثل اور بے عدیل ہے۔ کہنے کو تو 'شہر آشوب' ایک غزل ہے لیکن وہ دل اور دلی کا مرثیہ ہے۔ اسے داغ کی فنی صلاحیت اور اسلوبیاتی مہارت نہ کہا جائے تو پھر کیا کہا جائے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یوں مٹا جیسے کہ دہلی سے گمانِ دہلی تھا مرا نام ونشان، نام ونشان دہلی

آسماں پر سے بھی نوحے کی صدا آتی ہے کیا فرشتے بھی ہوئے مرثیہ خوانِ دہلی

مندرجہ ذیل شعر میں بھی داغ کا بیانیہ اسلوب لاجواب ہے، جس میں دہلی کی تباہی و بربادی کا

منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے:

لوگ کہتے ہیں بنا، دلی بگڑ کر لکھنؤ پر کہاں اے داغ اس اجڑے ہوئے گھر کا جواب

داغ دلی تھی کسی وقت میں یا جنت تھی سیکڑوں گھر تھے وہاں رشکِ ارم، ایک نہ دو

'شہر آشوب' سے داغ کی وطن پرستی اور وطن پرستی کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا کہ وہ صرف معاملہ بندی، گل وبلبل اور حسن و جمال ہی کے شاعر تھے بلکہ دہلی کی بربادی اور مغلیہ سلطنت کی شکست وریخت کے مصور بھی تھے۔ بقول فراق گورکھپوری: 'مغلیہ خاندان کی تلوار کی فاتحانہ شان اور چکا چوند کردینے والی چمک دمک جب زندگی اور جذبات کی تاریک پستیوں میں اپنے جلوے دکھاتی ہے تو وہ داغ کی شاعری بن جاتی ہے'۔

داغ نے اپنی شاعری میں انسانی جذبات واحساسات کے اظہار کے لئے رموز وعلائم کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔ معنی خیز استعاروں اور تشبیہوں کا ایک جہانِ تازہ تعمیر کیا ہے۔ تراکیب اور مرکبات وضع کئے ہیں۔ اس طرح انہوں نے اپنے اندازِ بیان اور اسلوب میں ایک تازگی وندرت بھر لی ہے۔

داغ کی شاعری کے مطالعے کے بعد یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ ان کے یہاں لذت پرستی اور جنسیت کی فراوانی بھی ہے، لیکن اس کے باوجود بہت کم اشعار ایسے ہوں گے جہاں وہ تہذیب کے دائرے سے باہر ہوئے ہوں۔ انہوں نے اپنے عہد کی اعلیٰ تہذیبی اقدار کا بھرپور لحاظ رکھا ہے۔ اگر کچھ اشعار مذاق سلیم پر گراں گزرتے ہیں تو انہیں داغ کی پرورش اور ماحول پر محمول کرنا چاہئے۔ ذیل کے اشعار دیکھئے، جس میں داغ کا اسلوب مذاق سلیم کے خلاف معلوم ہوتا ہے:

شب وصل ایسی کھلی چاندنی وہ گھبرا کے بولے سحر ہوگئی

لے شب وصلِ غیر بھی کاٹی ہم کو تو آزمائے گا کب تک

شب وصل ایسی کھلی چاندنی وہ گھبرا کے بولے سحر ہوگئی

لے شب وصلِ غیر بھی کاٹی ہم کو تو آزمائے گا کب تک

تم کو ہے وصل غیر سے انکار اور ہم نے جو آکے دیکھ لیا

کس نے کہا کہ داغ وفا دار مرگیا وہ ہاتھ مل کے کہتے ہیں کیا یار مر گیا

داغ محبوب کے ساتھ جس خودداری اور جس وقار کے ساتھ ہم کلام ہوتے ہیں اس سے عشق کے وقار میں اضافہ اور عاشق کے کردار میں عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ معشوق کو منانے اور خوش کرنے کے لئے شعراء نے طرح طرح کے پیرایۂ بیان اختیار کیے ہیں۔ اپنی مرتبت اور منزلت کا احساس دلانے کے لئے نئے نئے طریقے اپنائے ہیں۔ اس سلسلے میں داغ کا انداز ہی جداگانہ ہے۔ انہوں نے محبوب کو خوش کرنے کے لئے کئی تدابیر جتن کئے ہیں۔ داغ محبوب سے اظہارِ مطلب کے وقت اپنے چہرے پر مصنوعی نقاب نہیں ڈالتے بلکہ اپنے آپ کو حقیقی صورت میں ہی پیش کرتے ہیں۔ داغ اپنی محبوب کو منانے کے لئے شگفتہ بیان اور پرکشش طرزِ اظہار کا سہارا لیتے ہیں۔ جب وہ محبوب سے ہم کلام ہوتے ہیں تو کچھ اس انداز سے ہوتے ہیں:

شب وصل ایسی کھلی چاندنی وہ گھبرا کے بولے سحر ہوگئی
لے شب وصلِ غیر بھی کاٹی ہم کو تو آزمائے گا کب تک

تھے کہاں رات کو آئینہ تو لے کر دیکھو اور ہوتی ہے خطاوار کی صورت کیسی
آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں آپ سے ملنے کا ہوگا جسے ارمان ہوگا
تمہیں کہو کہ کہاں تھی یہ وضع، یہ ترکیب ہمارے عشق نے سانچے میں تم کو ڈھال دیا

کیا کہا؟ پھر کہو، ہم نہیں سنتے تیری نہیں سنتے تو ہم ایسوں کو سناتے بھی نہیں

شاعری میں رقیب کا اہم رول ہوتا ہے۔ وہ عاشق کو بہت کچھ کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ رقیب کو دیکھ کر شاعر کے نظریے میں تبدیلی آتی ہے۔ شاعر کا لب ولہجہ، طرزِ ادا، اندازِ گفتگو اور اندازِ تخاطب بدل جاتا ہے۔ داغ کے بھی رقیب پیدا ہوگئے تھے۔ منی بائی حجاب سے داغ بھی عشق لڑاتے تھے اور دیگر زندہ دل افراد بھی۔ اس کے علاوہ داغ کے دوسرے محبوب سے بھی رقیب تھے۔ اس لئے داغ اپنے آپ کو عاشقِ صادق اور دوسروں کو رقیبانِ روسیاہ سمجھتے تھے۔ ان رقیبوں کے سبب ان کے لب ولہجہ اور شعری طرزِ سخن میں نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں جو تیور ہے وہ رند ورقابت کے جذبات اور لب

ولہجہ میں طنز وتعریض کی آمیزش کے سبب ہے۔ ایسے موقع پر داغ کے طرزِ تخاطب اور اسلوب میں سختی آ جاتی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

تمھارے خط میں نیا اک سلام کس کا تھا — نہ تھا رقیب تو آخر وہ نام کس کا تھا
کچھ اور دل لگی نہیں اس خوش نصیب سے — ہم جانتے ہیں کھیلتے ہو تم رقیب سے
ہر اک سے کہتے ہیں کیا داغ بے وفا نکلا — یہ پوچھے ان سے کوئی وہ غلام کس کا تھا
تمہیں رقیب نے بھیجا کھلا ہوا پرچہ — نہ تھا نصیب لفافہ بھی آدھ آنے کا

داغ کی شاعری کا محور ومرکز بزم آرائیاں ہیں۔ یہ بزم ایک طرف محبوب کا شبستان، نغمہ وشعر، جام ومینا اور انداز وادا ہے تو وہیں وصل کی آروزو اور ہجر کا دھڑکا بھی ہے۔ بزم آرائی کی جان اندازِ گفتگو ہے۔ جہاں فرصت اور فارغ البالی ہوگی وہاں بزم آرائی یقینی ہے۔ اور جس شاعر کی زندگی میں فارغ البالی وبزم آرائی ہوگی، اس کا شاعرانہ اسلوب نشاطیہ اور خماریہ ہوگا۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

سُن سُن کے تیرے عشق میں اغیار کے طعنے — میرا ہی کلیجا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
اُن کا یہی سننا ہے کہ وہ کچھ نہیں سنتے — میرا یہی کہنا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
ناروا کہیے ناسزا کہیے — کہیے کہیے مجھے برا کہیے
آپ اب میرا منہ نہ کھلوائیں — یہ نہ کہیے کہ مدّعا کہیے

تو نے کی غیر سے کل میری بُرائی کیوں کر — گر نہ تھی دل میں تو لب پر تیرے آئی کیوں کر
آئینہ دیکھ کے وہ کہنے لگے آپ ہی آپ — ایسے اچھے کی کرے کوئی بُرائی کیوں کر
وہ یہاں آئیں وہاں غیر کا گھر ہو برباد — اس طرح سے ہو صفائی میں صفائی کیوں کر

تم سے وفا جو کی ہے ہم سے خطا ہوئی ہے — ایسا قصور کیوں کر انسان کر کے بھولے
تم جو آنا تو چار آنسو گرا کے جانا — ذرا رہے پاس آبرو بھی کہیں ہماری ہنسی نہ کرنا

تم کو کیا ہر کسی سے ملنا تھا — دل ملا کر مجھ ہی سے ملنا تھا

پوچھتے کیا ہو کیوں لگائی دیر — اک نئے آدمی سے ملنا تھا
مل کے غیروں سے بزم میں یہ کہا — مجھ کو آ کر سبھی سے ملنا تھا
جانتا ہوں کہ میری جان ہے تو — اور میں جان سے بیزار یہ کیا

داغ کی زبان اوراسلوب کے حوالے سے ڈاکٹر کامل قریشی نے عمدہ تحریر کا نمونہ پیش کیا ہے۔ ان کی تحریر سے مختصر اقتباس نقل کیا جارہا ہے جو داغ کے اسلوب کی تفہیم میں معاون ہے:

''داغ نے معاملاتِ عشق وعاشقی کے اظہار کے لئے جو زبان استعمال کی ہے وہ بالکل ایک الگ موضوع ہے، جس پر سیر حاصل گفتگو درکار ہے۔ زبان کے وہ بادشاہ ہیں۔ دراصل ان کی زبان ہی ہے جس میں روزمرہ محاورات کے بے تکلف استعمال کے ذریعے انہوں نے نازک سے نازک مسائل اور معاملاتِ حسن وعشق کو اتنے سادہ وآسان انداز میں پیش کردیا کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ وہ اس میدان میں تنہا دکھائی دیتے ہیں۔ اگر داغ نہ ہوتے تو یہ حقیقت ہے کہ ہماری شاعری کو وہ زبان نہ ملتی جو غزل کی صورت میں ہم تک پہنچی ہے۔ انہوں نے جو سادہ اور سلیس زبان استعمال کی ہے اور اسے جو چٹخارہ دیا، جس کیف وسرور سے مالا مال کیا کہ سننے والا وجد ہی کیا رقص میں آجائے۔ یہ بات ہماری زبان کی تاریخ کا سنہرا باب ہے''۔(داغ۔حیات اور کارنامے۔ص:123)

الغرض، شاعری میں داغ نے اپنے خیالات کی ترسیل کے لئے جس اسلوب کا سہارا لیا ہے ،وہ شوخیٔ بیان اور بانکپن کا حامل ہے۔داغ کے رنگین اسلوب میں قلعہ معلیٰ اور عیش پرست طرزِ زندگی کا بھی اہم رول ہے۔اس لئے داغ کے اسلوب کو داغ سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے۔

☆☆☆

ادبِ اطفال کے تین اہم فکشن نگار

محمد اختر
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

ملخص

کہانی نہایت قدیم صنف وسخن ہے۔ انسان کی زندگی میں گزرنے والے واقعات ہی کہانی ہوتے ہیں۔ بچوں کے ادب میں جو کہانیاں لکھی جارہی ہیں وہ طویل بھی ہوتی ہیں اور مختصر بھی۔ ان کہانیوں میں کسی انسانی زندگی کو لیکر ان کے مختصر واقعات کو چھوٹی کہانیوں میں بیان کیے جا سکتے ہیں۔ اور اس کی زندگی کا ایک بڑا حصہ اگر بیان کیا جائے اور اس کے ساتھ پیش آنے والے تمام واقعات بیان کر دیا جائے جائیں تو کہانی طویل ہوگی۔ ہم روزمرہ کی زندگی کے واقعات کو کہانی کے روپ میں پیش کر سکتے ہیں۔ ہر انسان کی زندگی میں بہت سی دلچسپ کہانیاں چھپی ہوئی ہیں۔ اسے تحریر کر دیا جائے تو وہ کہانی بن جائے گی۔ حضرت آدمؑ اور حواّؑ اس دنیا میں سب سے پہلے آئے ان کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو لوگ آج بھی بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح مشہور و معروف شخصیت کے واقعات کو ادیبوں نے قلم بند کیا جو بچوں کے لیے معلوماتی کہانی کے زمرے میں آتی ہیں۔ یوں تو حضرت آدمؑ اور دادی حواّ کے واقعات آج بھی سنائے جاتے ہیں جن میں حضرت آدمؑ کے علاوہ ہابل اور قابیل کا قصہ بھی شامل ہیں۔ اس سے ذرا آگے بڑھتے ہیں تو انسان جنگلوں میں اپنی زندگی کے اوقات گزرا کرتے تھے۔ ان کی غذا بھی جنگلی جانور ہوا کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ انسان ترقی کرتا ہوا جنگلوں سے نکل کر جھونپری میں آئے اور پھر کچے مکان سے ہو کر پکے اور عالی شان محلات میں زندگی بسر کرنے لگے۔ غرض یہ کہ ہر زمانے نے اپنے پیچھے بہت سے واقعات چھوڑے ہیں۔ یہی واقعات انسانی زندگی کو سنوارتی ہیں اور بہت کچھ زندگی کو دیتی بھی

ہے۔کہانیاں انسانوں کے دل بہلانے کا ذریعہ ہوتی ہیں۔تو دوسری طرف اپنے دور کی معاشرتی و تہذیبی زندگی سے روشناس کراتی ہیں۔کہانیاں ہر زمانے میں مقبول رہیں۔کبھی بزرگوں نے اپنے خاندان کے بچوں کو کہانیاں سنائی تو کبھی وقت گزاری کے لیے قصہ گوئی کی محفلیں سجی۔کبھی کتابوں کے ذریعہ کہانیاں پڑھی گئی۔غرض کہ قصہ کہانی کی روایت بہت قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔

☆☆☆☆

مرزا عظیم بیگ چغتائی: مرزا عظیم بیگ چغتائی ناول نگار، افسانہ نگار، مزاح نگار اور ڈراما نگار ہیں۔انھوں نے بچوں کے لیے بھی ناولیں لکھیں جو کافی مقبولیت حاصل کی۔ویسے عظیم بیگ چغتائی کی شہرت کا سبب ان کی مزاح نگاری رہی ہے۔آپ کی پیدائش 1895ء کو جودھ پور میں ہوئی۔آپ کے والد محترم مرزا قسیم بیگ چغتائی کلکٹر کے فرائض سے سبکدوش ہوئے تھے۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، اور اٹاوہ اسکول سے آگے کی پڑھائی مکمل کی۔اعلی تعلیم کی غرض سے علی گڑھ کا رُخ کیے اور یہاں سے ایل ایل بی کی سند پائی۔عظیم بیگ چغتائی بچپن سے ہی ذہین بچوں میں شمار کیے جاتے تھے اور آپ عمر کی ابتدائی دور سے ہی قصّہ کہانیوں میں دلچسپی لیا کرتے تھے۔ہم عمروں میں گفتگو کے دوران ہنسی مذاق کا ماحول پیدا کیا کر دیتے تھے۔قدرت نے عظیم بیگ چغتائی کی زندگی میں بیماری ایسی عطا کی کہ وہ عمر کی آخری دہلیز تک ساتھ رہا۔اس وجہ سے آپ کا جسم کمزور رہا ہمیشہ بے سکونی کی زندگی بسر کی۔آپ کی تیمارداری والدہ کیا کرتی تھیں۔آپ کی موت کا سبب دق کی بیماری رہی اور اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی ایک زندہ دل انسان تھے۔ان کی زندہ دلی انکی تحریروں میں نمایاں ہیں۔وہ جس قدر کمزور اور ناتواں تھے لیکن آپ کا کردار طاقت ور، شرارتی، اور بہادری کی مثال دی جاتی تھی۔عصمت چغتائی جو آپ کی چھوٹی بہن ہیں۔اور انھوں نے آپ کی شخصیت پر دوزخی کے عنوان سے بہترین خاکہ لکھی ہیں۔جن میں وہ عظیم بیگ چغتائی کی بیماری، کمزوری کا ذکر کرتی ہیں اور ساتھ ہی آپ کے کرداروں پر روشنی بھی ڈالتی ہیں۔ایک جگہ وہ لکھتی ہیں کہ:

''کھریا بہادر جس کا پہلا ٹکڑا روح لطافت میں چھپا

ہے۔ یہ سب تخیلی ہے۔ لاچار مجبور انسان اپنے ہمزاد سے دنیا
جہاں کی شرارتیں کروالیتا ہے وہ خودتو دوقدم نہیں چل سکتا لیکن
ہمزاد چوریاں سرتا شرارتیں کرتا ہے۔خودتو ایک انگلی کا بوجھ نہیں
سہار سکتا، مگر ہمزاد جی بھر کر مار کھاتا ہے اور ٹس سے مس نہیں
ہوتا۔ مصنف کو ارمان تھا کہ کاش وہ بھی اتنا مضبوط ہوتا کہ
دوسرے بھائیوں کی طرح ڈیڑھ ڈیڑھ سو جوتے کھا کر کمر جھاڑ کر
اُٹھ کھڑا ہوتا۔''

مرزا عظیم بیگ چغتائی کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔''مرزا جنگی'' کے عنوان سے ایک ڈراما بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ناولٹ ''آدم خوروں کے قصے'' شائع ہو چکے ہیں۔آپ کی تخلیقات کا سرمایہ وسیع ہیں۔عظیم بیگ چغتائی کسی ایک میدان کے کھلاڑی نہیں ہیں۔ بیک وقت ناول نگار، افسانہ نگار، ڈراما نگار اور مزاح نگار ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کے تمام صنفوں میں آپ کی تخلیقات شائع ہو چکی ہیں۔عظیم بیگ چغتائی اپنی کتاب آدم خور میں لکھتے ہیں کہ:

''جنگلیوں اور آدم خوروں کے حالات لکھنا اور
پڑھنا میرا زمانہ طالب علمی کا پرانا شوق ہے جو بدستور جاری
ہے۔میری زندگی کی ابتدا ہی کتابوں کی تصنیف سے ہوئی''۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی کی تخلیقات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو مصنف کی ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی کہانیوں میں واقعات در واقعات انوکھے اور دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔زندگی میں آنے والی مشکلات اور ان کا حل، یہ تمام چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔آپ کے ادبی کارنامے دادِ تحسین کے لائق ہیں۔ پھر بھی ادبی دنیا میں ان کا جو مقام ہونا چاہئے تھا وہ انھیں نصیب نہیں ہوا۔

اردو ادب کے مختلف صنفوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے وہیں عظیم بیگ چغتائی نے بچوں کے ادب پر بھی اپنا قلم چلایا ہے۔''قصر صحرا'' اردو کا پہلا ناول ہے جو بچوں کے لیے تحریر کیا گیا ہے۔ ''قصر صحرا'' کے واقعات دلچسپ اور انوکھے ہیں۔اس ناول میں ایک ترک خاندان کی کہانی بیان کی گئی

ہے۔جنھیں جلاوطنی کا درد سہنا پڑا۔عظیم بیگ چغتائی نے بچوں کے لیے ایک اور ناول تحریر کیے ہیں جس کا عنوان ''بحر جنوبی کا سفر'' ہے۔

سراج انور: سراج انور ادبی دنیا میں ناول نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔انھوں نے متعدد کہانیاں بھی لکھی ہیں۔سراج انور ادب اطفال کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔بچوں کے لیے انھوں نے کئی ناول تخلیق کیا جن میں ''خوفناک جزیرہ'' 1969ء میں شائع ہوا۔''کالی دنیا'' ان کا دوسرا ناول ہے جو 1972ء میں منظر عام پر آیا۔تیسرا ناول ''نیلی دنیا'' اور چوتھا ناول ''دوڑتا جنگل'' 1986ء میں شائع ہوا۔سراج انور کم عمری سے ہی ادبی دنیا میں قدم رکھا۔اور تخلیق کا آغاز بچوں کی کہانی سے ہی کی۔آپ کی پہلی کہانی ''پتنگ'' ہے جو 1943ء میں رسالہ ''بچوں کا باغ میں شائع ہوئی۔سراج انور کی مقبول کہانیوں میں ''سونے کا شہر''،''جادو کی آنکھیں''،''بوتل کا قیدی''،''تیس مار خاں''،''اختر کی عید''،''عجیب دوست''،''جانوروں کی دنیا''،''کتاب کا راز'' وغیرہ بچوں میں مقبول ہوئیں۔سراج انور کی کہانیوں میں مافوق الفطرت عناصر جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ان کے ناولوں میں پہاڑی مقامات کی منظر کشی نظر آتی ہے۔سراج انور اس تعلق سے خود اعتراف کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> ''میرے بیشتر ناول پہاڑی مقامات کے پس منظر میں لکھے ہوئے ہیں شاید مجھے یہ مقامات اور یہاں کے مکیں اس لئے پسند ہیں کہ وہ بہت صاف دل اور کم گو ہوا کرتے تھے۔بیحد غریب لیکن دل کے امیر۔میں نے بذات خود پہاڑوں کی بہت خاک چھانی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جنت ایسی نہیں تو بس اس سے کچھ بہتر ہی ہوگی''۔

سراج انور نے بچوں کے لیے دو سو سے بھی زائد کہانیاں تحریر کی ہیں۔ یہ تمام کہانیاں بچوں کے لیے سبق آموز ہیں۔جو انھیں کچھ سکھاتی ہیں، کچھ بتاتی ہیں اور انھیں اچھے کام کی ترغیب دیتی ہیں۔آپ نے ادب اطفال میں بچوں کی دلچسپی کا خاص خیال رکھا۔اس طرح ان کی کہانیاں تفریح کے ساتھ ساتھ ان کی اصلاح بھی کرتی ہیں۔سراج انور کا شاہکار ناول ''دوسرا زینہ'' ہے جو بچوں کے درمیان مقبول رہا۔سراج انور نے اپنی پوری زندگی بچوں کی تربیت، ان کی اصلاح کی غرض کے لیے

عمدہ سے عمدہ کہانیاں تخلیق کی۔اور بچوں کی دلچسپی کا بھی پورا پورا خیال رکھا۔یہ ان کی بچوں سے محبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ بچوں کی ادبی دنیا میں خاص مقبول ہوئے۔ان کا خاصہ یہ بھی رہا ہے کہ انھوں نے اپنی کہانیوں میں حیرت انگیز واقعات اور مافوق الفطرت کا بھرپور استعمال کیا اس کی وجہ بھی رہی ہے کہ بچے اس طرح کے انداز کو خوب پسند کرتے ہیں۔

اے حمید: اے حمید 1928ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔آپ بیک وقت ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈراما نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔انھوں نے میٹرک امرتسر سے کیا۔تقسیم ہند کے بعد آپ لاہور منتقل ہو گئے۔اور لاہور سے ہی ایف اے پرائیوٹ سے پاس کیا۔اس کے بعد ریڈیو پاکستان میں ملازم ہو گئے۔اے حمید کا پہلا افسانہ''منزل منزل'' کے عنوان سے 1948ء میں شائع ہوا۔آپ کا ادبی سرمایہ بہت وسیع ہے۔جن میں کثیر تعداد میں ناول اور افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔افسانوی مجموعے''مٹی کی مانالیزا''،'' کچھ یادیں کچھ آنسو''،''خزاں کا گیت''،''بارش اور بالکنی'' اور''زرد گلاب'' وغیرہ ہیں۔ان کے ناولوں میں''ڈربے''،''اور چنار جلتے رہے''،''ویران گلی میں لڑکی''،''پھول گرتے ہیں''،''پہلا اداس چاند''،''طوفان کی رات''،''پیپل والی گلی''،''ناریل کا پھول'' اور''چائے والا'' وغیرہ ہیں۔ان کا ادبی سرمایہ اس قدر وسیع ہے کہ اگر تمام کتب کے نام لکھے جائیں تو صفحے بھر جائیں۔افسانے اور ناول کے علاوہ کالم، اخباری کالم، جاسوسی کہانیاں، سفرنامے، ریڈیو کالم، ٹی وی ڈرامے ان سب پر انھیں کمال حاصل تھا۔اے حمید کا انتقال 2011ء میں سانس کی تکلیف کی وجہ سے ہوا۔

اے حمید کو ماضی سے انسیت سی تھی جب بھی محفل میں ہوتے تو دورانِ گفتگو ماضی کے جھروکے میں چلے جایا کرتے تھے۔وہ ماضی کے خوبصورت لمحوں کو اکثر یاد کیا کرتے تھے۔فطرت سے انھیں بے حد لگاؤ تھا یہ انسیت ان کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔اے حمید اپنی زندگی کا بیشتر حصہ لکھنے میں گزار دیا۔آپ کی تخلیقات میں معاشرتی حقیقت نگاری واضح طور پر نظر آتی ہے۔ان کی کہانیوں میں محبت اور فطرت دونوں کا عکس ساتھ ساتھ نظر آتا ہے۔

اے حمید نے بچوں کے ادب پر بہت سی کہانیاں اور ناول تحریر کیے۔''امبر ناگ ماریا'' ادب اطفال کا مقبول ترین ناول ہے۔اس ناول کی کہانی قسط وار شائع ہوا تھا۔اس ناول میں مافوق الفطری عناصر پائے جاتے ہیں۔بچوں کے ادب پر ان کی دوسری کتاب''آسیبی باولی کا راز'' بہت مقبول ہوا۔ان

کی کہانیوں میں واقعات رومانی اور حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی مافوق الفطری عناصر پر واقعات بیان ہوتے ہیں تو اس کی سحر انگیزی قاری پر اس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ وہ واقعات بھی حقیقت معلوم پڑتا ہے۔ اے حمید کو واقعات بیان کرنے پر قدرت حاصل ہے اور واقعات گڑھنے پر بھی کمالِ فن حاصل ہے۔

☆☆☆